

عُلُومُ الْقُرْآنِ

تأليف

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم
شیخ الحدیث و نائب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی

ناشر

مکتبہ نوری دارالعلوم کراچی

عُلُوْمُ الْقُرْآنِ



تالیف
مولانا محمد تقی عثمانی



ناشر
مکتبہ اہل العلم و کرامہ کراچی

طبع جدید — ۱۳۱۵ھ ہجری

باہتمام — عبدالصبور

منطبع —

تاشیر — مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴۔ پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰

مکمل کے پتے — ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

وآل اشاعت، اردو بازار، کراچی

ادارۃ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور

ادارۃ اہلسنن سید چوک کراچی

اپنے والد ماجد
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم
کی خدمت میں

جن کی ذات میں احقر کے لئے ایک مثالی، بلکہ بے مثال باپ، ایک
ہمہ جہت استاذ اور ایک باریک بین مربی و شیخ کی شفقتیں جمع ہیں،

اور

رُو سے زمین پر احقر کی محبت ہی نہیں، عقیدت کا بھی ان سے بڑا
مرکز کوئی نہیں، حفظہ اللہ تعالیٰ،
یہ حقیر کا دشمن کی پیشگی اجازت کے بغیر ان کے نام نامی سے منسوب کر کے
عوض گزار ہوں کہ

اگر سیاہ دلم، داریغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبین، محل بہار تو ام

محمد تقی مثالی

فہرست مضامین علوم القرآن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲	حضور پر نزولِ وحی کے طریقے	۱۱	تولید: حضرت مولانا محمد یوسف بنوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
۳۳	(۱) صلصلة الجرس	۱۳	پیش لفظ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>
۳۶	(۲) تمثیل ملک	۱۴	حرف آغاز: مؤلف
۳۸	(۳) فرشتہ کا اصل شکل میں آنا	۲۱	حصہ اول القرآن الکریم
=	(۴) رؤیت صادقہ	۲۳	باب اول، تعارف،
=	(۵) کلامِ الہی	=	قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ
۳۹	(۶) نفث فی الردع	=	وحی اور اس کی حقیقت
=	وحی اور کشف والہام	۲۵	وحی کی ضرورت
۴۰	وحی مستلوا اور غیر مستلوا	=	وحی کا مفہوم
۴۳	وحی پر عقلی شبہات	۲۸	وحی کی تعلیمات
۴۸	کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟	۳۰	وحی کی اقسام
۵۳	باب دوم، تاریخ نزولِ قرآن	۳۱	(۱) وحی قلبی
۵۴	پہلا نزول	=	(۲) کلامِ الہی
۵۵	دوسرا نزول	۳۲	(۳) وحی منلی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۶	”سبعۃ احرف“ کی راجح ترین تشریح	۵۶	سب سے پہلی نازل ہوئی والی آیت
۱۱۰	اس قول کی وجوہ ترجیح	۵۹	مکئی اور مدنی آیات
۱۱۲	اس قول پر وارد ہوئی والے اعتراضات	۶۲	مکئی اور مدنی آیتوں کی خصوصیات
۱۱۲	اور ان کا جواب،	۶۳	نزول کا وقت اور مقام
۱۱۳	سات حروف کے ذریعہ کیا آسانی	۶۵	(۱) ہناری
	پیدا ہوئی؟	۶۵	(۲) لیلی
۱۱۸	حروف سبعہ اب بھی محفوظ ہیں یا	۶۶	(۳) صیفی
	متردک ہو گئے؟	۶۶	(۴) ہشتائی
۱۱۹	حافظ ابن جریر کا نظریہ اور اس کی	۶۶	(۵) فراشی
	قباحتیں،	۶۶	(۶) نومی
۱۲۳	انام طحاوی کا قول	۶۶	(۷) سادی
۱۲۳	سب سے بہتر قول	۶۶	(۸) فضائی
۱۲۵	اس قول کے قائلین	۶۷	قرآن کریم کا تدریجی نزول
۱۳۶	اس قول کے دلائل	۶۹	ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب
۱۴۰	اس قول پر وارد ہوئی والے سوالات	۷۲	اسباب نزول
	اور ان کے جواب	۷۳	شان نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد
۱۴۴	لغت قریش پر لکھے کا مطلب	۷۹	اسباب نزول اور شاہ ولی اللہ
۱۴۶	مراد الفاظ سے تلاوت کا مسئلہ	۸۲	سبب نزول اور احکام کا عموم و خصوص
۱۴۹	حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کا مضمون	۸۶	سبب نزول اور اختلاف روایات
۱۵۵	نتیجہ بحث	۹۳	تکرار نزول اور اس کی حقیقت
۱۵۶	سات حروف کے بارے میں اختلاف آراء کی	۹۷	باب سوم، قرآن کے سات حروف
	حقیقت، ایک غلط فہمی کا ازالہ	۹۸	حروف سبعہ کا مفہوم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۹۵	حرکات	۱۵۹	باب چہارم، ناسخ و منسوخ
۱۹۶	احزاب یا منزلیں	"	نسخ کی حقیقت
"	اجزاء یا پارے	"	نسخ کا عقلی و نقلی ثبوت
۱۹۷	انحاس اور اعشار	"	نسخ کے بارے میں متقدمین اور متاخرین
"	رکوع	۱۶۱	کی اصطلاحات کا فرق،
۱۹۸	رموز و اوقات	"	قرآن کریم میں نسخ کی بحث
۲۰۱	قرآن کریم کی طباعت، پانچواں مرحلہ	۱۶۳	منسوخ آیات قرآنی کی تعداد
۲۰۲	قرآت اور ان کی تدریس	۱۶۷	نتیجہ بحث
۲۱۱	باب ششم	۱۷۲	باب پنجم، تاریخ حفاظت قرآن
"	حفاظت قرآن سے متعلق شبہات	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے
"	اور ان کا جواب	"	میں حفاظت قرآن،
۲۱۳	ابتدائی زمانہ کی آیات محفوظ نہیں رہیں؛ پہلا اعتراض	۱۷۷	عہد رسالت میں کتابت قرآن،
۲۱۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ	"	پہلا مرحلہ
"	ایک آیت یاد نہیں ہی؛ دوسرا اعتراض	۱۸۱	حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن،
۲۱۶	سورۃ نسا میں سورۃ انعام کا حوالہ؛	"	دوسرا مرحلہ
"	تیسرا اعتراض	۱۸۷	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن،
۲۱۹	امام بخاریؒ پر مارا گیا تو تھکا کا ایک بہتان؛	"	تیسرا مرحلہ
"	چوتھا اعتراض	۱۹۳	تسہیل تلاوت کے اقدامات،
۲۲۰	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ آیتیں گم ہو گئیں	"	چوتھا مرحلہ
"	پانچواں اعتراض	"	نقط

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۸	قرآن کریم کی پیشگی خبریں!	۲۲۱	عہد رسالت میں حفاظ کی تعداد
=	ردیوں کی فتح		چھٹا اعتراض
۲۷۰	فتح مکہ کی خبر	۲۲۳	حضرت عبداللہ بن مسعود اور معوذتین
۲۷۱	یہودیوں کی تمنا سے موت		ساتواں اعتراض
۲۷۲	قرآن کریم کی حفاظت	۲۲۷	خلافت صدیقی میں جمع قرآن کی روایت
۲۷۵	قرآن کریم کے انکشافات		مستشرقین کا آٹھواں اعتراض
۲۷۷	حقانیت قرآن اور معسرب کے غیر مسلم مصنفین	۲۳۱	خلافت صدیقی تک پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا!
۲۸۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل کتاب		نواں اعتراض
۲۸۷	قرآن کریم پر چند اعتراضات	۲۳۳	مختلف قراءتیں کس طرح وجود میں آئیں
=	حضرت مریم کے والد کا نام		دسواں شبہ
۲۸۹	فرعون کا وزیر ہامان	۲۳۶	قرآن کریم کی شان قراءتیں اور ان کی حقیقت!
			گیارہواں شبہ
۲۹۳	باب ششم، مضامین قرآن	۲۴۱	باب ششم، حقانیت قرآن
=	عقائد (ایجاز، پہلو)	=	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت
۲۹۵	نقلی دلائل	۲۴۲	کتاب مقدس میں آپ کی بشارتیں،
۲۹۶	منطقی دلائل	۲۴۸	اعجازِ قسَمِ آن
۲۹۷	قیاس استثنائی	۲۵۳	قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات،
۲۹۸	السبب والنتیجہ	=	الفاظ کا اعجاز
۲۹۹	تسلیم	۲۵۹	ترکیب کا اعجاز
=	انتقال	=	اسلوب کا اعجاز
۳۰۲	مشاہداتی دلائل	۲۶۵	نظم کا اعجاز

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۴	دوسرا ماخذ؛ احادیث نبوی	۳۰۳	تجرباتی دلائل
۲۳۸	تیسرا ماخذ؛ اقوال صحابہؓ	۳۰۴	عقائد (سبلی پہلو)
۲۴۰	چوتھا ماخذ؛ تابعین کے اقوال	۳۰۵	بت پرست مشرکین
۲۴۱	پانچواں ماخذ؛ لغت عرب	۳۰۸	یہودی
۲۴۲	چھٹا ماخذ؛ عقل سلیم	۳۱۰	نصاری
۲۴۵	باب دوم	۳۱۱	منافقین
۲۴۵	تفسیر کے ناقابل اعتبار ماخذ	=	احکام
۲۴۵	۱۔ اسرائیلی روایات	۳۱۳	شان نزول
۲۴۸	کعب الاحبار کون تھے؟	۳۱۵	قصص
۲۵۰	وہب بن منبہ	=	ماضی کے واقعات
۲۵۱	حضرت عبد بن عمروؓ	۳۱۶	واقعات میں تکراریوں پر؟
۲۵۳	۲۔ صوفیائے کرام کی تفسیریں	۳۱۸	مستقبل کے واقعات
۲۵۶	۳۔ تفسیر بالراتے	=	امثال
۲۵۹	تفسیر میں گمراہی کے اسباب	۳۲۱	حصہ دوم علم تفسیر
۲۶۳	۱۔ پہلا سبب؛ نااہلیت	=	باب اول
۲۶۴	چند غلط فہمیاں	۳۲۳	علم تفسیر اور اس کے ماخذ
۲۶۵	علماء اور اجارہ داری	۳۲۴	تعارف
۳۶۱	۲۔ قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانا،	۳۲۵	تفسیر اور تادل
۳۶۲	۳۔ زمانہ کے افکار سے مرعوبیت	۳۲۶	تفسیر کے ماخذ
		۳۳۸	پہلا ماخذ؛ خود قرآن کریم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴۳	۶۔ زمانہ کی تبدیلی اور احکام شرعیہ	۳۴۶	معجزات کا مسئلہ
۳۴۶	۷۔ زمانہ کی تبدیلی کا مطلب	۳۸۴	خلاف عقل اور مادہ اور عقل
۳۴۷	۸۔ عقل کا صحیح دائرہ کار	۳۸۶	۳۔ قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا
۳۵۳	باب چہارم	۳۹۷	باب سوم
۳۵۳	قرون اولیٰ کے بعض مفسرین	۳۹۷	تفسیر کے چند ضروری اصول
۳۵۴	حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳۹۷	۱۔ قرآن کریم اور مجاز
۳۵۶	گولڈزیبر کا ایک مغالطہ	۳۹۷	۲۔ قرآن کریم اور عقلی دلائل
۳۵۸	مروجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حقیقت	۳۹۷	۱۔ قطعی عقلی دلائل
۳۵۸	حضرت علیؓ	۳۹۷	۲۔ ظنی عقلی دلائل
۳۵۹	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	۳۹۷	۳۔ وہی عقلی دلائل
۳۶۰	حضرت ابی بن کعبؓ	۳۹۷	۱۔ قطعی نقلی دلائل
۳۶۱	صحاح ابیہ کے بعد	۳۹۷	۲۔ ظنی نقلی دلائل
۳۶۱	۱۔ حضرت مجاہدؓ	۳۹۷	۳۔ وہی نقلی دلائل
۳۶۲	۲۔ حضرت سعید بن جبیرؓ	۳۹۷	۳۔ احکام شرعیہ اور عقل
۳۶۳	۳۔ حضرت عکرمہؓ	۳۹۷	۱۔ آزاد عقل اور ہدایت و گمراہی
۳۶۴	عکرمہؓ پر اعتراضات کی حقیقت	۳۹۷	۲۔ اسلامی احکام کی حکمتیں
۳۶۷	گولڈزیبر کا ایک مغالطہ	۳۹۷	اور دین میں ان کا قیام
۳۶۹	۴۔ حضرت طاؤسؓ	۳۹۷	۳۔ حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا
۳۷۰	۵۔ حضرت عطاء بن ابی یاسرؓ	۳۹۷	۴۔ احکام شریعت کا اصل مقصد
۳۷۱	۶۔ حضرت سعید بن المسیبؓ	۳۹۷	اجماع کا امتحان ہے،
۳۷۲	۷۔ محمد بن سیرینؓ	۳۹۷	۵۔ قرآن و سنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۸۵	قرآن اولیٰ کے ضعف یا مختلف قیفسوں	۴۷۴	۸ - حضرت زید بن اسلمؓ
"	سُدی کبیر	۴۷۵	۹ - حضرت ابو العالیہؓ
۴۸۸	سُدی صغیر	۴۷۶	۱۰ - حضرت عروۃ بن الزبیرؓ
۴۸۹	مقاتل	"	۱۱ - حضرت حسن بصریؓ
۴۹۳	ربیع بن انسؓ	۴۷۷	۱۲ - حضرت قتادہؓ
۴۹۴	عطیۃ العوفی	۴۷۸	۱۳ - محمد بن کعب القسریؓ
۴۹۶	عبدالرحمن بن زید بن اسلم	۴۷۹	۱۴ - حضرت علقمہؓ
۴۹۷	کلبی	"	۱۵ - حضرت اسودؓ
۵۰۰	متاخرین کی چند تفسیریں	۴۸۰	۱۶ - مرۃ الہدائیؓ
۵۰۱	۱ - تفسیر ابن کثیر	۴۸۱	۱۷ - حضرت نافعؓ
۵۰۲	۲ - تفسیر کبیر	۴۸۲	۱۸ - حضرت شعبیؓ
۵۰۵	۳ - تفسیر ابی السعود	"	۱۹ - حضرت ابن ابی ملیکہؓ
"	۴ - تفسیر لہستانی	۴۸۳	۲۰ - حضرت ابن جریرؓ
"	۵ - روح المعانی	۴۸۴	۲۱ - حضرت ضحاکؓ
۵۰۷	بیان لقرآن ، معارف القرآن		

تفسیر

از شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا محمد

خاتم النبيين وآله وصحبه أجمعين،

اما بعد، قرآن کریم کے علوم پر عربی زبان میں عمدہ سے عمدہ قدماء و متاخرین کی کتابیں آرہی ہیں، لیکن ان سے زیادہ تر علماء ہی استفادہ کر سکتے ہیں، اور زیادہ تر وہ کتابیں قدیم طرز، قدیم حاجات اور قدیم ذوق کے پیش نظر تصنیف کی گئی ہیں اور بلاشبہ ان کتابوں نے اس وقت کے قضاوں کو بہت خوبی سے پیش کیا، اور امت کو نفع پہنچایا، دہلی میں جب سرسید احمد خاں کی تفسیر وجود میں آئی، اور ان کی تصانیف شائع ہوئی ہیں، اس تفسیر سے جو امت کے عقائد پر زبرد پڑی، اور جدید نسل کے ساتھ غیر واقعی نظریات پیش کئے گئے، نبوت کو کسبی کہا گیا، معجزات سے جنت و دوزخ، ملائکہ و شیاطین کے وجود سے انکار کیا گیا، اور قرآنی صداقت کے لئے جدید اصول تجویز کئے گئے، حق تعالیٰ نے مولانا عبدالحق حقانی دہلوی دیوبندی کو کھڑا کیا، فتح المنان کے نام سے عمدہ تفسیر لکھی، اور "البیان فی علوم لہتر آن" کے نام سے بی نظیر مقدمہ لکھا، اور تفسیر کی پہلی جلد میں اس مقدمہ کی تلخیص کی گئی، نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس ضرورت کو پورا کیا، لیکن عرصہ سے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کہ جدید نسل کی رہنمائی کے لئے جدید انداز پر ایسی کتاب اور قرآنی حقائق کو دلائل گات کرنے کے لئے ایک مبسوط مفصل مقدمہ لکھا جائے، جس میں وحی اور نزول قرآن، ترتیب نزول، قراءات سبعہ، اعجاز قرآن وغیرہ وغیرہ، حقائق قرآنی کے ابحاث اس طرح

بصیرت افروز انداز سے آجائیں، جس میں مستشرقین کے ادہام و وسوس اور خلفا
یا معاندانہ تسکوک و شبہات کا تشفی کن مواد آجائے، اور مستشرقین کی قیادت میں
مستشرقین (مغرب زدہ طبقہ) کے مزعومات کا بھی جواب آجائے، الحمد للہ کہ اس عظیم اور
اہم ترین مقصد کو ہماری برادر محترم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی خلیفہ الرشید
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت حیاتہم المبارک نے بہت خوبی کے ساتھ
معارف القرآن کا مبسوط مقدمہ تالیف کر کے اس دینی و ملی ضرورت کو پورا کر دیا،
اور امت پر احسان کیا، حق تعالیٰ اُن کے علم، ان کے قلم میں برکتیں عطا فرمائیں،
اور مزید توفیقات آپسے سرفراز فرمائیں

مقدمہ کا کچھ حصہ تو مسلسل دیکھا، کچھ حصہ جستم مقامات سے دیکھا، الحمد للہ
کہ بہت خوش ہوا، اور دل سے دعا، نکلی، وفقنا اللہ وایاہ لخدمۃ دینہ
ابتغاء لوجه الکریم، وصلى الله على سيدنا محمد سيد العالمين
وخاتم النبیین وعلى الہ واصحابہ وعلیٰ امتہ اجمعین،

محمد یوسف بنوری رضی عنہ

مدقہ سے عنیت اسلا کوچی

جمنیات

۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ

پیش لفظ

ان حضرات مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے "معارف القرآن" کی صورت میں احقر کو قرآن کریم کی ایک خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اور یہ اطلاعات باعث شکر و مسرت ہوتی رہتی ہیں کہ بفضلہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا ہے، جب اس تفسیر کی جلد اول نظر ثانی اور ترمیم کے بعد دوبارہ شائع ہونے لگی تو احقر کی خواہش ہوئی کہ اس کے شروع میں "علوم قرآن" کی معلومات پر مشتمل ایک مقدمہ شامل کر دیا جائے، مجھے اپنے امراض اور ضعف کی بناء پر خود اس کام کا تحمل نہ رہا تھا، اس لئے برخوردار عزیز محمد تقی سلمہ کو اس مقدمہ کی تالیف سپرد کی، انھوں نے ایک مختصر مقدمہ لکھ کر تعارف القرآن جلد اول کے ساتھ لگا دیا، لیکن اسی دوران انھوں نے اسی موضوع پر ایک مفصل اور نہایت مفید کتاب کی بنیاد بھی ڈال دی، جو بفضلہ تعالیٰ اب پایہ تکمیل تک پہنچ کر "علوم القرآن" کے نام سے شائع ہو رہی ہے، "علوم القرآن" ایک وسیع علم ہے جس پر عربی میں ضخیم کتابیں موجود ہیں اور اردو میں بھی کئی کتابیں آچکی ہیں، لیکن اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں متعلقہ مباحث کو پوری تحقیق کے ساتھ حل بھی کیا گیا ہو، اور عہد حاضر میں مستشرقین اور متجددین نے جو شکوک و شبہات پیدا کر دی ہیں ان کا علی جواب بھی دیا گیا ہو، اس کے علاوہ ہمارے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے تفسیر کی اہلیت کے بغیر قرآن کریم کی جو تفسیریں لکھ دی ہیں، ان میں تفسیر قرآن کے مسلم اصولوں کو

جس طرح پامال کیا ہے اُس کے پیش نظر یہ بھی ضروری تھا کہ تفسیر کے اصولوں کی وضاحت کی جائے، اور اُن کو نظر انداز کرنے سے جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کی طرف توجہ دلائی جائے،

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کتاب میں وقت کی اس اہم ضرورت کو میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ اچھی طرح پورا کیا گیا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اگر اس کتاب کو حق طلبی اور انصاف پسندی کے جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو انشاء اللہ اس سے علم تفسیر میں بصیرت بھی حاصل ہوگی، اور اس راہ میں جو غلط فہمیاں، شکوک و شبہات اور گمراہیاں، مستشرقین کی تبلیغات اور عام لوگوں کی نادانانہ عقیدت سے عموماً ذہنوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا بھی تشفی بخش حل مل جائے گا،

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کو برخوردار عزیز کے سپرد کرنے کی پہلی وجہ تو میرے مسلسل امراض اور روز افزوں ضعف تھا، اور یہ سمجھ کر یہ اقدام کیا تھا، کہ اگر بدتر تو اندپر تمام کتب کا مصداق ہو تو ہو ہی جائے گا، لیکن کتاب کی تصنیف سامنے آئی، میں اگرچہ ضعف، بصارت کے سبب اس کو خود نہیں دیکھ سکا، مگر اس کے بہت سے مباحث کو پڑھا اور سننا تو میری مسرت کی حد نہ رہی، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کیونکہ یہ مکمل کتاب ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تندرستی کے زمانے میں لکھتا تو ایسی نہ لکھ سکتا تھا، جس کی دو وجہ ظاہر ہیں، اول تو یہ کہ عزیز موصوف نے اس کی تصنیف میں جس تحقیق و تنقید اور متعلقہ کتابوں کے عظیم خیر کے مطالعہ سے کام لیا، وہ میرے بس کی بات نہ تھی، جن کتابوں سے یہ مضامین نکلے گئے ہیں ان سب مأخذوں کے حوالے بقید ابواب و صفحات حاشیہ میں درج ہیں، انہی پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی تحقیقی کاوش کا اندازہ ہو سکتا ہے،

اور دوسری بات اس۔ بھی زیادہ ظاہر یہ ہے کہ میں انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر مستشرقین یورپ کی اُن کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا جن میں انھوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہرا اور تبلیغات سے کام

یابے، برخوردار عزیز نے چونکہ انگریزی میں بھی ایچ۔ اے، ایل، ایل، بی اعلیٰ جنوروں میں پکا
 کیا، انھوں نے ان تلبیسات کی حقیقت کھول کر وقت کی اہم ضرورت پوری کر دی
 دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اس نورِ نظر کو عافیتِ کاملہ کے ساتھ عمرِ دراز
 نصیب فرمادیں، اور تمام شرور و آفات اور فتن ظاہرہ و باطنہ سے حفاظت کے ساتھ
 مزید سی علمی خدمات کی توفیق عطا فرمادیں، اور صدق و اخلاص اور اپنی رضا کا بل
 عطا فرمادیں، اور اس تصنیف کو اپنے فضل سے قبول فرما کر ان کے لئے اور میرے لئے
 ذریعہٴ نجات بنائیں، اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائیں،

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

بنہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
 دارالعلوم کراچی ۱۹۹۱
 یکم جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرفِ آغاز

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

قرآن کریم پوری انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی دولت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، یہ وہ نسخہ، شفا، ہر جس کی تلامذہ، جس کا دیکھنا، جس کا سنتنا سنانا، جس کا سیکھنا، سکھانا، جس پر عمل کرنا، اور جس کی کسی بھی حیثیت سے نشر و اشاعت کی خدمت کرنا دنیا اور آخرت دونوں کی عظیم سعادت ہے، صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز ہم صفہ میں بیٹھے تھے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا، تم میں سے کس کو یہ بات پسند ہے کہ وہ روزانہ صبح کو لُطْحَانَ یا عَقِيقَةَ (کے بازار) میں جایا کرے، اور ہر روز دو بہترین قسم کی اونٹنیاں کسی گناہ یا قطع رحمی کا ارتکاب کئے بغیر کپڑ لایا کرے؟ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کو تو ہم میں ہر ایک پسند کرے گا، آپ نے فرمایا: اگر کوئی شخص روزانہ مسجد میں جا کر دو آیتیں سیکھ لیا کرے یا پڑھ لیا کرے تو یہ اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، اور تین آیتیں سیکھے تو تین اونٹنیوں سے اور چار

دیکھے تو وہ چار سے بہتر ہے۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی کا علم حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کے جو فضائل بیان فرماتے، اور امت کو جس طرح اس کی ترغیب دی، مذکورہ بالا حدیث اُس کی صرف ایک مثال ہی، اور حدیث کے مجموعے اس قسم کی احادیث سے بھرے پڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امتِ محمدیہؐ رعلی صاحبہا السلام نے قرآن کریم اور اُس کے علوم کی ایسے ایسے پہلوؤں سے خدمت کی ہے، اور اس کے الفاظ و معانی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسی بے مثال کاوشیں کی ہیں کہ اُن کی تفصیلات کو دیکھ کر عقلِ مبہوت رہ جاتی ہے،

قرآن کریم کے معانی مطالب کا تو کہنا ہی کیا ہے، اس امت نے کتابِ الہی کے الفاظ، اس کی حرکات و سکنات اور اس کے حروف کو ٹھیک ٹھیک زبان سے ادا کرنے کی غرض سے ایسے ایسے علوم و فنون کی بنیاد ڈالی ہے جن کی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور کسی زبان میں نہیں ملتی، ایک تجرید و قرأت ہی کے علم کو لے لیجئے، تو اس فن کی تفصیلات اور اس کی باریکیوں کی تشریح کے لئے اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اُن سے ایک مستقل کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے،

غرض جن مختلف جہتوں اور گونا گوں پہلوؤں سے قرآن کریم کی خدمت کی گئی ہے انہی میں سے ایک خاص رُخ کی خدمت وہ کتابیں ہیں جو ”علوم القرآن“ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں،

”علوم القرآن“ ایک وسیع و عریض علم ہے، اور اس میں علمِ تفسیر کے مبادی اور اصول واضح کئے جاتے ہیں، قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوا تھا؟ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب کس ترتیب سے نازل ہوئی؟ کتنے حصہ میں اس کا نزول مکمل ہوا؟ مکی اور مدنی سورتوں کا کیا مطلب ہے؟ شانِ نزول کے کہتے ہیں؟ تفسیر قرآن میں اس کا کیا مقام ہے؟ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ ہو یا نہیں؟ قرآن کے مختلف حروف اور قرار توں کا کیا مطلب ہے؟ قرآن کریم کس قسم کے

کے مضامین پر مشتمل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو کس طرح محفوظ رکھا ہے؟ اور اس کی کتابت و طباعت کتنے مراحل سے گزری ہے؟ قرآن کریم کی تفسیر کے کیا اصول اور آداب ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اور اس راہ میں کونسی غلطیاں انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالات کا مفصل جواب ”علوم القرآن“ میں دیا جاتا ہے،

عربی زبان میں اس موضوع پر علامہ زرکشیؒ کی ”البرہان فی علوم القرآن“ (چار جلدوں میں)، علامہ سیوطیؒ کی ”الاتقان“ (دو جلدوں میں)، شیخ زرقانیؒ کی ”مناہل العسرفان“ (دو جلدوں میں)، آج بھی اس علم کی معروت و ممتاز اول کتابیں ہیں جو اپنے موضوع پر مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں آئی ہیں، جن میں علامہ عبدالحق حقانیؒ کی ”البيان فی علوم القرآن“ سب سے زیادہ جامع اور ممتاز ہے،

لیکن زمانہ کے لحاظ سے ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے یہ ضرور تو عرصہ سے محسوس ہوتی تھی کہ عہدِ حاضر میں معسرینی افکار کے زیر اثر ان موضوعات پر جو نئی سوالات پیدا ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر کوئی نئی کتاب لکھی جائے، تاہم یہ تصور دُور دور نہ تھا کہ اس ضرورت کی تکمیل میں مجھ ناچیز کا بھی کوئی حصہ لگ سکے گا،

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت مقدر میں تھی، اور اس کے حصول کی تقریب یہ ہوئی کہ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے اردو زبان میں تفسیر ”معارف القرآن“ تالیف فرمائی، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اور کسی جھجک کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ وہ سلف صالحین کے طرز کے مطابق عہدِ حاضر کی بے نظیر اردو تفسیر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُسے مقبولیت بھی بجز عطا فرمائی، اور جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو حضرت والد صاحب مدظلہم نے احقر کو حکم دیا کہ اس کے شروع میں ”علوم القرآن“ کی ضروری معلومات پر مشتمل

ایک مختصر مقدمہ تحریر کروں،

میں نے تعمیل حکم کے لئے یہ مقدمہ لکھنا شروع کیا، تو وہ بُرائی خواہش اُبھرائی، اور اختصار کی کوشش کے باوجود یہ مقدمہ طویل ہوتا گیا، جب مسودے کے تقریباً دو سو صفحات لکھ چکا تھا، اور بہت سے ضروری موضوعات ابھی باقی تھے تو خیال آیا کہ اتنا طویل مقدمہ تفسیر کے شروع میں موزوں نہیں ہوگا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایما پر میں نے تفسیر کے مقدمہ کے لئے تو اختصار کے ساتھ کچھ ضروری معلومات الگ جمع کر دیں جو تفسیر کے شروع میں بطور مقدمہ شائع ہو گئیں، اور اس مفصل مقدمہ کو مستقل تصنیف کی صورت دیدی اپنے مشاغل اور عوارض کی وجہ سے اس کتاب کی تکمیل میں خاصی دیر لگ گئی، تاہم یہ اللہ تعالیٰ کا انعام و کرم ہے کہ جتنے ضروری مباحث میں اس کتاب میں لانا چاہتا تھا وہ اس میں کم و بیش جمع ہو گئے ہیں،

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ”علوم القرآن“ کے موضوع پر عہدِ حاضر کو جس نئی تصنیف کی ضرورت تھی وہ اس کتاب نے ٹھیک ٹھیک پوری کر دی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس میں موضوع سے متعلق عہدِ حاضر کی ضروریات کا کافی سامان مل جائیگا، احقر نے اس میں ”علوم القرآن“ کے اُن مشہور مسائل کی تحقیق بھی یکجا کر نیکی کوشش کی ہے جن کی پوری تفصیل کیلئے بہت سی کتابوں کی مراجعت کرنی پڑتی تھی اور بعض نئے مباحث بھی درج کر دیئے ہیں، اگر وہ اہل نظر کے نزدیک کافی اور اطمینان بخش ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، ورنہ کم از کم ان کی داغ بیل تو ڈال دی گئی ہے، اور آئندہ دوسرا اہل علم و فکر حضرات اُن کو باقیہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں، یہ کتاب اگر فہم قرآن کے سلسلہ میں کسی صاحب کے کچھ کام آئے تو احقر کو اپنی ناچیز محنت کا پورا صلہ مل جائیگا، قارئین سے اس دعاء کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کا دل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے، اور یہ احقر کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو، آمین، و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم،

احقر محمد تقی عثمانی

خادم طلبہ دارالعلوم کراچی

۲۹، جادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ

القرآن الکریم

- _____ وحی ●
- _____ نزولِ قرآن ●
- _____ نسخ و منسوخ ●
- _____ حفاظتِ قرآن ●
- _____ حقایقِ قرآن ●
- _____ مضامینِ قرآن ●

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ وَعَلَى كُلِّ
 مَنِ اتَّبَعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ،
 اللَّهُمَّ ارِنِي الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنِي اتِّبَاعَهُ وَارِنِي الْبَاطِلَ
 بِاطِلًا وَارْزُقْنِي إِجْتِنَابَهُ -
 رَبِّ يَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَسِّمْ بِالْحَيِّ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ
 رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ،

احقر محمد تقي عثمانی عفی عنہ
 یوم رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ

تعارف

قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ | علامہ ابوالمعالی نے قرآن کریم کے پچپن نام شمار کئے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کی تعداد نوٹنے سے بھی متجاوز بنائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی صفات مثلاً "مجید"، "کریم"، "حکیم" وغیرہ کو نام قرار دے کر تعداد اس حد تک پہنچا دی ہے، ورنہ صحیح معنی میں قرآن کریم کے نام کل پانچ ہیں: القوان، الفرقان، الذکر، الکتاب، اور التّنزیل، خود قرآن کریم نے اپنے لئے یہ پانچوں الفاظ اسم علم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نام قرآن ہے، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے کم از کم اس

ابوالمعالی کنیت، عزیز می بن عبدالملک نام اور شہزادہ لقب ہے، پانچویں صدی ہجری کے شافعی عالم ہیں ان کی کتاب "البرہان فی مشکلات القرآن" کے علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی نے بکثرت حوالے دیئے ہیں، ۳۹۷ء میں وفات پائی، (ابن خلدکان وفيات الاعیان، ص ۳۱۸ ج ۱)

۱۔ دیکھئے السیوطی: "الاتقان فی علوم القرآن" ص ۵۱ ج ۱ مطبوعہ حجازی بالقاہرہ ۳۶۸ھ
۲۔ الزرقانی: "مناہل العرفان" ص ۸ جلد اول، مطبعہ عینی البابی الحبلی ۳۲۲ھ،

۳۔ الفرقان کے لئے دیکھئے سورۃ آل عمران آیت ۷۱ اور الذکر کیلئے آل عمران: ۵۸ والحجر: ۶ ص ۸ وغیرہ اور الکتاب کیلئے بقرہ: ۱ اور نحل: ۶۳ و ۸۹ و کہف: وغیرہ اور التّنزیل کیلئے یس: ۵ واقفہ: ۸۰ والحاقة: ۶۹

مقامات پر اپنے کلام کو اسی نام سے یاد کیا ہے،

”قُرْآن“ دراصل قَرَأَ يَقْرَأُ سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں ”جمع کرنا، پھر یہ لفظ ”پڑھنے“ کے معنی میں اس لئے استعمال ہونے لگا کہ اس میں حروف اور کلمات کو جمع کیا جاتا ہے، قَرَأَ يَقْرَأُ کا مصدر ”قِرَاءَةٌ“ کے علاوہ ”قُرْآن“ بھی آتا ہے، چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ۔

بلاشبہ اس کتاب، کا جمع کرنا اور

پڑھنا ہمارے ہی ذمہ ہے۔

(القیامہ: ۱۷)

پھر عربی زبان میں کبھی کبھی مصدر کو اسم مفعول (Past participle) کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے، کلام اللہ کو ”قرآن“ اسی معنی میں کہا جاتا ہے، یعنی ”پڑھی ہوئی کتاب“،

قرآن کی بہت سی وجوہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں، زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کا یہ نام کفارِ عرب کی تردید میں رکھا گیا ہے، وہ کہا کرتے تھے:-

لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ الْغَوَا

”تم اس قرآن کو نہ سنو، اور اس کی تلاوت

کے دوران لغو باتیں کیا کرو“

ذِئْبِ، (حتم المسجلی: ۲۶)

ان کفار کے علی الرغم ”قرآن“ نام رکھ کر اشارہ فرما دیا گیا کہ قرآن کریم کی دعوت کو ان اوجھے ہتھکنڈوں سے دبایا نہیں جاسکتا، یہ کتاب پڑھنے کے لئے نازل ہوئی ہے، اور قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی، چنانچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری

لہ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو علی زادہ الحسینی: فتح الرحمن لطالب آیات القرآن، صفحہ ۳۵ و ۳۵۹،

المطبعة الاصلیة بیروت ۲۳۳ھ

لہ الراغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۱۱، اصح المطالیح کراچی ۱۳۸۰ھ
 لہ اس لفظ کے اشتقاق میں اور بھی کئی اقوال ہیں، لیکن وہ تکلف سے خالی نہیں، تفصیل کیلئے
 ملاحظہ ہو الاتقان، ص ۵۲ ج ۱ و مناہل العرفان، ص ۱ ج ۱،

دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

بہر کیف! قرآن کریم کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

”المتزل علی الرسول المکتوب فی المصاحف المنقول الینا نعتلاً
متواتراً بلا شبهة“

”اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں

لکھا گیا، اور آپ سے بغیر کسی شبہ کے تواتر منقول ہے۔“

یہ تعریف تمام اہل علم کے درمیان متفق علیہ ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں،

وحی اور اس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل

کیا گیا ہے، اس لئے سب سے پہلے ”وحی“ کے بارے میں چند باتیں جان لینی ضروری ہیں :-

۱۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش
کی لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری

کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام

ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک

ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے احکام کو

بد نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو،

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو ”علم“ کی ضرورت ہے، اس لئے جب تک اُسے

یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟

ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے

کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کون سے

کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے، اس وقت تک اس کے لئے اللہ کی مرضی پر کاربند ہونا ممکن نہیں،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم ہوتا رہے، ایک انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، منہ اور ہاتھ پیر دو سر عقل، اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعے اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے،

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں، ان کا علم نبری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً اس وقت میرے سامنے ایک انسان بیٹھا ہے، مجھے اپنی آنکھ کے ذریعے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ انسان ہے، آنکھ ہی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اس کا رنگ گورا ہے، اس کی پیشانی چوڑی، بال سیاہ، ہونٹ پتلے اور چہرہ کتابی ہے، لیکن اگر یہی باتیں میں اپنے حواس کو معطل کر کے محض عقل سے معلوم کرنا چاہوں، مثلاً آنکھیں بند کر کے یہ چاہوں کہ اس انسان کی رنگت اس کے اعضاء کی صحیح بناوٹ اور اس کے سراپا کی ٹھیک ٹھیک تصویر مجھے صرف اپنی عقل کے ذریعے معلوم ہو جائے تو یہ ناممکن ہے،

اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً اسی شخص کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی ماں ضرور ہے، نیز یہ بھی علم ہے کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے، اگرچہ نہ اس کی ماں آستورہ کے سامنے ہے، نہ میں اس کے پیدا کرنے والے کو دیکھ سکتا ہوں، لیکن میری عقل بتا رہی ہے کہ یہ شخص خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا، اب اگر میں یہ علم اپنی عقل کے بجائے اپنی آنکھ سے حاصل کرنا چاہوں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ اس کی تخلیق اور پیدائش کا منظر اب میری آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا،

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کا تعلق ہے وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی شخص کے بارے میں عقل نے یہ تو بتا دیا کہ اسے کبھی نے پیدا کیا ہے، لیکن اس شخص کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کے ذمہ خدا کی طرف سے کیا فرائض ہیں؟ اس کا کونسا کام اللہ کو پسند ہو اور کونسا ناپسند؟ یہ سوالات ایسے ہیں کہ عقل اور حواس مل کر بھی ان کا جواب نہیں دے سکتے، ان سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ نے معترف فرمایا ہے اسی کا نام ”وحی“ ہے،

اس سے واضح ہو گیا کہ ”وحی“ انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہوتے، لیکن اُن کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور مذکورہ تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہو کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اسی طرح بہت سے دینی معتقدات کا علم دینا عقل کے بجائے وحی کا منصب ہی، اور ان کے ادراک کے لئے محض عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں،^۱

۱۔ یہاں وحی کی ضرورت کی طرف بہت مجمل اشارے کئے گئے ہیں، اس موضوع پر مفصل بحث کیلئے تمہیدانی مکتورہ سماجی، ص ۶۸ تا ۷۲ اور (ادری) مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم کی کتاب علوم القرآن ص ۸۷ تا ۱۰۸ مطبوعہ ادارہ مدرسہ فاروقیہ بہاول پور ۱۳۸۹ھ ملاحظہ فرمائیے،

وحی کا مفہوم | اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر ”وحی“ کے مفہوم اور اس کی حقیقت پر غور فرمائیے۔
 ”وحی“ اور ”ایحاء“ عربی زبان کے الفاظ ہیں، اور لغت میں ان کے
 معنی ہیں ”جلدی سے کوئی اشارہ کر دینا“ خواہ یہ اشارہ رمز و کنایہ استعمال کر کے کیا جائے
 خواہ کوئی بے معنی آواز نکال کر، خواہ کسی عضو کو حرکت دے کر، یا تحریر و نقوش استعمال
 کر کے، ہر صورت میں لغت اس پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں،
 چنانچہ اسی معنی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم
 میں ارشاد ہے :-

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّكُمْ
 وَعَشِّرْتِي ۗ (مریم: ۱۱)

”پس وہ اپنی قوم کے سامنے محراب سے نکلے، اور انھیں اشارہ کیا کہ صبح و شام
 تسبیح کرتے رہا کرو۔“

پھر ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشارے سے مقصد یہ ہی ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں کوئی
 بات ڈال دی جائے، اس لئے لفظ ”وحی“ اور ”ایحاء“ ”دل میں کوئی بات ڈالنے کے معنی
 میں بھی استعمال ہونے لگا، چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں، مثلاً
 وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا لِلنَّحْلِ ۗ
 ”اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنائے“
 یہاں تک کہ شیاطین دلوں میں جو دوسو سے ڈالتے ہیں ان کے لئے بھی یہ لفظ استعمال
 کیا گیا ہے، ارشاد ہے :-

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي
 بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ ۗ (انعام: ۱۱۲)

”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کیلئے ایک نہ ایک دشمن ضرور پیدا کیا ہے، جن و انس کے
 شیاطین (میں سے جو) ایک دوسرے کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں۔“

نیز ارشاد ہے:-

وَلَنْ الشَّيَاطِينِ لِيُؤْمِنُوا إِلَىٰ أُولِيَاءِهِمْ لِيَجَادُوا لَهُمْ، (الانعام: ۱۲۱)
 اور بلاشبہ شیطان اپنے دوستوں کے دل میں دوسے ڈالتے ہیں، تاکہ تمہارے ساتھ
 جھگڑا کریں۔“

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے جو خطاب فرماتے ہیں اس کو بھی ”ایحجار“ کہا گیا ہے:-

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْ يَنْزِلَ عَلَيْكُمْ، (الانفال: ۱۲)

”جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اطلاع دیتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

کسی غیر نبی کے دل میں جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس کو بھی اسی لفظ
 سے تعبیر فرمایا گیا ہے:-

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ آيْمَنَ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِيْعِيْهِ، (القصص: ۷)

اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو اہام کیا کہ اس کو دودھ پلاؤ۔“

لیکن یہ سب اس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں، شرعی اصطلاح میں ”وحی“ کی تعریف یہ ہے:-

كَلَامُ اللَّهِ الْمُنَزَّلُ عَلَى نَبِيٍّ مِنْ أَنْبِيَائِهِ

”اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔“

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ ”وحی“ اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا

ہے کہ اب اس کا استعمال پیغمبر کے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں، حضرت عتلمہ

انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”وحی“ اور ”ایحجار“ دونوں الگ الگ

لفظ ہیں، اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، ”ایحجار“ کا مفہوم عام ہے، اور انبیاء پر وحی

نازل کرنے کے علاوہ کسی کو اشارہ کرنا اور کسی غیر نبی کے دل میں کوئی بات ڈالنا بھی اس کے

مفہوم میں داخل ہے، لہذا یہ لفظ نبی اور غیر نبی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کے

برخلاف ”وحی“ صرف اُس اہام کو کہتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کیا

وحی کی اقسام

تین قسمیں ہوتی ہیں:-

(۱) وحی قلبی؛ اس قسم میں باری تعالیٰ براہ راست نبی کے قلب کو مسخر فرما کر اس میں کوئی بات ڈال دیتا ہے، اس قسم میں نہ فرشتہ کا واسطہ ہوتا ہے، اور نہ نبی کی قوت سامعہ اور حواس کا، لہذا اس میں کوئی آواز نبی کو سنائی نہیں دیتی، بلکہ کوئی بات قلب میں جاگزیں ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، یہ کیفیت بیداری میں بھی ہو سکتی ہے اور خواب میں بھی، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا،

(۲) کلام الہی؛ اس دوسری قسم میں باری تعالیٰ براہ راست رسول کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے، اس میں بھی کسی فرشتہ کا واسطہ نہیں ہوتا، لیکن نبی کو آواز سنائی دیتی ہے، یہ آواز مخلوقات کی آواز سے بالکل جدا ایک عجیب و غریب کیفیت کی حامل ہوتی ہے، جن کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں، جو انبیاء اُسے سنتے ہیں وہی اس کی کیفیت اور اس کے سرور کو پہچان سکتے ہیں،

وحی کی اس قسم میں چونکہ باری تعالیٰ سے براہ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ قسم وحی کی تمام قسموں میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہے، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فیضیت بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا (النساء: ۱۶۳)

”اور اللہ نے موسیٰ سے خوب باتیں کیں“

۱۔ یہ تین قسمیں بنیادی طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کی فیض الباری ص ۴۸ تا ۵۱ سے ماخوذ ہیں تشریح و تفصیل اور تینوں قسموں کے نام ہمارے اپنے ہیں،

۲۔ ابن الیقین: مدارج السالکین، ص ۳۴ ج ۱، مطبعة التتہ المحمدیہ، مکہ مکرمہ ۱۳۵۵ھ

(۳) **وحی منکلی**؛ اس تیسری قسم میں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام کسی فرشتہ کے ذریعے نہیں تک بھیجتا ہے، اور وہ فرشتہ پیغام پہنچاتا ہے، پھر بعض اوقات یہ فرشتہ نظر نہیں آتا، صرف اس کی آواز سنائی دیتی ہے، اور بعض مرتبہ وہ کسی انسان کی شکل میں سامنے آکر پیغام پہنچا دیتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نبی کو اپنی اصلی صورت میں نظر آجائے، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے،

قرآن کریم نے وحی کی انہی تین قسموں کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا ہے:-
مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْتُمَ إِلَهُهُ إِلَّا وَخِيَاً أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، أَوْ يُرْمِلُ رَسُولًا فَيُؤَسِّرُ بِأُذُنِهِ مَا يَشَاءُ، (النشوری: ۵۱)
 ”کسی بشر کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اللہ اس سے (رد برد ہو کر) بات کرے، مگر دل میں بات ڈال کر یا پردے کے پیچھے سے یا کسی پیغامبر (فرشتے) کو بھیج کر جو اللہ کی اجازت سے جو اللہ چاہے وحی نازل کرے“

اس آیت میں **وَخِيَاً** (دل میں بات ڈالنے) سے مراد پہلی قسم یعنی وحی قلبی ہے، اور پردے کے پیچھے سے مراد دوسری قسم یعنی کلام الہی، اور پیغامبر بھیجنے سے مراد تیسری قسم یعنی وحی منکلی ہے،

حضور پر وحی کے طریقے | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

۱۰ حضرت حارث بن ہشامؓ فضلاء صحابہ میں سے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے، اور سلمہ میں شام کو فتح کرتے ہوئے شہید ہوئے (القطلائیؒ: ارشاد الساری، ص ۵۷، ج ۱ بلاق مصر ۱۳۲۳ھ،

أَحْيَانًا نَائِبًا تَلِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّ عَنِّي فَيَفْصِمُ
هَقِي وَقَدْ وَعَيْتُ مَا قَالُوا أَحْيَانًا تَمَثَّلُ لِي الْمَلَكُ رَجُلًا ۝

”بہی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا؟“

اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے دو طریقے معلوم ہوتے ہیں، (۱) صلصلة الجرس؛ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آپ کو اس قسم کی آواز آیا کرتی تھی کہ

جیسی گھنٹیاں بجنے سے پیدا ہوتی ہے، حدیث میں تو صرف اتنا ہی مذکور ہے، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی وحی کو کس اعتبار سے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، البتہ بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ فرشتے کی آواز ہوتی تھی، بعض کا خیال ہے کہ فرشتہ وحی لاتے وقت اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا تھا، اس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی، اور علامہ خطابیؒ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہاں تشبیہ آواز کے ترجمہ میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل میں ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور کسی جگہ ٹوٹتی نہیں، اسی طرح وحی کی آواز بھی مسلسل ہو کرتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض قیاسات ہیں، اور ان کی بنا پر کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے نقل کر کے اس تشبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ مذکورہ تمام توجیہات سے زیادہ لطیف ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ تشبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے، ایک تو آواز کے تسلسل کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اور دوسرے اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ

۱۔ صحیح بخاری ص ۲ ج ۱، صحیح المطالع کراچی،

۲۔ دیکھئے حافظ ابن حجر، فتح الباری ص ۱۶ ج ۱، المطبعة البیتية ۱۳۲۵ھ

قَيْصَمُ عَنْهُ وَإِنْ جَيِّنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا، ۱۰

”میں نے سخت جارحوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو آپ کی پیشانی مبارک پسینہ سے سشرا اور ہرچکی ہوتی تھی“

ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ ”جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سانس رکنے لگتا، چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑتا سا سانس کے دانت سردی سے پکپکانے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے“ ۱۱

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی تھی کہ آپ جس جانور پر اُس وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سراقدس حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وحی نازل ہوئی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی، ۱۲

اور مسند احمد کی ایک روایت میں آپ خود فرماتے ہیں کہ جب یہ وحی نازل ہوتی ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری رُوح کپکپ رہی ہے، ۱۳

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی سنائی دیتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی، ۱۴

۱۰ صحیح بخاری ص ۲۰۲ حدیث ۵۱، ۱۱ التیوطی: الاتقان ص ۲۶۲ قاہرہ ۱۳۶۵ھ بحوالہ ابن سعید

۱۲ ابن القیم: زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، ص ۱۹۱۸ ج ۱ المطبعة المیمیة - مصر،

۱۳ الفتح الربانی (بتروی مسند احمد) بحوالہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ، ص ۲۱۱ ج ۲۰ کتاب التیویح النبویة

حدیث ۵۱، قاہرہ ۱۳۴۵ھ،

۱۴ ایضاً، ص ۲۱۲ ج ۲۰،

(۲) تمثل ملک؛ وحی کی دوسری صورت جس کا اس حدیث میں ذکر ہے، یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس آکر اللہ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہ کلبیہ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ صحابہ میں سے حضرت وحیہ کلبیہ کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا ہو کہ وہ اپنے وقت کے حسین ترین انسان تھے، اتنے حسین کہ اپنے چہرے کو لپیٹ کر چلا کرتے تھے، البتہ بعض مواقع پر دوسری صورتوں میں بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا آنا ثابت ہے، مثلاً حضرت عمرہ کی مشہور روایت میں وہ بالکل ایک اجنبی کی صورت میں تشریف لائے تھے، کیونکہ وہاں مقصد ہی یہ تھا کہ حاضرین ایک اجنبی کو حضور کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنا دیکھ کر اچھنبے میں بڑ جائیں،

بہر حال اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ جو فرشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لاتا تھا وہ جبرئیل علیہ السلام تھے، قرآن کریم کی آیت ہے:-

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ،

(البقرہ: ۹۷)

”کہہ دو کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو تو (ہو کرے) اسی نے یہ (قرآن) آپ کے دل پر اتارا ہے“

اس سے یہ بات واضح ہے کہ عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی وحی لایا کرتے تھے، البتہ امام حسد نے اپنی تاریخ میں امام شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ابتداء نبوت میں تین سال تک حضرت امیرافیل علیہ السلام وحی لاتے رہے ہیں، لیکن اُن کے ذریعہ قرآن کریم نازل نہیں کیا گیا، قرآن تمام تر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی کے لایا“

۱۔ العینی، عمدة القاری، ص ۲۷، ج ۱، استنبول ۱۳۲۵ھ

۲۔ دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح، ص ۱۱، ج ۱، الصحیح المطابع کراچی

۳۔ الاتقان، ص ۲۶، ج ۱، القسطلانی، ارشاد الساری، ص ۵۹، ج ۱،

مگر علامہ واقفیؒ وغیرہ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سوا کوئی فرشتہ وحی نہیں لایا، علامہ بدر الدین عینیؒ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، اور کسی مرفوع حدیث یا کسی صحابی کے قول میں اس روایت کی بنیاد بھی نہیں ملتی، لیکن حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں، اور اسے زمانہ فرقت کا واقعہ قرار دیتے ہیںؒ

بہر کیف وحی کی اس صورت میں فرشتہ انسان کی شکل میں آیا کرتا تھا، اور وحی کے اس طریقے میں آپ کو کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی تھی، چنانچہ صحیح ابو عوانہؒ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے وحی کی اس صورت کا ذکر کر کے فرمایا:

وَهُوَ أَهْوَىٰ مِنِّي عَسَىٰ أَنَّهُ

اور یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ آسان ہوتی ہےؒ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ بالا حدیث میں تو وحی کے صرف یہ دو طریقے بیان کئے گئے ہیں، لیکن دوسری احادیث سے اس کے علاوہ بھی کئی طریقے معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ علامہ حلیمیؒ نے تو لکھا ہے کہ آپ پر وحی چھٹیالیس طریقوں سے نازل ہوتی تھی، لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حاملِ وحی (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کی مختلف صفات کو وحی کے مختلف طریقے شمار کر کے تعداد چھیالیس تک پہنچا دی ہے اور نہ تعداد اتنی نہیں ہےؒ

تاہم دوسری احادیث سے نزولِ وحی کے جو دوسرے اہم طریقے ثابت ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ عمدة القاری، ص ۴۷، ۴۸ ج ۱ ۲۔ فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۱، ۳۔ الاقانیم ج ۱

۴۔ یہ ابو عبد اللہ حسین بن الحسن الحلیمی البجلی (متوفی ۳۴۳ھ) ہیں، جن کی کتاب ”المنہاج“ اصول دین پر ایک جامع کتاب ہے، رکشف الطنون نمبر ۱۸۷

۵۔ حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱

۶۔ حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱

(۳) فرشتہ کا اصلی شکل میں آنا؛ وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل

علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اُس وقت جب آپ نے خود حضرت جبرئیلؑ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجیاد پر پہلے دو واقعات تو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہوا۔
(۴) رُویا بے صادقہ؛ وحی کی چوتھی صورت یہ تھی کہ آپ کو نزلِ قرآن سے قبل سچے خواب نظر آیا کرتے تھے، جو کچھ خواب میں دیکھتے بیداری میں ویسا ہی ہو جاتا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

أَوَّلُ مَا بَدِئْتُ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ
الرُّؤْيَا الصَّالِحَةَ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرِي رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ
فَلَقِ الصَّبْحُ بِهِ

”آپ پر وحی کی ابتداء نبوت کی حالت میں سچے خوابوں سے ہوئی، اُس وقت آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچا نکلتا۔“

اس کے علاوہ مدینہ طیبہ میں ایک مرتبہ ایک منافق نے آپ پر سحر کر دیا تھا، اس سحر کی اطلاع اور اسے دفع کرنے کا طریقہ بھی آپ کو خواب ہی میں بتایا گیا۔

(۵) کلام الہی؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ کو بھی اللہ تعالیٰ سے

براہِ راست ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، بیداری کی حالت میں یہ واقعہ صرف معراج کے موقع پر پیش آیا ہے، اس کے علاوہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری، ص ۱۸۹ و ۱۹۰ ج ۱،

۲۔ صحیح بخاری، ص ۲ ج ۱ حدیث ۵۱،

۳۔ صحیح بخاری، باب السحر والواب الطیب، ص ۸۵ و ۸۵ ج ۲، مطبوعہ اصح المطابع کراچی،

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں ہے
(۶) نفث فی الروح؛ وحی کا چھٹا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام
کبھی بھی شکل میں سامنے آئے، بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات اِنکار فرمادیتے تھے،
چنانچہ ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْحِي الخ

”روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی“

اور مستدرک حاکم کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

ان جبرئیل علیہ السلام القی فی روعی ان احداً منکم
لن یشرح من الدنیا حتی یتکتمل رزقہ،
”جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا سے
نہیں جائے گا، تا وقتیکہ اپنا رزق پورا نہ کرے“

وحی اور کشف الہام اور بتایا جا چکا ہے کہ وحی صرف انبیاء علیہم السلام کے
ساتھ خاص ہے اور کسی بھی غیر نبی کو خواہ وہ تقدس
اور ولایت کے کتنے بلند مقام پر ہو، وحی نہیں آسکتی۔ البتہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ
اپنے بعض خاص بندوں کو کچھ باتیں بتا دیتا ہے، اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے، کشف
اور الہام میں حضرت محمد و الف ثانی نے یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ کشف کا تعلق حسنیات
سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز یا واقعہ آنکھوں سے نظر آجاتا ہے، اور الہام کا تعلق وجدانیات
سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی، صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے،
اسی لئے عموماً الہام کشف کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہوتا ہے،

الخ ایضاً،

لہ الاتقان، ص ۱۳۶ ج ۱،

الخ الحاکم؟ المستدرک، کتاب البیوع ص ۲ ج ۲، دائرة المعارف، دکن، ۱۳۲۷ھ

الخ فیض الباری ص ۱۹ ج ۱

وحی کی آخری صورت یعنی ”نفث فی الزرع“ بظاہر الہام سے بہت قریب ہے۔ کیونکہ دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ دل میں کسی بات کا القاء کر دیا جاتا ہے، لیکن دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ وحی میں — جو صرف نبی کو ہوتی ہے — ساتھ ساتھ یہ علم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ بات کس نے دل میں ڈالی ہے؟ چنانچہ حاکم ح کی مذکورہ روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً بتلادیا کہ ”روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے“ لیکن الہام میں ڈالنے والے کی تعیین نہیں ہوتی، بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ دل میں کوئی ایسی بات آگئی ہے جو پہلے نہیں تھی بلکہ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کی وحی سونی صدیقینی ہوتی ہے، اور اس کی پیروی فرض ہے، لیکن اولیاء اللہ کا الہام یقینی نہیں ہوتا، چنانچہ ذہ دین میں حجت ہے، اور نہ اس کا اتباع فرض ہے، بلکہ اگر کشف الہام یا خواب کے ذریعہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن و سنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے،

وحی متلو اور غیر متلو | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو قرآن کریم کی آیات، جن کے الفاظ اور

معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے، اور جو قرآن کریم میں ہمیشہ کے لئے اس طرح محفوظ کر دی گئیں کہ ان کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی نہ بدلا جاسکتا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے۔ اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں ”وحی متلو“ کہا جاتا ہے، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، دوسری قسم اس وحی کی ہے جو قرآن کریم کا جزو نہیں بنی، لیکن اس کے ذریعہ آپ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے ہیں، اس وحی کو ”وحی غیر متلو“ کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، عموماً وحی متلو یعنی قرآن کریم میں اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفا کر کیا گیا ہے ان تعلیمات کی تفصیل

لہ رشید رضا، الوحی المخدومی، ص ۳۸، مطبعۃ المنار مصر ۱۳۵۷ھ،

۱۵۱۷ شاطبی؟ الاعتصام ص ۳۵۱، فابعد ج ۱ مطبعۃ المنار مصر ۱۳۳۳ھ،

اور جزوی مسائل زیادہ تر ”وحی غیر متلو“ کے ذریعہ عطا فرمائے گئے ہیں، یہ ”وحی غیر متلو“ صبح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے، اور اس میں عموماً صرف مضامین وحی کے ذریعہ آپ پر نازل کئے گئے ہیں، ان مضامین کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب آپ نے خود فرمایا ہے، ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

أُوتِيتَ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ

”مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ اسی جیسی دوسری تعلیمات بھی“

اس میں وترآن کریم کے ساتھ جن ”دوسری تعلیمات“ کا ذکر ہے ان سے مراد یہی وحی غیر متلو ہے،

اسلامی احکام کی جزوی تفصیلات چونکہ اسی وحی غیر متلو کے ذریعہ بتائی گئی ہیں، اس لئے جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اسلامی احکام کی پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں انھوں نے کچھ عرصہ سے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ ”وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ سب قرآن کریم میں محفوظ ہے، قرآن کریم کے علاوہ جو احکام آپ نے دیئے وہ ایک سربراہ مملکت کی حیثیت سے دیئے جو صرف اُس زمانے کے مسلمانوں کے لئے واجب العمل تھے، آج اُن پر عمل کرنا ضروری نہیں،

لیکن یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے، خود وترآن کریم کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی الہی صرف قرآن کریم میں منحصر نہیں بلکہ آیاتِ قرآنی کے علاوہ بھی آپ کو بہت سی باتیں بذریعہ وحی بتائی گئی تھیں، اس بات کی تائید میں چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیے :-

(۱) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ، (البقرہ: ۱۴۴)

”اور جس قبلہ کی طرف آپ پہلے رُخ کرتے، تھے، اسے ہم نے صرف اس لئے
مقرر کیا تھا تاکہ یہ جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنی
ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے“

ہر مسلمان جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں ایک عرصہ تک
بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے، میں، اس کے بعد جب دوبارہ بیت
القدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے
بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنے کا حکم صرف اس لئے دیا تھا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے
کہ کون اس حکم کی تعمیل کرتا ہے اور کون انکار، یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس آیت
میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب
فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم بھی ہم نے ہی دیا تھا، اب قرآن کریم کو اللہ سے
لے کر دانتاں تک پڑھ جائیے، اس میں کہیں یہ حکم نہیں ملے گا کہ ”بیت المقدس
کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی
وحی کے ذریعہ دیا تھا جو قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں، اور اسی کا نام وحی غیر منقولہ
(۲) فَلَمَّا نَبَاَت بِوَهٍ وَأَظْهَرَكَ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ
عَنْ بَعْضِ الْخِ “ (التحریم: ۳)

”پس جب اُس (دعوت) نے آپ کو اس کی خبر دی اور اللہ نے اس کو آپ پر

ظاہر کر دیا،

اس آیت کی تشریح مختصر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجہ مطہرہ
نے ایک بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنی چاہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ
وحی آپ کو وہ بات بتلا دی، اس پر انھوں نے آپ سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے
بتائی؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات مجھے علیمِ دخیل یعنی اللہ تعالیٰ نے بتلا دی تھی، اس آیت
میں تصریح ہے کہ وہ پوشیدہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی بتلائی تھی، حالانکہ
پورے قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اطلاع

آپ کو وحی غیر متلوّ کے ذریعہ دی گئی تھی،

اور بھی متعدد آیات سے وحی غیر متلوّ کا ثبوت ملتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف اپنی دو آیتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، اگر تحقیق حق مقصود ہو تو یہ دو آیتیں بھی اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہوتا ہے کہ وحی غیر متلوّ بھی وحی کی ایک قسم ہے، اور وہ بھی وحی متلوّ کی طرح یقینی اور واجب الاتباع ہے،

یہ وحی اور اس کی حقیقت سے متعلق وہ ضروری محلوّات

وحی پر عقلی شہادت

تھیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں، ہم شروع میں بکھجے ہیں کہ وحی اُن معاملات میں اللہ کی طرف سے رہنمائی کی ایک شکل ہے، جن کا ادراک زہری عقل سے نہیں ہو سکتا، اور چونکہ وحی کا مشاہدہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا، اس لئے اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیات کا اندازہ بھی دوسروں کے لئے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج کی وہ دنیا جو مغربی افکار کے ہمہ گیر سیلابِ مرعوب ہے، اسے یہ باتیں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں، اور وہ انھیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر بعض لوگ تو کھل کر وحی و الہام کا انکار کر کے اسے معاذ اللہ قصّہ کہانی سے تعبیر کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو اس کا کھل کر انکار تو نہیں کرتے، لیکن ”سانٹفک ترقیات“ کے اس دور میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرماتے ضرور ہیں، اس لئے یہاں مختصراً یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خالص عقلی اعتبار سے وحی کی کیا حیثیت ہے؟

ہمارے نزدیک وحی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے طے کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک ہی یا یہ خود بخود بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے وجود میں آگئی ہے؟ جہاں تک اُن مادہ پرست لوگوں تعلق ہے جو سر سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، جو شخص خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ وحی کی حقیقت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اُسے دل و جان سے تسلیم کر لے، اس لئے اس سے تو سب سے

پہلے خدا کے وجود پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، رہے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں سو ان کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں،

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کی ہو وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے اُسے اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزلی مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو پورے کار لا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کی ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے ہوئے اس کے سفر کا مقصد بتائے اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اُسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے، اور سفر کے دوران اُس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی قسم کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اُس خداوندِ قدوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا عجیب و غریب نظام پیدا کیا ہو وہ اپنی بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے، جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصد زندگی سے متعلق ہدایات دی جا سکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہی، بلکہ اُن کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی و رسالت ہے،

اس سے صاف واضح ہے کہ ”وحی“ محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں ایک عقلی ضرورت ہے، جس کا انکار درحقیقت اللہ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے، رہی یہ بات

کہ وحی کے جو طریقے اوپر ذکر کئے گئے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، سو یہ وحی کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی علمی دلیل نہیں ہے، جس چیز کی عقلی ضرورت اور اس کا وقوع ناقابل انکار دلائل سے ثابت ہو اُسے محض اس بنا پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ ہم نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، آج سے چند سو سال پہلے اگر کسی شخص کے سامنے یہ ذکر کیا جاتا کہ غفریب انسان ہوائی جہاز میں پرواز کر کے ہزاروں میل کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر لیا کریں گے تو وہ یقیناً اسے پرووں کا افسانہ قرار دیتا، لیکن کیا اس کے مشاہدہ نہ کرنے سے ہوائی جہاز کی حقیقت ختم ہو گئی ہے؟ آج بھی پسماندہ علاقوں کے ہزار ہا افراد ایسے ہیں جو اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہی، لیکن کیا ان کے انکار کرنے سے یہ واقعہ غلط ثابت ہو گیا ہے؟ دیہات میں جا کر کسی آدمی سے کمپیوٹر سسٹم کی تفصیلاً بیان کجھی اور اسے بتائیے کہ کس طرح ایک مشین انسانی دماغ کا کام کر رہی ہے، وہ آپ کے بیانات پر آخر تک شک و شبہ کا اظہار ہی کرتا رہے گا، لیکن کیا ان شکوک و شبہات سے کمپیوٹر کے وجود کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو وہ وحی جس کی عقلی ضرورت مسلم اور ناقابل انکار ہے، اور جس کا مشاہدہ دنیا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق ترین انسانوں نے کیا ہے (علیہم السلام) اسے محض ان شکوک و شبہات کی بنا پر کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے؟

اور آخر وحی کے ان طریقوں میں عقلی بُعد کیا ہے؟ کیا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو وحی کے ان طریقوں پر قدرت نہیں؟ اگر دنیا کے سائنسدان محض اپنی محدود عقل کے بل پر پیغام رسانی کے لئے ٹیلیفون، تار، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حیرت انگیز آلات ایجاد کر سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) اتنی بھی قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا سلسلہ قائم فرما دے جو ان تمام ذرائع مواصلات سے زیادہ مستحکم اور یقینی ہو؟

وحی کی حقیقت یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کسی واسطے کے ذریعہ یا بلا واسطہ اپنے کسی پیغمبر پر القاء فرمادیتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس بات کو درست تسلیم کر لیتے ہیں

عقلی تباحث کیا ہے؟ وحی کے ثبوت میں کسی انسانی ایجاد یا عمل کی مثال پیش کرتے ہوئے ہمیں تامل ہوتا ہے، لیکن بات کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم ایک ایسے انسانی عمل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کے قلب و دماغ کو مسخر کر کے اس میں جو خیال چاہتا ہے ڈال دیتا ہے،

اس عمل کو صوفیاء کی اصطلاح میں "تصرف خیالی" کہا جاتا ہے، صوفیائے کرام کے تذکروں میں اس عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جس کے ذریعہ ایک شخص اپنی خیالی قوت کے زور سے دوسرے کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اس سے جو چاہتا ہو کہلاتا ہے، اور جو چاہے کر داتا ہے، مادہ پرست لوگ ایک مدت تک اس "تصرف" کی قوت کا بھی انکار کرتے رہے، اور انہی کی تقلید میں بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قصہ کہانی سے تعبیر کیا، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سوئٹزرلینڈ کا مشہور ماہر طبیعیات میسر (Mesmer) پیدا ہوا، اس نے انسانی دماغ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور ۱۷۷۷ء میں اپنے ایک مقالے کے ذریعے یہ انکشاف کیا کہ ایک مقناطیسی عمل کے ذریعے انسان کے دماغ کو مسخر کیا جاسکتا ہے، اس عمل کو وہ مقناطیسی عمل تنویم (Anima Magnetism) کہتا تھا، اور فرانس میں مقیم رہ کر اس نے کامیاب عملی تجربے بھی کئے، لیکن وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو پوری طرح مطمئن نہ کر سکا، پھر ۱۷۸۲ء میں انگلینڈ میں ایک اور شخص جیمس بریڈ.....

۱) اس کا پورا نام فریڈرک اینٹون میسر (Fredrich Anton Mesmer) ہے، یہ سوئٹزرلینڈ کی ایک جھیل کانسٹنس کے قریب مئی ۱۷۳۴ء میں پیدا ہوا اور میر سبرگ کے مقام پر مارچ ۱۷۸۷ء میں وفات پائی، ابتداء میں اس نے طب کو اپنا موضوع بنایا تھا، بعد میں مقناطیسی عمل تنویم کا ماہر بلکہ اس کا بانی کہلایا، اور درلڈ فیملی انسائیکلو پیڈیا ص ۲۲۵ ج ۳ ص ۱۲ مطبوعہ مشیگان امریکہ ۱۹۵۷ء) میسرزم کا علم اسی کی طرف منسوب ہے،

(James Braid) (پیدا ہوا، جس نے اس عملِ تسخیر کو سائنٹفک
بنیادوں پر از سر نو ثابت کر کے اس کا نام عملِ تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism)
تجویز کیا،

جیمس بریڈ کے تجویز کردہ ہپناٹزم میں مختلف مدارج ہوتے ہیں، اس کا انتہائی درجہ
تویہ ہوتا ہے کہ جس شخص پر یہ عمل کیا جائے یعنی معمول (Hypnotised)
اس کے جسم کے تمام عضلات و اعصاب بالکل جامد اور بے حس ہو جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ
حواسِ ظاہر و باطنہ معطل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا ایک درمیانی درجہ بھی ہے، جس میں
جسم بے حس و حرکت نہیں ہوتا، اس کیفیت کا حال بیان کرتے ہوئے درلڈ فیمسلی
انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے :-

” اگر تنویم کا عمل ذرا ہلکا ہو تو معمول اس لائق رہتا ہے کہ وہ مختلف اشیاء کا
تصور کر سکے، مثلاً اس حالت میں یہ ممکن ہو کہ وہ (عادل کی ہدایت کے مطابق) اپنی
آپ کو کوئی اور شخصیت یقین کرے، اُسے کچھ خاص چیزیں (جو وہاں فی الواقعہ
موجود نہیں ہیں) نظر آنے لگیں، یا وہ غیر معمولی حس اپنے اندر محسوس کرنے لگے، اس
کہ وہ اُس وقت عامل کی ہدایات کا تابع ہو جاتا ہے۔“

جیمس بریڈ کی تحقیقات اور تجربات کے بعد ہپناٹزم کو اُن مادہ پرست لوگوں نے
بھی مان لیا جو پہلے اس کے قائل نہ تھے، اور آجکل تو یہ معنری عوام کی دلچسپی کا بہت بڑا
موضوع بنا ہوا ہے، سینکڑوں عامل اس کے ذریعہ روپیہ کماتا رہے ہیں، مریضوں کے علاج
میں بھی اس سے کام لیا جا رہا ہے، اور وہ ”تصرف خیالی“ جس کا ذکر مسلمان صوفیاء کرام
کے یہاں صدیوں سے چلا آتا تھا اور جو لوگ محض توہم پرستی کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے،
اب ہپناٹزم کے نام سے ایک حقیقت بن گیا ہے، اور اب ہمارے زمانے کے وہ نام نہا
”عقلیت پسند“ بھی اُسے تسلیم کرنے لگے ہیں جنہیں مسلمانوں کی ہر غیر معمولی بات توہم پرستی

اور مغرب کی ہر در یافت سائنٹفک حقیقت نظر آتی ہے،

بہر کیف، عرض کرنا یہ تھا کہ مسمریزم ہو یا ہیناٹزم، اس کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہو کہ ایک انسان دوسرے کو مسخر کر کے اپنے خیالات اور اپنی باتیں اس کے دل و دماغ میں ڈال دیتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کے تصرف خیالی یا عملی تنزیہ میں اتنی قوت دی ہے کہ وہ معمولی معمولی مقاصد کے لئے بلکہ بعض اوقات بالکل بیکار دوسرے کے دماغ و دل کو مسخر کر لیتا ہے، کیا وہ خود اس بات پر قادر نہیں ہے کہ انسانیت کی ہدایت کی خاطر ایک پیغمبر کے قلب کو مسخر کر کے اپنا کلام اس میں ڈال لے؟ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ،

اور ذکر آچکا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں؛ ایک کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟ وحی متلو یعنی ترکان کریم، اور دوسری وحی غیر متلو، اس دوسری قسم میں تو عموماً یہ ہوا ہے کہ صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور انھیں تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب حضرت جبرئیل علیہ السلام یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ نہیں، وہ لفظاً اور معنی پورا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی من و عن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، اور ان کے انتخاب یا ترکیب و انشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا،

جو لوگ وحی کے بارے میں مادہ پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہیں ہمارے زمانے میں ان میں سے بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا تھا، اور (معاذ اللہ) اس کے الفاظ اور ترکیبیں وغیرہ سب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، لیکن یہ خیال بالکل باطل، جہل اور قرآن و سنت کے صریح دلائل کے بالکل خلاف ہے،

قرآن کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معانی

دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں:-
 (۱) قرآن کریم نے جابجا اپنی ایک صفت ”عربی“ بیان فرمائی ہے، یعنی یہ کہ اسے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا ہوتا تو اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں،

۲۔ قرآن کریم میں کئی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض منصبی بیان فرمائے گئے ہیں؛

يَسْلُوْا عَلَيْهِمْ اَبْنَاءُ الْيَتَامَىٰ وَعُلِيٌّ لَهُمْ وَيَكْتُبَ وَاتَّحِكُمَهُ وَيُزَكِّيهِمْ رَابِعَهُ
 ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کریں اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں
 اور انھیں پاک ٹھاننا میں“

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ دو فرائض الگ الگ تھے، ایک آیات اللہ کی صرف تلاوت اور دوسرے ان کی تعلیم، ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معنی کی نہیں لہذا آپ کے سب سے پہلے فریضہ منصبی کا تعلق صرف الفاظ قرآن سے ہے معانی سے نہیں؛
 ۳۔ قرآن کریم نے جابجا اپنے لئے ”الکتاب“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اور لفظ ”کتاب“ کا اطلاق صرف ذہنی مضامین پر نہیں ہوتا، بلکہ جب ان مضامین کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے تب اُسے کتاب کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے لفظ اور معنی دونوں منزل من اللہ ہیں،

۴۔ سورہ قیامت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی الفاظ ڈھراتے تھے اس پر باری تعالیٰ نے حکم دیا کہ :-

۱۔ ملاحظہ فرمائیے سورہ نحل: ۱۰۳، شعراء: ۱۹۵، یوسف: ۲، ظہر: ۱۳۳، الرعد: ۳۹، الزمر: ۲۸

لحم السجود: ۳، الثوری: ۷، الزخرف: ۳ وغیرہ،

لَا تُجْرَعُ بِهِ لِسَانُكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۚ إِنَّ عَلَيْكَ جَمْعَهُ ۚ قُرْآنَهُ ۚ
 وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِرَبِّهِ ۚ وَاسْمُ اللَّهِ أَعْزَمُ ۚ (البقرہ: ۱۷۱)

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان ناکہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا زمہ ہے اور
 جمع کر دینا تیری سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان، پھر جب ہم پڑھنے لگیں (ذرفتہ کی زبان)،

یہ آیت صراحتہً دلالت کر رہی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو الفاظ لے کر آتے تھے
 وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا، اسی لئے اس کے الفاظ یاد کرانے، اس کی تلاوت کا طریقہ
 سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے تینوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لئے ہیں
 ان واضح دلائل کی روشنی میں یہ گمان بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ الفاظِ قرآن وحی کے
 ذریعے نازل نہیں کئے گئے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبد العظیم زرقانی نے
 بڑی اچھی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :-

”اس مقام پر بحث کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں
 بالفاق بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں، اور احادیثِ قدسیہ کے بارے میں بھی مشہور
 قول یہی ہے کہ ان کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ احادیثِ نبویہ
 کے صرف معنی وحی ہیں، الفاظ حضور کے اپنے ہیں، اور جو احادیث آپ نے اپنے
 اجتہاد سے ارشاد فرمائیں ان کے معنی اور الفاظ دونوں حضور کے ہیں“

دراصل جن لوگوں نے الفاظِ قرآن کے وحی ہونے سے انکار کیا ہے ان کے
 اس مغالطے کا منشاء یہی ہے کہ وحی کے ذریعے الفاظ کا نزول ان کی سمجھ میں نہ آسکا، لیکن
 وحی کی حقیقت اس کی عقلی ضرورت اور اس پر عقلی مشبہات کے جواب میں جو باتیں اور
 لکھی گئی ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے، اگر وحی واقعہً
 ایک ضرورت ہے اور باری تعالیٰ اس پر قادر ہے، تو آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ وہ معنی
 تو نبی کے قلب پر اتار سکے اور الفاظ اتارنے پر (معاذ اللہ) قادر نہ ہو؟

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ علامہ بذرالدین زکرتشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، الفاظ حضرت جبرئیلؑ کے یا حضورؐ کے ہیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ قرآن و سنت اور اجماع امت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ اقوال بالکل باطل ہیں، مذکورہ بزرگوں نے بھی ان اقوال کے قائلین کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ قال بعضهم (بعض لوگوں نے کہا ہے) کہہ کر یہ اقوال نقل کر دیئے ہیں، اور علامہ سیوطیؒ نے تو اس کی صراحتہ تردید بھی کی ہے، اس لئے ان اقوال کو اس مذہب باطل کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

—————

تاریخ نزولِ قرآن

قرآن کریم در اصل کلام الہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے،
قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

بَلِّغْهُنَّ مَا نَزَّلَ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ (البورج: ۲۲)

”بلکہ یہ سترآن مجید ہی، لوح محفوظ میں“

پھر لوح محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورا کاپورا آسمان
دنیا کے بیٹے عورت“ میں نازل کر دیا گیا، اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر
تھوڑا تھوڑا کر کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیس سال میں اس کی
تکمیل ہوئی، سترآن کریم میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، ایک ”انزال“ اور دو ”تنزیل“
”تنزیل“ کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک ہی دفعہ میں مکمل نازل کر دینا، اور ”تنزیل“
کے معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا، چنانچہ سترآن کریم نے اپنے لئے پہلا لفظ
جہاں کہیں استعمال کیا ہے، اس سے مراد عموماً وہ نزول ہے جو لوح محفوظ آسمانِ نبی
کی طرف ہوا، ارشاد ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (الدخان: ۲)

”بلاشبہ ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے“ اور ”تزلیل“ سے مراد وہ نزلوں سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج ہوا، چنانچہ ارشاد ہے:-

وَقَرَأْنَا فَرَقًا مِّنْهُ لَمَّا نَزَّلْنَاكَ تَنْزِيلًا

(یعنی اسرائیل: ۱۴)

”اور قرآن کو ہم نے متفرق طور سے اس لئے اتارا تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا،“

نزول قرآن کی یہ دو صورتیں خود تشریح کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائی، حاکم، بیہقی، ابن ابی شیبہ، طبرانی، اور ابن مرددہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کا پہلا نزول یحیٰ بنی آسمان دنیا پر ہوا، اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلا نزول؛

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے ایک مقام ”بیت عزت“ پر ہوا، جسے ”البیت المعمور“ بھی کہا جاتا ہے، اور جو کعبۃ اللہ کے محازات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ ”بیت عزت“ میں قرآن کا نزول کس طرح ہوا؟ اور اس نزول کی حکمت کیا تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ بعض علماء مثلاً علامہ ابو شامہ نے یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعت شان کو واضح کرنا مقصود تھا، اور اس مقام کے ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہل زمین کی ہدایت کے لئے اتاری جانے والی ہے، ذوقانی نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس

۱۔ دیکھئے الاتقان، ص ۱۲۱ ج ۱، النوع السادس عشر،

۲۔ طاہر الکردی، تاریخ القرآن وغرائب اسرارہ وحکما، ص ۲۰، ج ۲، اسلام ۳۵، مناہل العرفان، ص ۳۹،

طرح دو مرتبہ اتارنے سے یہ بھی جتنا مقصود ہے کہ یہ کتاب ہر شک و شبہ بالاتر ہے ؛
 حضورؐ کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں اور
 دوسرے بیتِ عزت میں، واللہ اعلم،

بہر کیف! اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ کون کرے؟ اسی کو صحیح علم ہے کہ اس کی
 اور کیا کیا حکمتیں ہوں گی، اور ہمیں اُن کی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے،
 البتہ ہمیں اتنا وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ پہلا نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا،
دوسرا نزول؛

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا نزول بھی نزول اُس وقت
 شروع ہوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کا آغاز
 بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر ہی سے ہوا ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں گیارہ
 سال بعد غزوہ بدر پیش آیا چنانچہ ارشاد ہے :-

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّلَافِ الْجَمْعَانِ
 (انفال: ۲۱)

اس طرح نزول قرآن کے آغاز کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں تو خود قرآن کریم
 سے ثابت ہیں :-

- ۱- اس کی ابتداء رمضان کے مہینے میں ہوئی،
 - ۲- جس رات نزول قرآن کا آغاز ہوا وہ شب قدر تھی،
 - ۳- یہ وہی تاریخ تھی جس میں بعد کو غزوہ بدر پیش آیا،
- لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس کے بارے میں کوئی یقینی بات

میں مشہور یہ ہے کہ آپؐ کو نبوت ربیع الاول میں عطا ہوئی تھی، علامہ سیوطی نے اس کا محل یہ بتایا
 ہے کہ آپؐ کو ربیع الاول میں پچھنے خواب آنے شروع ہوئے تھے، یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا، پھر
 رمضان میں قرآن نازل نازل ہوا، (الاتقان، ص ۴۲ ج ۱)

نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترہویں، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے؛

سب سے پہلے نازل ہونی والی آیت؛

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اتریں وہ سورہٴ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل وحی کی ابتدا، تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپ غار حرا میں کئی کئی راتیں گزارتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن اسی غار میں آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضور نے فرمایا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔“ اس کے بعد خود حضور نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا، اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں“ فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اس پر اس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

اِقْرَأْ يَا سَمِيرَةَ بَيْتِكَ الَّذِي خَلَقَ ه خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ، (علق: ۱)

”پڑھو، اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجھد خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے“

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو لے کر واپس گھر کی طرف چلے، تو آپ کا مبارک

دل دھڑک رہا تھا، آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے، اور فرمایا: **ذَمِيكُنِي**، **ذَمِيكُنِي** (مجھے کبیل اڑھاؤ، مجھے کبیل اڑھاؤ) گھر والوں نے آپ کو کبیل اڑھایا، یہاں تک کہ آپ سے خوف جاتا رہا،

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا، اس زمانے کو ”فترت وحی“ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا، آپ کو آسمانِ دزمین کے درمیان دکھائی دیا اور اس سورۃ مدثر کی آیات آپ کو سنائیں،

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ تقریباً تمام کتب حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک صحیح ہی ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی آیات جو آپ پر نازل ہوئیں سورۃ علق کی ابتدائی آیات ہیں، ان کے بعد سورۃ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں، لیکن اس سلسلے میں تین اقوال اور بھی ہیں، جن پر یہاں ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا:-

۱- صحیح بخاری کتاب التفسیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر سب سے پہلے سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اس بنا پر بعض علماء نے یہ کہہ دیا کہ نزول کے اعتبار سے سورۃ مدثر سورۃ علق سے مقدم ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے اس مغالطہ کی حقیقت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ درحقیقت بخاری کی کتاب التفسیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت مختصر ہے، اور اس میں دو جملے نقل نہیں کئے گئے، یہی روایت امام زہری رضی اللہ عنہ کی سند سے بخاری ہی نے باب بدر الوحی میں نقل کی ہے، اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے سورۃ مدثر کے نزول کا واقعہ بتاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ صراحتاً نقل فرمائے ہیں کہ:-

۱۵ صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳ باب کیف کان بدو الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

قَادَ الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلَى الْكُرْسِيِّ
 ”پس اچانک (میں نے دیکھا کہ) جو فرشتہ میرے پاس فارحرا میں آیا تھا
 وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے“

اس سے صاف واضح ہے کہ فارحرا میں سورۃ القدر کی آیتیں پہلے نازل ہو چکی
 تھیں، سورۃ مدثر بعد میں نازل ہوئی، ^۱ البتہ یہ کہنا درست ہو کہ ”فترت وحی“ کے بعد
 سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۃ مدثر کی ہیں، لہذا جن روایات میں حضرت
 جابر رضی عنہ سے یہ منقول ہو کہ پہلی نازل ہونے والی وحی ^۲ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ہے، اس سے
 مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”فترت“ کے زمانہ کے بعد پہلی وحی یہ تھی، اور یہ بھی ہو سکتا
 ہے کہ پہلی سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ سورۃ مدثر تھی، کیونکہ سورۃ اقرآ پر ہی ایک
 مرتبہ نازل نہیں ہوئی،

۲- امام بیہقی نے دلائل النبوة میں حضرت عمرو بن حبیل رضی اللہ عنہ سے ایک
 مرسل روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزد دل وحی سے پہلے حضرت
 خدیجہ رضی عنہا سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جب بھی خلوت میں جانا ہوں تو کوئی مجھے ^۳ يَا مُحَمَّدُ
 يَا مُحَمَّدُ کہہ کر بکارتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن جب میں خلوت میں پہنچا تو اس نے
 کہا ^۴ يَا مُحَمَّدُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ
 یہاں تک کہ پوری سورۃ فاتحہ پڑھ دی ^۵،

اس روایت کی بنا پر علامہ زحمشری نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی
 سورت سورۃ فاتحہ ہے، بلکہ اسی کو انھوں نے اکثر مفسرین کا قول قرار دیا ہے، ^۶ لیکن
 حافظ ابن حجر نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ زحمشری کا یہ کہنا درست نہیں،

۱- فتح الباری، ص ۲۳ ج ۱، اس واقعہ کی مزید تحقیق کے لئے دیکھئے فیض الباری ص ۲۵ ج ۱،

۲- الاتقان، ص ۲۲۵ ج ۱، ۳- الاتقان، ص ۲۵ ج ۱،

۴- الزحمشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ص ۷۷ ج ۲، مطبع الاستقامة، قاہرہ ۱۳۶۵ھ

سورۃ فاتحہ کو پہلی وحی فرار دینے والے بہت کم ہیں، اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ سورۃ
اِقْرَأْ سَبَّحْ بِهَا نَزَّلَ هُوَ

جہاں تک یہی سب کی مذکورہ روایت کا تعلق ہے اُس کے بارے میں خود امام بیہقی نے
یہ لکھا ہے کہ اگر یہ روایت درست ہو تو یہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ سورۃ اِشْرَارِ اور سورۃ
مَدَّ ثَرِّ کے نزول کے بعد کا ہو، اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
نے یہ خیال بھی فرمایا ہے کہ ہو سکتا ہے سورۃ فاتحہ بعض دوسری آیات کی طرح
دو مرتبہ نازل ہوئی ہو، ایک مرتبہ سورۃ اِشْرَارِ کے نزول سے پہلے، اور دوسری بار
اس کے بعد، اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ سورۃ فاتحہ کا نزول پہلی بار قرآنیّت
کی صفت کے ساتھ نہیں ہوا تھا، بلکہ ایک فرشتہ نے آپ کو یہ سورت سنائی تھی،
بعد میں اپنے وقت پر باقاعدہ قرآن کے جزء کی حیثیت میں نازل ہوئی،

بہر کیف! ان تین روایتوں کو چھوڑ کر باقی اکثر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ
سورۃ اِقْرَأْ کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطی نے اس کی تائید
میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں

مکی اور مدنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہو گا کہ کسی سورت کے
ساتھ ”مکی“ اور کسی کے ساتھ ”مدنی“ لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے،
اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق ”مکی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو
آپ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ سے پہنچنے سے پہلے پہلے نازل ہوئی، بعض لوگ
”مکی“ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور ”مدنی“ کا یہ کہ وہ شہر مدینہ

۱۔ فتح الباری ص ۵۸۰ ج ۸ کتاب تفسیر سورۃ اِقْرَأْ، ۲۔ الاتقان ص ۲۵ ج ۱،

۳۔ الاتقان، ص ۲۳ ج ۱،

۴۔ فیض الباری، ص ۲۵ ج ۱،

میں اُتری، لیکن اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق یہ مطلب سمجھا درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں، لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں مکئی کہا جاتا ہے، چنانچہ منی، عرفات وغیرہ اور سفر معراج کے دوران نازل ہونے والی آیات ایسی ہی ہیں، یہاں تک کہ سفر ہجرت کے دوران جو آیات راستے میں نازل ہوئیں وہ بھی مکئی کہلاتی ہیں، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر انھیں مدنی کہا جاتا ہے، چنانچہ ہجرت کے بعد آپ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپ مدینہ سے سینکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیات مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ ان آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوة حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا**، مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، لہ

خلاصہ یہ ہے کہ مکئی اور مدنی کی تقسیم اگرچہ بظاہر مقامات نزول کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ زمانہ نزول کے اعتبار سے ہے، ہجرت کی تکمیل سے قبل کی آیات مکئی ہیں اور بعد کی مدنی،

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس میں آپ نے کسی آیت یا سورت کو مکئی یا مدنی قرار دیا ہو، لیکن جن حضرات صحابہؓ و تابعینؓ نے فسران کریم کے الفاظ و معانی کی حفاظت میں اپنی عمریں کھپائی ہیں انھوں نے ہی سورتوں اور آیات کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے کونسی مکئی ہے اور کونسی مدنی؟ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں: ”قسم اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کی کتاب کی ہر آیت

لہ تفصیل کے لئے دیکھئے البرہان فی علوم القرآن، ص ۱۸۸ ج ۱، النوع التاسع،

لہ مناہل العرفان ص ۱۸۸ ج ۱،

کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "خدا کی قسم! میں ہر ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ رات میں نازل ہوئی یا دن کو، میدانی علاقہ میں اترتی یا پہاڑ پر؟"

اکثر و بیشتر تو انہی حضرات صحابہؓ نے قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ وہ مکی ہیں یا مدنی، اس کے علاوہ بعض آیات یا سورتوں کے بارے میں دو سکر شواہد کے ذریعہ بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے، مثلاً جن آیات میں غزوہ بدر کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ وہ مدنی ہی ہو سکتی ہیں، یا جن آیتوں میں خاص طور پر شرکین مکہ سے خطاب کرنے کو کہا گیا ہے ان میں سے بیشتر کو مکی ہی سمجھا جاسکتا ہے، لہذا بعض مرتبہ اس قسم کے قیاسات اور شواہد کی بنیاد پر بھی کسی آیت کو مکی یا مدنی قرار دیا جاتا ہے، پھر چونکہ قیاسات مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے بعض آیات کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بعض کے نزدیک وہ مکی اور بعض کے نزدیک مدنی ہیں، پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکی یا پوری کی پوری مدنی ہیں مثلاً سورہ مدثر پوری مکی ہے اور سورہ آل عمران پوری مدنی، اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت تو مکی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی آگئی ہیں مثلاً سورہ اعراف مکی ہے، لیکن اس میں *وَإِنَّا لَهُمْ عَنِ الْقُرْآنِ آلِيٌّ كَانَتْ كَذِبًا* البعہ سے لے کر *وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّ الْأَمْرَ لَمَّا كُنْتُمْ عَلَىٰ السُّجُودِ* اس کی چار آیتیں یعنی *وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ* سے لے کر *عَذَابٌ يَوْمَ عَقْبِمْ* تک مکی ہیں،

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکی یا مدنی ہونا عموماً اس کی آیات کی اکثریت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی

ابتدائی آیات ہجرت سے قبل نازل ہو گئیں، اُسے مکی ستراردید یا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں،

مکی و مدنی آیتوں کی خصوصیات؛

علماء تفسیر نے مکی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے ہادی النظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی، اس سلسلے میں بعض قواعد کلی ہیں اور بعض اکثری، قواعد کلیتہً یہ ہیں:-

۱- ہر وہ سورت جس میں لفظ ”کَلَّا“ (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ اپنے سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں، چنانچہ علامہ دیرینی کا شعر ہے ۵

وما نزلت کَلَّا، بیثوب فاعلمون ولقد نأت فی القرآن فی نصفه الا^ع

۲- ہر وہ سورت جس میں کوئی سجدے کی آیت آئی ہے مکی ہے۔ یہ اصول حنفیہ کے مسلک پر ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سورہ حج میں سجدہ نہیں ہے، شوافع کے نزدیک سورہ حج میں سجدہ ہے، اور وہ مدنی ہے، لہذا وہ اس قاعدے سے مستثنی ہوگی

۳- سورہ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ آیا ہو وہ مکی ہے،

۴- ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے،

۵- ہر وہ سورت جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے، بعض علماء نے اس قاعدے سے سورہ عنکبوت کو مستثنی کیا ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ سورہ عنکبوت بحیثیت عمومی تو مکی ہے، مگر جن آیات میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں،

اور سورتوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے،

۱- مکی سورتوں میں عموماً آیا آیتھا الناس (اے لوگو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا،

۵ ایضا، ص ۱۶۱ ج ۱،

۵ مناہل العرفان، ص ۱۹۲ ج ۱

یہ قاعدہ اتقان وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورہ حج مکی ہے لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہ و تابعین سے مروی ہے تو سورہ حج اس قاعدے سے مستثنی ہوگی۔ تقی

- اور مدنی سورتوں میں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کے الفاظ سے،
- ۲۔ مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات و سورتوں میں اور مفصل ہیں،
- ۳۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، چہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں،
- ۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلت پرستوں سے ہے، اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے،
- ۵۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پُرشکوہ ہے، اس میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور ذخیرۃ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتاً سادہ ہے،
- مکی اور مدنی سورتوں کے انداز اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بُت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح بُت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جو حق و جوق اسلام کے سامنے تلے آ رہے تھے، علی سطح پر بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا، اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا،

ہر منصف مزاج انسان حالات کی تدریج کی روشنی میں تشریحی مضامین اسلوب کے اس اختلاف کو باسانی سمجھ سکتا ہے، لیکن جن مستشرقین کے دل میں اسلام دشمنی کی آگ سلگتی ہی رہتی ہے، انھوں نے مکی اور مدنی اسلوب کے اس فرق سے بھی من گھڑت نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ بعض مستشرقین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، اسی لئے وہ حالات اور ماحول کے اختلاف سے مختلف اسلوب اختیار کرتا رہا، اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کا اسلوب گرد و پیش سے متاثر نہ ہوتا،

لیکن جس شخص کے دل میں بھی انصاف اور معقولیت کی ادنیٰ رفق موجود ہو وہ اس مُعاندا نہ اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے، علم بلاغت کی اصل رُوح یہ ہے کہ کلام اپنے مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہو، ہر قسم کے مخاطب کے سامنے اور ہر قسم کے ماحول میں ایک ہی انداز و اسلوب پر جے رہنا پرلے درجے کی بدبذاتی اور بلاغت کے بنیادی آداب تک سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس بدبذاتی کی توقع وہی شخص کر سکتا ہے، جس نے اعتراض برائے اعتراض کی قسم ہی کھا رکھی ہو،

نزدل کا وقت اور مقام،

آیات قرآنی میں مکی اور مدنی کی تقسیم کے علاوہ نزول کے مقام اور وقت کے لحاظ سے مفسرین نے کچھ اور قسمیں بھی بیان فرمائی ہیں، مثلاً حضری آیات اُن آیتوں کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں نازل ہوئیں، اور اکثر تشریحی آیات ایسی ہی ہیں، اور سفری آیات وہ ہیں جو سفر کی حالت میں نازل ہوئیں

۱۵ اس لغو اعتراض کی باقاعدہ علمی تردید کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے، تاہم جو صاحبان اس نوعیت کے اعتراضات اور ان کے مفصل جواب کے لئے شیخ زرقانی رح کی منہل العرفان میں صفحہ ۱۹۸ ج ۲۳۲ تا ۲۳۳ کا مطالعہ فرمائیں،

مَثَلًا إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا فَمَنْ فَرَحَ مَكَّةَ كَسَفَرٍ فِي أَرْضِي
 علامہ سیوطی نے اس قسم کی تقریباً چالیس آیتیں شمار کی ہیں اس کے علاوہ مندرجہ ذیل قسمیں بھی
 انھوں نے ہی بیان فرمائی ہیں :-

(۱) نہاری : یہ وہ آیات ہیں جو دن کے وقت نازل ہوئیں، بقول علامہ ابن حبیبؒ
 اکثر آیات اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں،

(۲) لیلی : یہ وہ آیات ہیں جو رات کے وقت نازل ہوتیں، مثلاً سورۃ آل عمران کی
 آخری آیات إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ آيَاتٍ
 لِلَّذِينَ الْأَلْبَابِ ہ رات کے وقت نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطی نے اس کی مزید
 ایک درجن مثالیں اتقان میں ذکر کی ہیں،

(۳) صیفی : یہ وہ آیات ہیں جو گرمی کے موسم میں نازل ہوتیں، مثلاً سورۃ نساء
 کی آخری آیت يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ، صبحِ اسلم میں حضرت
 عمرؓ کی روایت کے مطابق گرمی میں نازل ہوئی تھی، اور دوسری روایات سے یہ بھی ثابت
 ہے کہ یہ آیتیں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع
 کے موقع پر جنی آیات نازل ہوئیں وہ سب صیفی ہیں، مثلاً الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ
 دِينَكُمْ وغیرہ،

(۴) شستانی : یہ وہ آیات ہیں جو سردی کے موسم میں اتریں، مثلاً سورۃ نور
 کی آیات إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِآيَاتِنَا بِالْحَقِّ وَالْحَقَّ عَالِمِينَ حضرت عائشہؓ پر تمت لگانے
 والوں کی تردید کی گئی ہے، سردی کے موسم میں نازل ہوتی تھیں، جیسا کہ صبح بخاری میں
 خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اسی طرح غزوة خندق کے بارے میں سورۃ احزاب
 کی آیات بھی اسی قسم میں داخل ہیں، کیونکہ یہ غزوة بھی سردی کے موسم میں ہوا تھا،
 (۵) فراشی : یہ وہ آیات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت نازل

ہوئیں، جب آپ اپنے بستر پر تھے، چنانچہ آیت **وَإِنَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** (مانہ: ۱۰) اسی حالت میں نازل ہوئی، علامہ سیوطی نے اس کی دو مثالیں اور ذکر کی ہیں،

(۶) **نومی**: بعض حضرات نے آیات کی ایک قسم ”نومی“ بھی ذکر کی ہے، یعنی وہ آیات جو نیند کی حالت میں اتریں، اور اس کی مثال میں صحیح مسلم کی وہ روایت پیش کی ہے، جس میں حضرت انس فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ کو نیند کا ایک جھونکا آیا، پھر آپ نے بستم فرماتے ہوئے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ نے سورۃ **إِنَّا أَنْعَمْنَا عَلَى الْكَوْثَرِ** تلاوت فرمائی،

لیکن محقق بات یہ ہے کہ نیند کی حالت میں آپ پر کوئی آیت قرآنی نازل نہیں ہوئی، اور پر کی روایت میں جس کیفیت کو ”نیند کے جھونکے“ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لئے اصل حدیث میں ”اغفارة“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور امام رافعی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد نیند نہیں، بلکہ وہ مخصوص حالت ہے جو آپ پر نزول وحی کے وقت طاری ہو جایا کرتی تھی، اس لئے اس حدیث سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ نزول قرآن نیند میں بھی ہوا ہے، علامہ سیوطی نے بھی امام رافعی کی تائید کی ہے،

(۷) **سماوی**: یعنی وہ آیات جو معراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئیں، ان کے بارے میں صرف ایک صحیح مسلم کی روایت ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ بقرہ کی آخری آیات شب معراج میں سدرة المنتہی کے قریب نازل ہوئیں،

(۸) **فضائی**: علامہ ابن عسری نے ایک قسم ایسی بھی ذکر کی ہے جو نہ زمین پر نازل ہوئی نہ آسمان پر، ان کا کہنا ہے کہ سورۃ صافات کی تین آیتیں **وَمَا تَأْتِيهِ** **مَقَامٌ مَّعْلُومٌ** الخ اور سورۃ زخرف کی ایک آیت **وَأَسْأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ** **مَنْ أَرْسَلْنَا**، اسی قسم میں داخل ہیں، لیکن علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی

کوئی مسند نہیں مل سکی،

قرآن کریم کا تدریجی نزول؛

پچھلے اچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعتاً اور کبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تینیس سال میں اتارا گیا ہے، بعض اوقات جبرئیل امین علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت ... بلکہ آیت کا کوئی ایک جز لے کر بھی تشریف لے آئے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ عَلَّمَ اَدْبِي الضَّرَّاءِ (نسا: ۹۴) ہے، جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دوسری طرف پوری سورۃ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے،

بعض حضرات کو ابن عساکر کی ایک روایت سے یہ شبہ ہو گیا ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام ایک مرتبہ میں پانچ سے زائد آیتیں نہیں لاتے، لیکن علامہ سیوطی نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نازل تو اس سے زائد آیتیں بھی ہوتی ہیں، مثلاً واقعۃً افک میں بیک وقت دس آیتوں کا نزول صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن ہوتا یہ تھا کہ جبرئیل امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ پانچ آیتیں یاد کرایا کرتے تھے، جب پانچ آیتیں یاد ہو جاتیں تو مزید آیتیں سن کر یاد کرا دیتے تھے، چنانچہ امام بیہقی نے حضرت ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی پانچ پانچ آیتیں سیکھا کرو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے پانچ پانچ آیتیں ہی یاد کیا کرتے تھے، قرآن کریم کو ببارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آپ سے کیا تھا، کیونکہ ایک قصیدہ پورا کا پورا ایک وقت میں سننے کے عادی تھے، اور یہ تدریجی نزول ان کے لئے ایک

لہ تفسیر ابن کثیر، ص ۱۲۲ ج ۲

لہ اس پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہوا الاتقان ص ۲۴ ج ۱، النور السادس عشر، المسئلة الادلی

اچھی سی بات تھی، اس کے علاوہ فترآن سے پہلے تورات، زبور، اور انجیل تینوں ایک ہی مرتبہ نازل ہو گئی تھیں، ان میں یہ تدریج کا طریقہ نہیں تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً
كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا وَلَا يَأْتُوكَ
بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (الفرقان ۳۲ و ۳۳)

”اور کافروں نے کہا کہ آپ پر فترآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم اس کو رفتہ رفتہ پڑھ لے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے۔“

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فترآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس تدریجی نزول میں کئی حکمتیں تھیں:-

۱- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے ان پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی،

۲- اگر پورا فترآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً شروع ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت میں ملحوظ رہی ہے،

۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبرئیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلہ کو سہل بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویت قلب کا سبب بنتا تھا،

۴- قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات

سے متعلق ہے، اس لئے ان آیات کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کے غیبی خبریں بیان کرنے سے اُنس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی۔

ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب

یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا، بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق نزول کی ترتیب اُس سے مختلف تھی، ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ کا تبیین وحی کو ساتھ ہی یہ بتا دیتے تھے، کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لیا جائے، چنانچہ وہ آپؐ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی، ترتیب نزول کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور نہ صحابہؓ نے، اس لئے جب قرآن مکمل ہو گیا، تو لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ کونسی آیت کس ترتیب سے نازل ہوئی تھی؟ لہذا اب جزوی طور پر بعض سورتوں یا آیتوں کے بارے میں تو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ان کی ترتیب کیا تھی؟ لیکن پورے قرآن کی ترتیب نزول یقین کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی، علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں بعض روایات کی مدد سے سورتوں کی ترتیب نزول بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن درحقیقت ان

لہ التفسیر الکبیر للامام الرازی، ص ۳۳۶ ج ۶، المطبعة العامہ ۱۳۲۴ھ
 لہ الاتقان، نوع ۱۰ ص ۱۰۲، اندس کے ایک نامعلوم عالم کی لکھی کتاب المبانی فی نظم المعانی
 کا ایک مخطوط نسخہ آرٹھر مبیض نے "مقدمتان فی علوم القرآن" کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں بھی
 ترتیب نزول کی مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں (مقدمتان فی علوم القرآن، مرتبہ آرٹھر مبیض نے
 مکتبہ الخابزی مصر ۱۹۵۴ء ص ۱۶ تا ۱۷) مگر یہ روایات قابل اعتماد نہیں ہیں،

روایتوں سے یقینی طور پر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کونسی سورت کئی اور کونسی مدنی ہے؟ ترتیب نزول کی تفصیلات ان سے معلوم نہیں ہوتیں، ماضی قریب میں بعض مستشرقین نے بھی ترتیب نزول معین کرنے کی کوشش کی ہے، سب سے پہلے مشہور جرمن مستشرق فولڈیکے نے اس کام کا آغاز کیا، اور اس کے بعد یہ بہت سے مغربی مصنفین کی دلچسپی کا موضوع بنا رہا، ولیم میور نے بھی اس سلسلے میں ایک جداگانہ کوشش کی ہے، بلکہ جے ایم راڈویل نے قرآن کریم کا جو انگریزی ترجمہ شائع کیا، اس میں سورتوں کو معروف ترتیب سے ذکر کرنے کے بجائے فولڈیکے کی مروجہ تاریخی ترتیب سے ذکر کیا، بیسویں صدی کے آغاز میں ہارٹ وگ ہرشفیلڈ نے نہ صرف سورتوں بلکہ آیتوں تک کی تاریخی ترتیب معین کرنے کی کوشش کی، اس کے علاوہ رحیم بلاشیر نے اپنے فرانسیسی ترجمہ میں اس کام کا بیڑا اٹھایا، رچرڈ ڈیل نے بھی اس سلسلے میں مغربی دنیا میں کافی نام پیدا کیا، مستشرقین کی یہ کوششیں اب بھی جاری ہیں، اور شاید انہی سے متاثر ہو کر بعض مسلمانوں نے بھی ترتیب نزول کی تحقیق کرنی شروع کی ہے،

لیکن ہماری نظر میں یہ ساری کوششیں ایک ایسے کام میں اپنا وقت صرف

Noldeke, Theodor, Geschichte des Qorans, Gottingen (1860)

Muir, William, The Life of Mohammed

Rodwell, J. M., The Koran (translated) London, 1953

Hirschfold, Hartwig, New Researches into the composition and exegesis of the Qoran. (1902)

Blaichere, Regis, Coran traduction selon unessai de reclassement des sourates, Paris, 1947-51

Bell, Richard, Translation of The Qoran (1937-39)

مکہ یعقوب حسن: کشات الہدی، ص ۷۵، تا ۸۲ اور اشاعت مدراس سلسلہ ۱۲ھ

کرنے کے مرادف ہیں جس میں کبھی یقین کا میاابی حاصل نہیں ہو سکتی، مذکورہ بالا مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں وہ زیادہ تر متن کے بارے میں اُن کے ذاتی قیاسات پر مبنی ہیں اور چونکہ ہر شخص کے قیاسات دوسرے مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کی بیان کردہ ترتیبوں میں بھی فرق ہے، لہذا ہزار کوشش کے باوجود ان قیاسات سے کوئی خاص عملی فائدہ حاصل کرنا مشکل ہے،

دراصل مستشرقین کی ان کوششوں کے پیچھے ایک مخصوص ذہنیت کا رفاہاؤہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم ابھی تک غیر مرتب ہو، اس کی اصلی ترتیب وہ ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا، لیکن چونکہ نازل ہونے کے ساتھ اُسے کتابی شکل میں لکھنے کے بجائے متفرق چیزوں پر لکھا گیا اس لئے وہ ترتیب محفوظ نہ رہ سکی، راڈ ویل نے اپنے ترجمہ فتران کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب متفرق تحریریں جمع کیں تو وہ انھیں جس ترتیب سے ساتھ ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھے چلے گئے، لہذا اس میں کسی تاریخی یا معنوی ترتیب کا لحاظ نہیں رہ سکا، اب قرآن کریم کی موجودہ ترتیب اُن کے خیال میں (معاذ اللہ) ایک نقص ہے جسے وہ بزعم خود اپنی "تحقیق" سے دور کرنا چاہتے ہیں، !!

حالانکہ واقعات کی یہ تصویر نہ صرف خیالی بلکہ واضح دلائل کے بالکل خلاف ہے، اس لئے کہ آیات قرآنی کی ترتیب باتفاق وحی سے ثابت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کا تبین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی، اور صحابہ نے قرآن کریم کو اسی ترتیب سے یاد کیا تھا، جو حضور نے بتائی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت زید نے کو جس ترتیب سے آیتیں

ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے گئے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ قرآن میں سب سے آخری آیت **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا** ہو چاہئے تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ کو یہ آیت سب سے آخر میں ملی، حالانکہ یہ آیت سورہ احزاب میں درج ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت زیدؓ اور ان کے رفقاء کے سامنے جب کوئی آیت لائی جاتی تھی تو وہ اس کو اسی مقام پر لکھتے تھے جس مقام پر حضورؐ نے بتایا تھا، البتہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اہل علم کی دو رائیں ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ بھی بذریعہ وحی بتائی گئی ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے معین کیا ہے، زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض سورتوں کی ترتیب تو بذریعہ وحی ہی بتادی گئی تھی، البتہ بعض سورتوں مثلاً سورہ توبہ کے بارے میں کوئی صریح ہدایت موجود نہ تھی، اس لئے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے سورہ انفال کے بعد رکھا ہے؛

اسباب نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی کے سوال کے جواب میں ہوا جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں "سبب نزول" یا "مشان نزول" کہلاتا ہے،

مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ہے:

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ ۚ وَلَا مِمَّنْ شُكِرَتْ مُؤْمِنَةٌ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ ۚ

مُشْرِكَةٌ تِلْكَ آيَةٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَىٰ الظَّالِمِينَ (بقرہ: ۲۲۱)

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بلاشبہ ایک مومن کنیز ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ مشرک تمہیں پسند ہو"

لہ تفصیل کیلئے دیکھئے فتح الباری، ص ۳۲ تا ۳۵ ج ۹، باب تأیید القرآن،

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرشد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ کسی کام سے حضرت مرشدؓ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرشدؓ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لا کر حضرت مرشدؓ نے حضورؐ سے نکاح کی اجازت طلب کی، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی،

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا سبب نزول "یا شان نزول" ہے،

شان نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد؛

بعض ایسے لوگوں نے جنہیں علم میں چٹکی اور رسوخ حاصل نہیں ہو، اسباب نزول کی اہمیت سے انکار کرتے ہوتے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم بذات خود اتنا واضح ہے کہ اس کی تشریح کے لئے اسباب نزول کو جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ خیال بالکل باطل اور غلط ہے، اسباب نزول کا علم تفسیر قرآن کے لئے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کے فوائد بے شمار ہیں، جن میں سے چند یہاں بیان کئے جاتے ہیں؛

۱۔ علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ اسباب نزول جاننے کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے احکام کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں اور کیوں نازل فرمایا؟ مثلاً سورۃ نساء میں ارشاد ہے :-

۱۔ الواحدیؒ؛ اسباب النزول، ص ۳۸، مصطفیٰ البابی، مصر ۱۳۷۹ھ

۲۔ زرکشیؒ؛ البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۲ ج ۱ عیسیٰ البابی ۱۳۷۹ھ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَأُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ ،
 اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشتریں ہو،
 اگر شانِ نزول کی روایات سامنے نہ ہوں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے
 کہ جب شراب از روئے قرآن بالکل حرام ہے تو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ
 نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، اس سوال کا جواب صرف شانِ نزول ہی سے
 مل سکتا ہے، چنانچہ اس کے سبب نزول میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ شراب کے
 حرام ہونے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے کچھ صحابہؓ کو کھانے پر
 مدعو کیا، وہاں کھانے کے بعد شراب پی گئی، اسی حالت میں نماز کا وقت آ گیا، تو ایک
 صحابی نے امامت کی، اور اس میں نشے کی وجہ سے قرآنی آیات کی تلاوت میں غلطی کر گئی،
 اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﷺ

۲۔ بسا اوقات سببِ نزول کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، اور
 اگر سببِ نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ سکتا ہے، یہ بات
 چند مثالوں سے واضح ہوگی :-

سورة بقرہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :-
 وَبِاللَّهِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ، فَايَسْتَأْذِنُ لَوْ افْتَحَ وَجْهَ اللّٰهِ
 "اور مشرق و مغرب اللہ ہی کی ہیں پس جدھر بھی تم رخ کرو ادھر
 ہی اللہ کا رخ ہے"۔

اگر اس آیت کا شانِ نزول پیش نظر نہ ہو تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز
 میں کسی خاص جہت کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، مشرق و مغرب سب اللہ کی

لہ النساء : ۴۳ ،

۱۶ تفسیر ابن کثیر ، ص ۵۰۰ ، ج ۱ ، مطبعتہ المصطفیٰ محمدیہ ۱۳۵۶ھ

۱۷ البقرہ : ۱۱۵ ،

ملکیت میں ہیں اور وہ ہر سمت میں موجود ہے، اس لئے جس طرف بھی رخ کر لیا جائے نماز ہو جائے گی، حالانکہ یہ مفہوم بدیہی طور پر غلط ہے، خود قرآن کریم ہی نے دوسرے مقام پر کعبہ کی طرف رخ کرنے کو ضروری قرار دیا ہے،

یہ عقیدہ صرف شانِ نزول کو دیکھ کر ہی حل ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہوا تو یہودیوں نے اعتراض کیا کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سمت اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اور اللہ ہر طرف موجود ہے، لہذا وہ جس طرف بھی رخ کرنے کا حکم دیدے، اُدھر رخ کرنا واجب ہے، اس میں قیاسات کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں،

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے :-

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ يَدِينُ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِحْنًا فِيمَا
كَلَعُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا،

جو لوگ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں ان پر اس چیمیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھلتے پیتے ہوں جبکہ وہ لوگ اللہ سے ڈرتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں!

اگر اس آیت کے صرف ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی بھی چیز کا کھانا پینا حرام نہیں، اگر دل میں ایمان اور خدا کا خوف ہو اور عمل نیک ہوں تو انسان جو چاہے کھاپی سکتا ہے، اور چونکہ یہ آیات تحریم شراب کے متصل بعد آئی ہیں، اس لئے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس آیت نے ایمان دار اور نیک لوگوں کے لئے (معاذ اللہ) شراب کی بھی اجازت دیدی ہے، اور یہ صرف شبہ اور احتمال نہیں جو بعض صحابہ تک کو اس آیت سے غلط فہمی ہو گئی تھی، اور انہوں نے حضرت عمرؓ

کے سامنے اس آیت سے استدلال کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ شراب پینے والا اگر ماضی میں نکو کار رہا ہو اور اس کی عام زندگی نیکیوں میں گزری ہو تو اس پر حد شرعی سزا نہیں ہوگی بعد میں حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے شان نزول ہی کے حوالہ سے اُن کی اس غلط فہمی کو رفع کیا،

درحقیقت آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب اور قمار کی حرمت نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے یہ سوال کیا کہ جو صحابہؓ حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے دفات پاگؤ اور اپنی زندگی میں شراب نوشی اور قمار بازی کے مرتکب ہوئے اُن کا کیا انجام ہوگا؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جن مومنوں نے حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب پی یا قمار کمال کھایا اُن پر کوئی عذاب نہیں ہوگا، بشرطیکہ وہ مومن ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کے پابند رہے ہوں،

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے، سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:-

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَبَّ

الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا، ۱۷

”بلاشبہ صفا اور مرہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو کوئی

بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ وہ

ان دونوں (صفا اور مرہ) میں چکر لگائے“

اس آیت کے یہ الفاظ کہ ”اس پر کچھ گناہ نہیں ہے“ ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج یا عمرہ کے دوران صفا اور مرہ کے درمیان سعی کرنا صرف جائز ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں، چنانچہ حضرت عروہ بن زبیرؓ اسی غلط فہمی میں تھے، حضرت عائشہؓ نے انہیں بتایا کہ درحقیقت زمانہ جاہلیت سے ان پہاڑیوں

۱۷ الفطی: الجامع لاحکام القرآن، ص ۲۹۷، ج ۶، قاہرہ ۱۳۸۷ھ

۱۸ ایضاً ص ۲۹۴، ج ۶، ۱۷، البقرہ، ص ۱۵۸

پر دو بت رکھے ہوتے تھے، ایک کا نام اس آت تھا، دوسرے کا نام لکڑہ، اس لئے صحابہ کرامؓ کو یہ شبہ ہوا کہ کہیں ان بتوں کی وجہ سے سعی کرنا ناجائز نہ ہو گیا ہو، ان کا یہ اشکال رفع کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی،

یہ چند مثالیں محض نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ورنہ ایسی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بہت سی آیتوں کا صحیح مفہوم سبب علم نزول کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا،

۳۔ قرآن کریم بسا اوقات ایسے الفاظ استعمال فرماتا ہے جن کا شان نزول سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اور اگر ان کا صحیح پس منظر معلوم نہ ہو تو وہ الفاظ (معاذ اللہ) بے فائدہ اور بعض اوقات بے جوڑ معلوم ہونے لگتے ہیں، جس سے قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت حریف آتا ہے،

مثلاً سورہ طلاق میں ارشاد ہے:

وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ
فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةَ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِيضْنَ،

”اور تمھاری وہ عورتیں جو حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور جن لڑکیوں کو ابھی حیض نہیں آیا ان کی بھی“

اس آیت میں یہ الفاظ کہ ”اگر تم کو شک ہو“ ان کا بظاہر کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ بعض اہل ظاہر نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ اگر سب رسیدہ عورت کو جس کا حیض بند ہو چکا ہو صل کے بارے میں کوئی شک نہ ہو تو اس پر کوئی عدت واجب نہیں ہے؟

۱۔ مناہل العرفان، ص ۱۰۲، ج ۱، بحوالہ صحیح بخاری

۲۔ الاقنان، ص ۲۰، ج ۱،

۳۔ الطلاق: ۴

لیکن سبب نزول ان الفاظ کی وجہ بتاتا ہے، حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب سورۃ نساء میں عورتوں کی عدت بیان کی گئی تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ: کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کی عدت قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئی، ایک تو چھوٹی بیچیاں جنہیں حیض نہیں آیا، دوسرے وہ سن رسیدہ عورتیں جن کا حیض بند ہو گیا، اور تیسرے حاملہ عورتیں، اسپریت نازل ہوئی، اور اس میں تینوں قسموں کا حکم بیان کر دیا گیا ہے

یا مثلاً سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:-

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَمْ فَاذْكُرُوا لِلّٰهِ كُنُوزَكُمْ
اِيَّاءَكُمْ،

”پس جب تم افعال حج پورے کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے اپنے آباء کو یاد کرتے ہو،“

اگر سبب نزول سامنے نہ ہو تو اس آیت کا یہ حصہ کہ ”جیسے اپنے آباء کو یاد کرتے ہو“ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس خاص مقام پر اللہ کی یاد کو آباء و اجداد کی یاد سے تشبیہ دینے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن سبب نزول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بات یہ ہے کہ یہاں مزدلفہ کے وقوف کا ذکر ہو رہا ہے، اور مشرکین عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ ارکان حج سے فارغ ہونے کے بعد یہاں اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارنامے بیان کیا کرتے تھے، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اب یہاں باپ دادوں کی بیخیاں بگھارنے کے بجائے اللہ کا ذکر کیا کرو،

۴۔ قرآن کریم میں ایسے مقامات بھی تھوڑے نہیں ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے، اور جب تک واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا مطلب سمجھا جا

نہیں جاسکتا، مثلاً ارشاد ہے:-

وَمَا هِيَ إِلَّا ذَرِيَّةٌ مِّن مَّن لَّدُنَّا تَكْفُرُ
 ”اور جس وقت آپ نے (خاک کی مٹھی) پھینکی تو وہ آپ نے
 نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی“

دراصل اس آیت میں عنبروۃ بدر کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس میں آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے نرغے کے وقت خاک کی ایک مٹھی اُن کی طرف پھینکی تھی،
 اور اس کے بعد نرغہ ٹوٹ گیا تھا، لیکن غور فرمائیے کہ اگر یہ سبب نزول ذہن میں نہ ہو
 تو آیت کا مطلب کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

یہاں اسباب نزول کے تمام فوائد بیان کرنے مقصود نہیں لیکن مندرجہ بالا
 مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر میں اسباب
 نزول کی کیا اہمیت ہے، اسی وجہ سے امام ہمدانی فرماتے ہیں:-
 ”جب تک آیت کا سبب نزول اور متعلقہ واقعہ معلوم نہ ہو، اس وقت تک
 آیت کا مفہوم بیان کرنا ممکن نہیں ہے“

لہذا جن لوگوں نے تفسیر قرآن کے معاملہ میں اسباب نزول کی اہمیت سے
 انکار کیا ہے وہ یا تو ناواقف ہیں یا اسباب نزول سے آزاد ہو کر قرآن کے مضامین کو
 اپنا من مانا مفہوم پہنانے کے لئے ایسا کرتے ہیں،
 اسباب نزول اور شاہ ولی اللہؒ؛

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب
 ”الفوز الکبیر“ میں اسباب نزول پر جو محققانہ بحث کی ہے بعض لوگ اُسے پوری طرح
 سمجھ نہیں سکے، اس لئے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے، کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ
 نے تفسیر میں اسباب نزول کو اہمیت نہیں دی، یا اس کی اہمیت کو کم کر دیا ہے لیکن

درحقیقت یہ خیال حضرت شاہ صاحب کا مطلب نہ سمجھے گا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جمہور امت کی طرح وہ بھی اسباب نزول کے علم کو تفسیر کے لئے لازمی شرط قرار دیتے ہیں، لیکن انھوں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے:-

وَيَذُكُرُ الْمَحْدُوثِينَ فِي ذَوِيلِ آيَاتِ الْقُرْآنِ كَثِيرًا مِنَ الْأَمْثِيَاءِ
لَيْتَ مِنْ قَسَمِ سَبَبِ النُّزُولِ فِي الْحَقِيقَةِ مِثْلَ اسْتِشْهَادِ الصَّغِيَّةِ
فِي مَنَظَرِ أَتَمِّ بَابِ أَوَّلِ آيَاتِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آيَةَ لِاسْتِشْهَادِ
فِي كَلَامِهِ الشَّرِيفِ وَأَوْرَادِ حَدِيثِ وَافِقِ الْآيَةِ فِي أَصْلِ الْغَرَضِ
أَوْ تَعْيِينِ مَوْضِعِ النُّزُولِ أَوْ تَعْيِينِ أَسْمَاءِ الْمَذْكُورِينَ بِطَرِيقِ
الِإِيهَامِ أَوْ بِطَرِيقِ التَّلْفِظِ بِكَلِمَةٍ قَرَأْنِيَّةٍ أَوْ قَضَلِ سُورِ وَأَيَّاتِ
مِنَ الْقُرْآنِ أَوْ صُورَةٍ أَمْثَالَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَمْرٍ
أَوْ لَمَّا الْقُرْآنِ وَنَحْوِ ذَلِكَ، وَلَيْسَ شَيْءٌ مِنْ هَذَا فِي الْحَقِيقَةِ مِنْ
أَسْبَابِ النُّزُولِ ۱۱

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت کے تحت بعض اوقات
دسیوں روایات لکھی ہوتی ہیں، یہ تمام روایات اسباب نزول سے متعلق نہیں ہوتیں
بلکہ اس میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہو جاتی ہیں:-

- ۱- بعض مرتبہ کسی علمی مباحثہ میں کسی صحابی نے وہ آیت بطور دلیل پیش کر دی مفسرین
یہ واقعہ اس آیت کے تحت ادنیٰ مناسبت سے ذکر کر دیتے ہیں،
- ۲- بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر اس آیت سے استشہاد
فرمایا مفسرین اُسے بھی آیت کے تحت نقل کر دیتے ہیں،
- ۳- جو بات کسی آیت میں بیان کی گئی ہے بعض مرتبہ وہی بات کسی حدیث میں
بھی آپ نے ارشاد فرمائی، تفسیر کی کتابوں میں وہ حدیث بھی اس آیت کے

تحت روایت کر دی جاتی ہے ،

- ۴۔ بعض مرتبہ مفسرین کوئی روایت محض یہ بتانے کے لئے نقل کرتے ہیں کہ آیت کس مقام پر نازل ہوئی ، یہ روایت بھی تفسیر کے ذیل میں درج ہو جاتی ہے ،
- ۵۔ بعض دفعہ قرآن کریم کچھ لوگوں کا ذکر مبہم طور پر فرماتا ہے ، اور ان کا نام ذکر نہیں کرتا ، مفسرین روایتوں کے ذریعہ ان لوگوں کے نام متعین کر دیتے ہیں ،
- ۶۔ بعض مرتبہ کسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے فلاں لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے ؟ تفسیر کی کتابوں میں ایسی روایات بھی درج ہوتی ہیں ،
- ۷۔ بعض احادیث اور آیات میں قرآن کریم کی مختلف سورتوں یا آیتوں کے فضائل بیان ہوئے ہیں ، مفسرین ان روایات کو بھی متعلقہ مقامات پر نقل کر دیتے ہیں ،

- ۸۔ بعض مقامات پر ایسی احادیث بھی تفسیر کے ذیل میں منقول ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے اس حکم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح عمل فرمایا ؟

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایات نہ سبب نزول کی تعریف میں داخل ہیں اور نہ مفسر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی تمام روایات سے پوری طرح واقف ہو ،

البتہ جو روایات واقعہ آیت کا سبب نزول ہیں ان کا جاننا مفسر کے لئے نہایت ضروری ہے ، اور اس کے بغیر علم تفسیر میں دخل دینا جائز نہیں ، چنانچہ خود حضرت شاہ صاحب آگے لکھتے ہیں :-

وانما شرط المفسر احوال ، الاول ما تعرض به الايات من القصص فلا يتيسر فهم الايماء بتلك الايات الالهامية تلك القصص ، والثاني ما يخصه العالم من القصة او مثل ذلك من وجوه صرف الكلام عن الظاهر فلا يتيسر فهم

المقصود من الآيات بدن ونهاہ۔

”البتہ مفسر کے لئے دو باتوں کا جاتا لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، ایک تو وہ واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے، اور جب تک وہ قفے معلوم نہ ہوں آیات کے اشاروں کو سمجھنا آسان نہیں، دوسرے کسی قصہ وغیرہ میں بعض اوقات الفاظ عام ہوتے ہیں، لیکن شان نزول سے اس میں تخصیص پیدا ہوتی ہے، یا کلام کا ظاہری مفہوم کچھ ہوتا ہے اور سبب نزول کوئی دوسرا مفہوم متعین کرتا ہے، اس جیسی روایات کا علم حاصل کئے بغیر آیات قرآنی کو سمجھنا مشکل ہے؛

سبب نزول اور احکام کا عموم و خصوص؛

کسی سبب نزول کے تحت قرآن کریم کی جو آیات نازل ہوئیں، وہ اپنے عموم و خصوص کے لحاظ سے پچار قسم کی ہیں:-

۱- وہ آیتیں جن میں کسی خاص شخص کا نام لے کر یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ آیت کا مضمون اسی کے حق میں ہے، ایسی آیتوں کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ ان کا مضمون صرف اسی متعین شخص کے بارے میں قرار دیا جاتا ہے گا، اور وہ دوسروں کو شامل نہیں ہوگا، مثلاً

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ

”ابو لہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوں“

اس آیت کا شان نزول معروف ہے، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر تمام قریش کے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ فرمائی تو اس پر ابو لہب نے کہا تھا:-

تَبَّ أَفْكَ، أَلِهَذَا دَعْوَتَا؟

”تمہارے لئے ہلاکت ہو کیا تم نے یہی سی لئے بلایا تھا؟“

بہر حال باوجودیکہ حضرت ابو بکرؓ کا یہاں نام نہیں لیا گیا، لیکن جمہور مفسرین نے آیت کو انہی کے حق میں خاص قرار دیا ہے، کیونکہ تخصیص کی دُور دلیلیں موجود ہیں (ایک یہ کہ ”الاتقی“ کا لفظ (الف لام عہد کے ساتھ) صرف ایک ہی شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے، دوسرے روایات حدیث نے اُن کی تعیین کر دی ہے، لہذا اگر کوئی اور شخص بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں حشر کرنے لگے تو وہ اس کے لئے کتنا ہی باعث اجر کیوں نہ ہو لیکن آیت بالا کا مصداق ہونے کی فضیلت اسے حاصل نہیں ہو سکتی یہ

۳۔ تیسری قسم میں وہ آیتیں آتی ہیں جو نازل تو کسی خاص واقعہ میں ہوئی تھیں لیکن الفاظ عام ہیں، آیت کے صریح الفاظ یا اور کسی خارجی دلیل سے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے، کہ آیت کا حکم اس واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس نوعیت کے ہر واقعہ کا یہی حکم ہے، اس قسم کے بائے میں بھی تمام اہل علم متفق ہیں کہ اس صورت میں آیت کا حکم اس کے الفاظ کے تابع ہو کر عام رہوگا، صرف سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ خاص نہیں ہوگا، مثلاً سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیات کے بائے میں ثابت ہے کہ وہ حضرت خولہؓ کے بائے میں نازل ہوئی تھیں، جن کے شوہر نے اُن سے یہ کہہ دیا تھا کہ اَنْتِ عَلٰی كَقَدْرِ اُحْتٰی (تم مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہو) لیکن آیت میں جن الفاظ کے ذریعہ حکم بیان کیا گیا وہ اس بات کی صراحت کر رہے ہیں کہ یہ حکم صرف خولہؓ کے شوہر کے لئے نہیں، بلکہ تمام ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی بیوی سے ظہار کر لیں، (یعنی مذکورہ بالا الفاظ کہیں،) (ایسے تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے سے قبل ایک غلام آزاد کریں، یا سناٹھ رزنے رکھیں یا سناٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں)

۴۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ آیت کسی خاص واقعہ کے تحت نازل ہوئی، لیکن الفاظ

عام استعمال کئے گئے، اور آیت یا کسی خارجی دلیل سے یہ صراحت معلوم نہیں ہوتی کہ آیت کا حکم یا مضمون صرف اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے، یا اس نوعیت کے ہر واقعہ کے لئے عام ہے، اس صورت میں اہل علم کا تھوڑا سا اختلاف رہا ہے، بعض حضرات کا کہنا یہ تھا کہ اس صورت میں آیت کو صرف سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ مخصوص رکھا جائے لیکن جمہور علماء و فقہاء کی رائے اس کے برخلاف یہی ہے کہ مذکورہ شکل میں سبب نزول کے خاص واقعہ کے بجائے الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا، اور آیت کے الفاظ جس صورت کو شامل ہوں ان کا حکم بھی ان سب پر نافذ کیا جائے گا۔ اس قاعدہ کے لئے علماء اصول فقہ و تفسیر میں یہ جملہ مشہور ہے کہ :-

الْعَبْرَةُ بِالْعُمُومِ اللَّفْظِ لَا لِلْمَخْصُوصِ لِسَبَبِ

اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ سبب نزول کے خاص واقعہ کا

لیکن درحقیقت یہ اختلاف نظر باقی نوعیت کا ہے، عملاً اس سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا، کیونکہ جو حضرات آیات قرآنی کو ان کے سبب نزول کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں وہ بھی عملاً آیت کا حکم اُس نوعیت کے دوسرے واقعات میں جاری کر دیتے ہیں، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک تو اس حکم کا ماخذ وہی آیت ہوتی ہے، اور یہ حضرات اس کا ماخذ کسی دوسری دلیل شرعی مثلاً حدیث اجماع یا قیاس وغیرہ کو قرار دیتے ہیں،

وضاحت کے لئے ایک مثال پر غور فرمائیے، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے :-

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ

اور اگر (قرض دار) تنگ دست ہو تو اسے کشادگی تک مہلت دیدو

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بنو عمر و بن عمر کا کچھ قرض بنو مقیہہ پر واجب تھا، جب سود کی حرمت نازل ہوئی تو بنو عمر نے اپنے مقروض قبیلے سے کہا کہ ہم سود تو چھوڑتے ہیں لیکن اصل قرضہ واپس کرو، بنو مقیہہ نے کہا کہ اس وقت ہمارا ہاتھ تنگ ہے، اس لئے ہمیں کچھ مہلت دیدو، بنو عمر نے مہلت دینے سے انکار کیا تو اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔^۱

اب آیت کا یہ حکم تو سب کے نزدیک عام ہے، ہر قرص خواہ کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ مفروض کو تنگ دست دیکھے تو اسے ہملت دیدے، لیکن فرق اتنا ہے کہ جبہور کے نزدیک یہ عام حکم اسی آیت سے ثابت ہوا ہے، اور جو لوگ آیت کو سبب نزول کے سبب مخصوص مانتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں، کہ آیت کا حکم تو صرف بنو عمر کے لئے تھا، لیکن دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ حکم ان احادیث سے ثابت ہوا ہے جس میں معترضوں کو ہملت دینے کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں،

اس سے واضح ہے کہ اس اختلاف کا عملی طور پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا^۲

سبب نزول اور اختلاف روایات ؛

اسباب نزول کے سلسلے میں تفسیر کے دوران ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی آیت کے سبب نزول میں کئی کئی مختلف روایتیں ملتی ہیں، اور جو شخص تفسیر کے اصول سے واقف نہ ہو وہ الجھن اور طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کو یہاں اس اختلاف روایت کی حقیقت سمجھ لینی ضروری ہے،

اصول تفسیر اور اصول فقہ کے علماء نے اس سلسلے میں بڑے کارآمد قواعد بیان فرمائے ہیں، یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:-

۱- صحابہؓ اور تابعینؒ کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر میں یہ الفاظ استعمال فرماتے ہیں کہ نزلت الایۃ فی کذا (یہ آیت فلاں مسئلہ یا معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی) ان الفاظ سے بظاہر یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ آیت کا سبب نزول بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ ان الفاظ سے ان کا مقصد ہمیشہ سبب نزول بیان کرنا نہیں ہوتا

۱۔ اسباب النزول للواحدی، ص ۱۰۸

۲۔ یہاں اس مسئلہ کا نہایت مختصر خلاصہ پیش کیا گیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، البرہان

لنزیر کشی، ص ۲۴، ج ۱، والاتقان، ص ۳۰، ج ۱، و المناہل العرفان، ص ۱۸، ج ۱،

بلکہ بسا اوقات اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ یا معاملہ آیت کے حکم کے تحت داخل ہے، مثلاً سورۃ نسا میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا یہ قول نقل فرمایا ہے:-
 وَلَا مَرَّةً لَهُمْ فَلْيَعْبُدُونِ خَلْقَ اللَّهِ،
 ”اور میں ان (انسانوں) کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق
 کو بدل ڈالیں گے“ (النساء: ۱۱۸)

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عکرمہؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ یہ آیت اختصار (خصیتیں نکلوادینے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد رسالت میں کسی نے خصیتیں نکلوادیتے تھے، اور یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اختصار کا عمل بھی اُنہی شیطانی افعال میں داخل ہے جنہیں شیطان نے اللہ کی تخلیق بدل ڈالنے سے تعبیر کیا ہے، ورنہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی تخلیق کو بدل دینا، اختصار میں منحصر ہے بلکہ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، جن کی تفصیل کتب تفسیر میں موجود ہے، صحابہؓ و تابعینؓ کا یہ اسلوب بیان معلوم ہونے سے شان نزول کے باب میں دو قاعدے واضح ہوتے ہیں:-

دالفت) ایک قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو مختلف روایتیں ہوں، دونوں میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہوں کہ نزلت الایۃ فی کذا (یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی) لیکن دونوں نے الگ الگ معاملات ذکر کئے ہوں تو درحقیقت دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کا مقصد بھی یہ نہیں ہوتا کہ یہ معاملہ آیت کا سبب نزول ہے، بلکہ منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ آیت کے مفہوم اور حکم میں داخل ہے

۱۷ ابن تیمیہ: مقدمۃ فی اصول التفسیر، ص ۹، المكتبة العلییة لاہور ۱۳۸۵ھ والالتقان

۱۸ السیوطی: الدر المنثور، ص ۲۲۳ ج ۲،

یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، باری تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

تَتَجَافَىٰ جُنُوبَهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ
 ”اُن کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں“

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اُن صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی جو مغرب اور عشاء کے درمیان نفلیں پڑھتے رہتے تھے، ایک اور روایت میں انہی سے مروی ہے کہ یہ آیت اُن حضرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نماز عشاء کے انتظار میں جاگتے رہتے تھے، اور بعض دو سکر صحابہؓ اسے تہجد گزار حضرات کے بارے میں قرار دیتے ہیں، اب بظاہر یہ اختلاف شان نزول کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ آیت کے مختلف مصداق ہیں، اور یہ تمام نیک اعمال آیت کے مفہوم میں داخل ہیں،

(ب) دوسرا قاعدہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو روایتیں ہوں، ایک میں نزلت الایۃ فی کذا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں اور دوسری میں صراحت کسی واقعہ کو آیت کا سبب نزول قرار دیا گیا ہو، تو اس دوسری روایت پر اعتماد کیا جائے گا، اور پہلی روایت چونکہ شان نزول کے مفہوم میں صریح نہیں ہے اس لئے اسے راوی کے اپنے اجتہاد و استنباط پر محمول کیا جائے گا، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

رَفَسَا۟ۤ اَوْ كَمْ حَزَبًا لَّكُمْ فَاَلَاۤ اَحْرَثَكُمْ اَنۡیۡ سِغۡتُمْ

تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتی میں آؤ جہاں

چاہو“ (البقرہ: ۲۲۳)

۱۶: الم سجدہ: ۱۶،

۱۷: ابن جریر: تفسیر جامع البیان، ص ۵۸۹، ج ۲۱، یمنیہ، مصر،

اس آیت کے بارے میں امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ
 أَنْزَلَتْ فِي آيَاتِنَا النِّسَاءَ فِي أَدْبَارِهِنَّ ۗ رِيَهُ آيَاتٍ عَوْرَتُونَ كَمَا تَهْتَكُنَّ فِي مَسْجِدِنَا
 کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے) لیکن حضرت جابرؓ اور حضرت عبدالقادر بن عباسؓ
 وغیرہ اس کا سبب نزول صراحتاً یہ بتاتے ہیں کہ یہودیوں کا خیال یہ تھا کہ اگر مباشرت
 پیچھے کی جانب سے اگلے ہی حصّہ میں کی جائے تو اولاد بھینگی پیدا ہوتی ہے، اس کی تردید
 کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے یہ واضح کر دیا کہ مباشرت کی جگہ تو ایک ہی ہے،
 (یعنی اگلا حصّہ جس سے اولاد پیدا ہو سکے، لیکن اس کے لئے راستہ کوئی بھی اختیار
 کیا جاسکتا ہے) ۱

ان دونوں روایتوں میں حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت چونکہ
 مفصل اور صریح ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی، اور حضرت ابن عمرؓ کے قول کو ان کا
 استنباط قرار دیا جائے گا۔ اور درحقیقت ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پشت میں صحبت
 کرنا اس آیت کی رُو سے جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ
 لواطت کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، (کیونکہ اس میں عورت کو کھینتی یعنی پیدائش
 اولاد کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور وہ لواطت میں ممکن نہیں)۔

۲۔ سبب نزول متعین کرنے کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر ایک روایت
 صحیح سند کے ساتھ آئی ہو اور دوسری ضعیف یا مجرد سند کے ساتھ تو صحیح روایت
 کو اختیار کر لیا جائے گا اور ضعیف کو ترک کر دیا جائے گا، مثلاً سورہ ضحیٰ کی ابتدائی
 آیات ہیں:-

وَالضُّحَىٰ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۗ مَا وَدَّعَكَ
 رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۚ

۱۔ اسباب النزول للواحدی ص ۴۰ و ۴۱

۲۔ الاتقان، ص ۳۲ ج ۱

۳۔ مناهل العرفان، ص ۱۰۸ ج ۱

۴۔ الاتقان، ص ۳۲ ج ۱

تسم وقتِ چاشت کی اور رات کی جب وہ چھا جائے کہ آپ کے
پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ خفا ہوا ہے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں بخاری، مسلم نے حضرت جندبؓ کی یہ روایت
ذکر کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی تکلیف کی وجہ سے ایک یا دو راتیں
(تہجد کی) نماز نہ پڑھ سکے، اس پر ایک کافر عورت نے یہ طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ
تمہارے (معاذ اللہ) شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں،
دوسری طرف طبرانی، اور ابن ابی شیبہ نے حفص بن میسرہ کی نانی خولہؓ سے
(جو حضورؐ کی خادمہ تھیں) یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک گتے کا پلا حضورؐ
کے گھر میں آکر چار پائی کے نیچے بیٹھ گیا، اور وہیں اُسے موت آگئی، اس واقعہ کے
بعد چار دن تک آپؐ پر وحی نازل نہ ہوئی، آپؐ نے مجھ سے پوچھا کہ رسول اللہؐ کے
گھر میں ایسی کیا بات ہوگئی ہے جو تیرے پاس نہیں آ رہی ہے، میں نے دل میں
کہا کہ مجھے گھر میں جھاڑ پونچھ کرنی چاہئے، چنانچہ میں نے جھاڑ و چار پائی کے نیچے مار کر
صفائی کی تو پلا نکل آیا، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں،

لیکن یہ دوسری روایت سنداً صحیح نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے
فرمایا کہ اس کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں، لہذا قابلِ اعتماد شانِ نزول وہی ہے
جو صحیح بخاری میں مروی ہے،

۳۔ بعض مرتبہ شانِ نزول کی دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں،
لیکن کسی ایک روایت کے حق میں کوئی وجہ ترجیح پائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ ایک کی
سند دوسری کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہے، یا ایک کا راوی ایسا ہے جو واقعہ
کے وقت موجود تھا اور دوسری روایت کا راوی واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا،
ایسی صورت میں اُس روایت کو اختیار کیا جائے گا جس کے حق میں وجہ ترجیح موجود ہے۔

اس کی مثال سورہ اسرار کی یہ آیت ہے :-

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمُرُوحِ قُلِ الْمُرُوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا
أُوتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

”یہ آپ سے رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ رُوح میرے پروردگار کے امر سے ہے، اور تمہیں نہیں دیا گیا علم کا حصہ مگر تھوڑا“

اس آیت کے شان نزول میں ایک روایت تو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا اور آپؐ کھجور کی ایک شاخ کا سہارا لے کر چل رہے تھے، اتنے میں آپ کا گذر کچھ یہودیوں کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ ان (حصنوں) سے کچھ سوالات کرنے جاہٹیں، چنانچہ انہوں نے آکر آپ سے کہا کہ: ہمیں رُوح کے بارے میں بتائیے، اس پر آپ رک گئے اور تھوڑی دیر بعد آپ نے سر اقدس اٹھایا، میں سمجھ گیا، کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر آپ نے فرمایا قُلِ الْمُرُوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي الخ
دوسری روایت امام ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ قریش مکہ نے یہودیوں سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم ان صاحبِ حصنوں (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھ سکیں، اس پر یہودیوں نے کہا کہ ان سے رُوح کے بارے میں سوال کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا، سند کے اعتبار سے بھی دونوں روایتیں صحیح ہیں، لیکن پہلی روایت کے حق میں یہ وجہ ترجیح موجود ہے کہ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس واقعہ کے وقت خود موجود تھے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ خود اس واقعہ کے وقت حاضر ہوں، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت قابل ترجیح ہے،

۴، بعض مرتبہ ایک آیت کے اسباب نزول ایک سے زائد ہوتے ہیں، یعنی ایک جیسے کئی واقعات یکے بعد دیگرے پیش آتے ہیں، اور ان سب کے بعد آیت نازل ہوتی ہے، اب کوئی راوی اس آیت کے شان نزول میں ایک واقعہ ذکر کرتا ہے، اور دوسرا کوئی اور واقعہ ذکر کرتا ہے، بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت تعارض نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں ہی واقعات سبب نزول ہوتے ہیں، مثلاً سورۃ نور کی آیات لعان کے بارے میں امام بخاریؒ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حلال بن اُمیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی تھی، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، وَالَّذِينَ يَزْمُونَ آذَآءَٰلَهُمْ بِالْحَقِّ، دوسری طرف امام بخاریؒ ہی نے ایک اور روایت حضرت ہشام بن سعدؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت عوفیرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرایا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی اجنبی کے ساتھ ملوث دیکھے اور اس شخص کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص لیا جائے گا؟ ایسے شخص کو کیا کرنا چاہوگا؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں اور پھر یہ آیات آپؐ نے سنائیں، تیسری طرف مسند تراز میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ اسی قسم کا سوال وجواب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان ہوا تھا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں،

واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں واقعات ان آیات کے نزول سے قبل پیش آچکے تھے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کو سبب نزول قرار دینا درست ہے،

۵۔ بعض اوقات اس کے برعکس ایسا ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ہوتا ہے، مگر اس کے سبب کئی آیتیں نازل ہو جاتی ہیں، اب ایک راوی اس واقعہ کو نقل کر کے کہتا ہے کہ اس پر فلاں آیت نازل ہوئی، اور دوسرا اسی واقعہ کو نقل کر کے

کسی دوسری آیت کا حوالہ دیتا ہے، اس سے بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا،

اس کی مثال یہ ہے کہ امام ترمذیؒ اور حاکمؒ نے حضرت اُم سلمہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! قرآن کریم میں ہجرت وغیرہ کے باب میں مجھے عورتوں کا ذکر نہیں ملتا، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَأَسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ
مِّنْكُمْ مِّمَّنْ ذَكَرْتُ، (ال عمران: ۱۹۵)

”پس اُن کے رب نے اُن کی دعاؤں کو قبول کر لیا، اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت“

اور امام حاکمؒ نے حضرت اُم سلمہؓ ہی سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! قرآن کریم میں مردوں ہی کا ذکر ہے، عورتوں کا کہیں تذکرہ نہیں، اس پر ایک آیت تو اِن الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ نازل ہوئی، اور دوسری آیت لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّمَّنْ ذَكَرْتُ اُنْتِ يَكُ مَكْرًا نَزُولًا اور اس کی حقیقت؛

۱۔ چھٹی صورت تکرار نزول کی ہے، یعنی بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی آیت ایک سے زائد مرتبہ نازل ہوئی، اور ہر مرتبہ اس کا نزول کسی نئے واقعہ کے پس منظر میں ہوا، اب کسی راوی نے ایک نزول کا واقعہ ذکر کر دیا، اور کسی نے دوسرے نزول کا، اس سے ظاہری طور پر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں تضاد اس لئے نہیں ہوتا کہ آیت دونوں واقعات میں دونوں مرتبہ نازل ہوئی،

۲۔ یہ سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ ہے، اور اس میں بہت سے اعمال صالحہ کا ذکر کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں دونوں کا الگ الگ نام لیا گیا ہے، لہٰذا اتقان، ص ۳۵ ج ۱،

مثلاً امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ چچا جان! آپ لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے آپ کی سفارش کر دوں گا، اس وقت ابو جہل اور عبد اللہ ابن امیہ بھی موجود تھے، انھوں نے ابو طالب کو ایمان کی طرف مائل ہونے دیکھا تو فوراً بولے: ”کیا تم عبد المطلب کے دین سے برگشتہ ہونا چاہتے ہو؟“ اس کے بعد وہ دونوں بولتے ہی رہے، یہاں تک کہ ابو طالب یہ کہہ اٹھے کہ: ”میں عبد المطلب ہی کے دین پر ہوں“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”میں آپ کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہوں گا، جب تک کہ مجھے اس سے روک نہ دیا جائے“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ

”نبی کو اور مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے

مغفرت طلب کریں“

دوسری طرف امام ترمذیؒ نے حضرت علیؓ سے بسند حسن نقل کیا ہے کہ میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کے لئے استغفار کرتے سنا، میں نے اس سے کہا کہ تمھارا والدین تو مشرک تھے، ان کے لئے استغفار کیسے کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے والد کے لئے استغفار کیا تھا، حالانکہ اُن کے والد بھی مشرک تھے، یہ بات میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو اُس پر یہ آیت نازل ہوئی،

تیسری طرف امام حاکمؒ وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، اور ایک قبر کے پاس بیٹھ کر دیر تک مناجات کرتے اور روتے رہے، پھر فرمایا کہ جس قبر کے پاس میں بیٹھا تھا وہ میری والدہ کی قبر تھی، میں نے اپنے پروردگار سے اُن کے لئے دعا کرنی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں ملی، اور یہ آیت نازل ہوئی، مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا،

یہاں تینوں واقعات میں ایک ہی آیت کا نزول بیان کیا گیا ہے، چنانچہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت تینوں مرتبہ الگ الگ نازل ہوئی ہے،

اب یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب ایک آیت ایک مرتبہ نازل ہو چکی، اُسے لکھ کر محفوظ کر لیا گیا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ رضہ کو یاد ہو گئی تو پھر دوبارہ اور سب بارہ اسے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا بہترین جواب حضرات شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے، اور وہ یہ کہ ”تکرار نزول“ کی مذکورہ بالا صورت میں آیت کا اصلی نزول تو ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے، لیکن وہ آیت جس واقعہ میں نازل ہوئی تھی، جب اسی جیسا کوئی اور واقعہ پیش آتا ہے تو وہی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں دوبارہ ڈال دی جاتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ میں بھی اسی آیت سے رہنمائی ملے گی، یہ آیت کا قلب مبارک میں مستحضر ہو جانا چونکہ منجانب اللہ ہوتا ہے، اس لئے یہ وہی ”نقش فی الرّوع“ ہے جو وحی کی ایک قسم ہے، اور جس کا مفصل بیان وحی کے طریقوں میں پیچھے گزر چکا ہے، اسی کو مفسرین ”نزولِ مکرر“ سے تعبیر فرمادیتے ہیں، گویا جتنی مرتبہ وہ آیت قلب میں منجانب اللہ وارد ہوئی، اتنی ہی مرتبہ اس کا نزول ہوا،

اسباب نزول کے سلسلے میں روایات کے اندر جو تعارض یا اختلاف ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا چھ اصولوں کے تحت عموماً باآسانی دُور ہو جاتا ہے، اور یہ چھ اصول ذہن میں رہیں تو اختلافِ روایات کی صورت میں الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

اسباب نزول، فصل فی معرفۃ اسباب نزول، ص ۲۲

۱۵۔ یہ مثال الاتقان ج ۱، ص ۳۴ سے ماخوذ ہے، لیکن یہ اس تقدیر پر ہے کہ تینوں روایات کو صحیح قرار دیا جائے اور نہ تیسری روایت کی صحت میں کلام ہو، چنانچہ حافظ ذہبی اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ”قلت ابو بن ہانی ضعف ابن معین“ (مستدرک ص ۳۳۶ ج ۲) اور ابوب بن ہانی کے بارے میں حافظ ابن حجر نے ائمہ جرح و تعدیل کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں (تہذیب التہذیب ص ۴۱۲ ج ۱) لہذا تو اس روایت کو موضوع کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کو عقیدہ کے کسی نازک مسئلہ کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، چنانچہ اہل سنت کی ایک بڑی جماعت بہت سے دلائل کی بنیاد پر اس بات کی قائل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ملتِ ابراہیمی پر فوت ہو چکی بنا پر مؤمن شخص، خود علامہ سیوطی نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ



قرآن کے سات حروف

ایک صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-
 اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ اُنزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُوْفٍ
 قَافِرُوْا مَا تَكْتُمُوْنَ مِنْهُ ۗ

یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس اُس میں
 جو تھکے لئے آسان ہو اُس طریقے سے پڑھ لو!

اس حدیث میں قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟
 یہ بڑی معسرکۃ الآراء اور طویل الذیل بحث ہے، اور بلاشبہ علوم قرآن کے
 مشکل ترین مباحث میں سے ہے، یہاں یہ پوری بحث تو نقل کرنا مشکل ہے، لیکن
 اس کے متعلق ضروری ضروری باتیں پیش خدمت ہیں :-

جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے متواتر ہے، چنانچہ مشہور
 محدث امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اُس کے تواتر کی تصریح کی ہے اور

حدیث و قرآت کے معروف امام علامہ ابن الجزری فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (جزء) میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کئے ہیں، اور ان کے مطابق یہ حدیث حضرت عمر بن خطابؓ، ہشام بن حکیم بن حرامؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ، حذیفہ بن یمانؓ، ابوبکرؓ، عمرو بن عاصؓ، زید بن ارقمؓ، انس بن مالکؓ، سمیرہ بن جندبؓ، عمر بن ابی سلمہؓ، ابوجہمؓ، ابوطحہؓ اور ام ایوب انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے، اس کے علاوہ متعدد محدثین نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر یہ اعلان فرمایا کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو جائیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہو کہ :-

”قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہو“

چنانچہ صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہو گئی جسے شمار نہیں کیا جاسکا ہے۔

حروفِ سبعہ کا مفہوم | اس حدیث میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سات حروف سلسلے میں آزاد و نظریات کا شدید اختلاف ملتا ہے، یہاں تک کہ علامہ ابن عربیؒ وغیر نے اس باب میں پینتیس اقوال شمار کئے ہیں، یہاں ان میں سے چند مشہور اقوال پیش خدمت ہیں :-

۱۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد سات مشہور قاریوں کی قراتیں ہیں، لیکن یہ خیال تو بالکل غلط اور باطل ہے، کیونکہ قرآن کریم کی متواتر قراتیں ان سات قراتوں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ اور بھی متعدد قراتیں تو اتر کے ساتھ ثابت

۱۔ ابن الجزریؒ: النشر فی القرات العشر، ص ۲۱، ج ۱ دمشق ۱۳۴۵ھ
 ۲۔ ایضاً،

۳۔ التزکیۃ: البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۱۲ ج ۱،

ہیں، سات قرآتیں تو محض اس لئے مشہور ہو گئیں کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے ایک کتاب میں ان سات مشہور قرآت کی قرآتیں جمع کر دی تھیں، نہ ان کا یہ مقصد تھا کہ قرآتیں سات میں منحصر ہیں، اور نہ وہ حروفِ سبعہ کی تشریح ان سات قرآتوں کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی،

۲۔ اسی بنا پر بعض علمائے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حروف سے مراد تمام قرآتیں ہیں، لیکن "سات" کے لفظ سے سات کا مخصوص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے، اور عربی زبان میں سات کا لفظ محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے لئے اکثر استعمال ہو جاتا ہے، یہاں بھی حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم جن حروف پر نازل ہوا وہ مخصوص طور پر سات ہی ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم بہت سے طریقوں سے نازل ہوا ہے، علماء متقدمین میں سے قاضی عیاضؒ کا یہی مسلک ہے، اور آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی یہی قول اختیار فرمایا ہے،

لیکن یہ قول اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ: اقرأنی جبریل علی حرف فراجعتہ، فلم ازل استزییہ ویزیدنی حتی انتھی الی سبعة احرف،

مجھے جبریل علیہ السلام نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں زیادتی طلب کرتا رہا، اور وہ (قرآن کریم کے حروف میں) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے،

لے اوجز المسائل الی مؤطا الامام مالک، ص ۵۶ ج ۲ مطبوعہ سہارنپور ۱۳۵۵ھ

۱۱ مصنفی شرح مؤطا ص ۸۷ ج ۱ مطبوعہ فاروقی دہلی ۱۲۹۳ھ

۱۲ بحوالہ مناہل العرفان، ص ۱۳۳ ج ۱،

اسی کی تفصیل صحیح مسلم کی ایک روایت میں حضرت ابی بن کعب سے اس طرح مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو غفار کے تالاب کے پاس تھے۔

فأتاه جبرئیل علیہ السلام فقال ان الله يأمرک ان تقرأ أمّتك القرآن علی حروف، فقال أسأل الله معافاته ومغفرته وان امتی لا تطیع ذلك، ثم أتاه الثانية فقال ان الله يأمرک ان تقرأ أمّتك القرآن علی حروفین فقال أسأل الله معافاته ومغفرته و ان امتی لا تطیع ذلك، ثم جاءته الثالثة فقال ان الله يأمرک ان تقرأ أمّتك القرآن علی ثلاثة أحرف فقال أسأل الله معافاته ومغفرته وان امتی لا تطیع ذلك ثم جاءه الرابعة فقال ان الله يأمرک ان تقرأ أمّتك القرآن علی سبعة أحرف فأیما حروف قرء وأعلیه فقد أصابوا^{عليه}

پس حضور کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کریم کو ایک ہی حرف پر پڑھے، اس پر آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے،

پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کریم کو تین حروف پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قرأت درست ہوگی۔

ان روایات کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہاں سات سے مراد محض کثرت نہیں، بلکہ سات کا مخصوص عدد ہے، اس لئے ان احادیث کی روشنی میں یہ قول قابل قبول معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ جمہور نے اس کی تردید کی ہے،

۳۔ بعض دوسرے علماء مثلاً حافظ ابن جریر طبری نے وغیرہ نے فرمایا کہ مذکورہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں، چونکہ اہل عرب مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر قبیلہ کی زبان عربی ہونے کے باوجود دوسرے قبیلہ سے تھوڑی تھوڑی مختلف تھی، اور یہ اختلافات ایسا ہی تھا جیسے ایک بڑی زبان میں علاقائی طور پر تھوڑے تھوڑے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی آسانی کے لئے قرآن کریم سات لغات پر نازل فرمایا، تاکہ ہر قبیلہ اُسے اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکے، لہٰذا امام ابو حاتمؒ حجتانی نے ان قبائل کے نام بھی معین کر کے بتا دیئے ہیں، اور فرمایا ہے کہ قرآن کریم ان سات قبائل کی لغات پر نازل ہوا ہے: قریش، ہذیل، تیمم، الریاب، ازد، ربیعہ، ہوازن اور سعد بن بکر، اور حافظ ابن عبد البر نے بعض حضرات سے نقل کر کے اُن کی جگہ یہ قبائل بتائے ہیں: ہذیل، کنانہ، قیس، ضبہ، تیمم، الریاب، اسد بن خزیمہ اور قریش،

لیکن بہت سے محققین مثلاً حافظ ابن عبد البر، علامہ سیوطی اور علامہ ابن حجرؒ وغیرہ نے اس قول کی بھی تردید کی ہے، اول تو اس لئے کہ عرب کے قبائل بہت سے تھے، ان میں سے صرف ان سات کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کے درمیان قرآن کریم کی تلاوت میں اختلاف ہوا جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاریؒ وغیرہ میں مروی ہے، حالانکہ یہ دونوں حضرات قریشی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصدیق فرمائی، اور وجہ یہ بتائی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اگر سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہوتیں تو حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے تھی، کیونکہ دونوں قریشی تھے، اگرچہ علامہ آوسیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے علاوہ کسی اور لغت پر قرآن پڑھایا ہو، لیکن یہ جواب کمزور ہے، کیونکہ مختلف لغات میں قرآن کریم کے نازل ہونے کا منشاء یہی تو تھا کہ ہر قبیلہ والا اپنی لغت کے مطابق آسانی سے اُس کو پڑھ سکے، اس لئے یہ بات حکمت رسالت سے بعید معلوم ہوتی ہے، کہ ایک قریشی کو دوسری لغت پر قرآن کریم پڑھایا گیا ہو، اس کے علاوہ اس پر امام طحاویؒ نے بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ مان لیا جا کہ سات حروف سے مراد سات قبائل کی لغات ہیں، تو یہ اُس آیت کے خلاف ہوگا جس میں ارشاد ہے:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ

”اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں“

اور یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی، اس لئے ظاہر ہے

کہ قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا ہے، امام طحاویؒ کی اس بات کی تائیدیوں بھی ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی جمع ثانی کا ارادہ فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو مصحف تیار کرنے کا حکم دیا، اس وقت انھیں یہ ہدایت فرمائی تھی :-

إِذَا اِخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ
فَاكْتُبُوهُ بِسُكَّانِ قُرَيْشٍ فَاَتَمَّا تَزَلِ بِلِسَانِهِمْ
بُجْبِ قرآنِ رُكِيِّ كِتَابَتِ اِيْنِ تَمَّ اِلَيْهِ دَرَمِيَانِ كُوْنِي اِخْتِلَافِ
هُوَ تُوْا سَ قُرَيْشِ كِي لُغْتِ بِر لُكْهِنَا، كِيُوْنِ كَ قُرْآنِ اِيْنِي كِي زِيَانِ مِيْنِ
نازل ہوا ہے ۱۱

اس میں حضرت عثمانؓ نے تصریح فرمادی ہے کہ قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، رہا یہ سوال کہ پھر اختلاف پیش آنے کا کیا مطلب ہے؟ سو اس کا مفصل جواب انشاء اللہ آگے آئے گا،

اس کے علاوہ اس قول کے قائلین اس بات پر متفق ہیں کہ ”احرف سبعہ“ اور ”قرارات“ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، قرارات کا اختلاف جو آج تک موجود ہے وہ صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے اندر ہے، اور باقی حروف یا منسوخ ہو گئے یا مصلحہ انھیں ختم کر دیا گیا، اس پر دو سکر اشکالات کے علاوہ ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ پورے ذخیرہ احادیث میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا، کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک ”سبعۃ احرف“ کے اور ایک قرارات کے، بلکہ احادیث میں جہاں کہیں قرآن کریم کے کسی لفظی اختلاف کا ذکر آیا ہے وہاں صرف ”احرف“ کا اختلاف ذکر کیا گیا ہے، قرارات کا کوئی جہاں نہ اختلاف بیان نہیں

۱۱۔ الطحاوی؟ مشکل الآثار، ص ۸۵ و ۸۶ ج ۴، دائرة المعارف دکن ۳۳۳ ص

۱۲۔ صحیح بخاری؟ باب جمع العشران،

کیا گیا، ان وجوہ کی بنا پر یہ قول بھی نہایت کمزور معلوم ہوتا ہے،

۲۔ چوتھا مشہور قول امام طحاوی کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نازل تو صرف قریش کی لغت پر ہوا تھا، لیکن چونکہ اہل عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر ایک کے لئے اس ایک لغت پر قرآن کریم کی تلاوت بہت دشوار تھی، اس لئے ابتداء اسلام میں یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ اپنی علاقائی زبان کے مطابق مراد الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ جن لوگوں کے لئے قرآن کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی، ان کے لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرادفات متعین فرمادیئے تھے جن سے وہ تلاوت کر سکیں یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے، اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تعالٰیٰ کی جگہ ھَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ پڑھ دیا جائے، معنی سب کے ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی، جبکہ تمام اہل عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے تھے، پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا دائرہ اثر بڑھتا گیا، اہل عرب اس کے عادی ہو گئے، اور ان کے لئے اسی پہلی لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہو گئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا، جسے عوضہ اخیرہ کہا جاتا ہے، اس موقع پر یہ مرادفات پڑھنے کی اجازت ختم کر دی گئی، اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا،

اس قول کے مطابق "سات حروف" والی حدیث اسی زمانے سے متعلق ہے، جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی، اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس وسعت کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ اُسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر

پڑھا جاسکے گا، اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کئے جاسکتے ہیں ان کی تعداد سات ہے، اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کر لے، بلکہ متبادل الفاظ کی تعیین بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، اور ہر شخص کو آپ نے اس طرح قرآن سکھلایا تھا جو اس کے لئے آسان ہو، لہذا صرف ان مرادفات کی اجازت دی گئی تھی، جو حضور سے ثابت تھے۔

امام حمادؒ کے علاوہ حضرت سفیان بن عیینہؒ، ابن وہبؒ اور حافظ ابن عبد البرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے، بلکہ حافظ ابن عبد البرؒ نے تو اس قول کو اکثر علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہ قول کچھلے تمام اقوال کے مقابلہ میں زیادہ قرین قیاس ہے، اور اس کے قائلین اپنی دلیل میں مسند احمدؒ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:-

ان جبرئیل قال یا محمد اقرأ القرآن علی حروف، قال
میکنیل استزده حتی بلغ سبعة أحرف، قال کلُّ
شأنٍ کانت الم تخط ایة عذاب برحمة اورحمة
بعذاب، نحو قولک تعالیٰ وَاَقْبِلْ وَهَلُمَّ وَاذْهَبْ وَاَسْرِضْ
وَعَجَلْ۔

جبرئیل علیہ السلام نے (حضور سے) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک

۱۹ فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۱۹

۲۰ بیہ الزرقانی، شرح الموطأ، ص ۱۱ ج ۲، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر ۱۳۵۵ھ

۲۱ ہذا اللفظ روایت احمدؒ و اسنادہ جید (اوجز المسائل، ص ۵۷ ج ۳، ۲)

حروف پر پڑے، میکاتیل علیہ السلام نے (حضورؐ سے) کہا اس میں اضافہ کرو اور
یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے
فرمایا، ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تا وقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت
سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کر دیں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ تَعَالَى (لَا
کے معنی کو اَقْبَلُ، صَلُّمٌ، اِذْهَبْ، اَسْرِعْ اور عَجَلْ کے الفاظ سے ادا کریں۔

اس قول پر اور تو کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن ایک اُلجھن اس میں بھی باقی رہی
ہے، اور وہ یہ کہ تشریح کریم کی جو مختلف قراءتیں آج تک متواتر چلی آرہی ہیں، اس
قول کے مطابق ان کی حیثیت واضح نہیں ہوتی، اگر ان تشریحات کو "سات حروف"
سے الگ کوئی چیز قرار دیا جائے تو اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، احادیث کے
وسیع ذخیرے میں "احرف" کے اختلاف کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور لفظی اختلاف
کا ذکر نہیں ملتا، پھر اپنی طرف سے یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ تشریح کریم کی تلاوت
میں "احرف سبعہ" کے علاوہ ایک اور قسم کا اختلاف بھی تھا، اس اُلجھن کا کوئی
اطمینان بخش حل اس قول کے قائلین کے یہاں مجھے نہیں مل سکا،

سبعتہ احرف کی راجح ترین تشریح

ہمارے نزدیک قرآن کریم کے "سات حروف" کی سب سے بہتر تشریح اور تعبیر
ہے کہ حدیث میں "حروف کے اختلاف" سے مراد "قراءتوں کا اختلاف" ہے، اور "سات
حروف سے مراد" اختلاف قراءت" کی سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ قراءتیں تو اگرچہ
سات سے زائد ہیں، لیکن ان تشریحات میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ سات
اقسام میں منحصر ہیں، (ان سات اقسام کی تشریح آگے آرہی ہے)۔

ہمارے علم کے مطابق یہ قول متقدمین میں سے سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
کے یہاں ملتا ہے، مشہور مفسر تشریح قرآن علامہ نظام الدین قمی نیشاپوریؒ اپنی تفسیر
غرائب القرآن میں لکھتے ہیں کہ احرف سبعہ کے بارے میں امام مالکؒ کا یہ مذہب منقول
ہے کہ اس سے مراد قراءت میں مندرجہ ذیل سات قسم کے اختلافات ہیں :-

۱۔ مفرد اور جمع کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری میں

صیغہ جمع، مثلاً وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ، اور كَلِمَاتُ رَبِّكَ،

نث

۲۔ تذکر و تائید کا اختلاف، کہ ایک میں لفظ مذکر استعمال ہوا اور دوسری میں مؤنث

جیسے لَا يُقْبَلُ اور لَا تُقْبَلُ

۳۔ وجوہ اعراب کا اختلاف، کہ زیر زبر وغیرہ بدل جائیں، مثلاً هَلْ مِنْ خَالِقِ

غَيْرِ اللَّهِ اور غَيْرِ اللَّهِ،

۴۔ صرفی ہیئت کا اختلاف، جیسے يَعْزِ شَوْمُن اور يُعْزِ شَوْمُن،

۵۔ ادوات (حروف نحویہ) کا اختلاف، جیسے لَكِنَّ الشَّيَاطِينَ اور لَكِنَّ الشَّيَاطِينِ

۶۔ لفظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں، جیسے تَعْلَمُونَ اور يُعْلَمُونَ

اور نُشْرُهَا اور نُنَشْرُهَا،

۷۔ لہجوں کا اختلاف، جیسے تخفیف، تفعیم، امالہ، مد، قصر، اظہار اور ادغام وغیرہ

پھر یہی قول علامہ ابن قتیبہ، امام ابو الفضل رازی، قاضی ابوبکر بن الطیب

یا قلاتی اور محقق ابن الجزری رحمہم اللہ نے اختیار فرمایا ہے، محقق ابن الجزری جو قرآت

کے مشہور امام ہیں اپنا یہ قول بیان کرنے سے قبل تحریر فرماتے ہیں:-

”میں اس حدیث کے بارے میں اشکالات میں مبتلا رہا، اور اس پر

تیس سال سے زیادہ غور و فکر کرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے

مجھ پر اس کی ایسی تشریح کھول دی جو انشاء اللہ صحیح ہوگی“

یہ سب حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے

مراد اختلافِ قرأت کی سات نوعیتیں ہیں، لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعیین میں ان

۱۔ انیشاپوری، غرائب القرآن و رغائب الفرقان، ہامش ابن جریر، ص ۲۱ ج ۱، المطبعة الميمنية

۲۔ ابن قتیبہ، ابو الفضل رازی، اور ابن الجزری کے اقوال، فتح الباری، ص ۲۵ و ۲۶ ج ۱، ۹

اور اتقان، ص ۴۷ ج ۱ میں موجود ہیں، اور قاضی ابن الطیب کے قول تفسیر القرطبی، ص ۳۵ ج ۱ میں ...

دیجا جاسکتا ہے، ۳۔ التشریح فی القراءات العشر، ص ۲۶ ج ۱،

حضرات کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک نے قرأت کا استقراء اپنے طور پر الگ الگ کیا ہے، ان میں جن صاحب کا استقراء سب سے زیادہ منضبط مستحکم اور جامع و مانع ہے، وہ امام ابو الفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں، کہ قرأت کا اختلاف سات اقسام میں منحصر ہے :-

۱۔ اسماء کا اختلاف، جس میں انفراد، تثنیہ و جمع اور تذکرہ و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، (اس کی مثال وہی تَمَّتْ حِلْمَةُ رَبِّكَ ہے، جو ایک قرأت میں تَمَّتْ حِلْمَاتُ رَبِّكَ بھی پڑھا گیا ہے)

۲۔ افعال کا اختلاف، کہ کسی قرأت میں صیغہ ماضی ہو، کسی میں مضارع اور کسی میں امر (اس کی مثال رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا ہے کہ ایک قرأت میں اس کی جگہ رَبَّنَا بَعْن بَيْنَ أَسْفَارِنَا بھی آئی ہے)

۳۔ وجوہ اعراب کا اختلاف، جس میں اعراب یا حرکات مختلف قرأتوں میں مختلف ہوں (اس کی مثال وَلَا يُصْنَأْ كَاتِبٌ اور لَا يُصْنَأُ كَاتِبٌ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدِ)

۴۔ الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو (مثلاً ایک قرأت میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى ہے، اور دوسری میں وَالذَّكَرَ وَالْأُنثَى ہے، اور اس میں وَمَا خَلَقَ کا لفظ نہیں ہے، اسی طرح ایک قرأت میں تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمَا الْأَنْهَارُ اور دوسری میں تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمَا الْأَنْهَارُ)۔

۵۔ تقدیم و تاخیر کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں کوئی لفظ مقدم اور دوسری میں مؤخر ہے (مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور جَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ)

۶۔ بدلیت کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں ایک لفظ ہو، اور دوسری قرأت میں اس کی جگہ دوسرا لفظ (مثلاً تُنْشِرُهَا اور تُنْشِرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوا، فَتَبَيَّنُوا اور طَلَّحِ اور طَلَّحِ)

۷۔ لہجوں کا اختلاف، جس میں تخفیف، ترقیق، امالہ، قصر، مد، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات شامل ہیں، مثلاً موسیٰ ایک قرأت میں امالہ کے ساتھ ہے، اور اُسے موسیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے، اور دوسری میں بغیر امالہ کے ہے۔ علامہ ابن الجوزی، علامہ ابن قتیبہ اور قاضی ابوطیب کی بیان کردہ وجوہ اختلاف بھی اس سے ملتی جلتی ہیں، البتہ امام ابو الفضل رازی کا استقراء اس لئے زیادہ جامع معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف چھوٹا نہیں ہے، اس کے برخلاف باقی تین حضرات کی بیان کردہ وجوہ میں آخری قسم یعنی لہجوں کے اختلاف کا بیان نہیں ہے، اور امام مالک کی بیان کردہ وجوہ میں لہجوں کا اختلاف تو بیان کیا گیا ہے، لیکن الفاظ کی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور بدلیت کے اختلافات کی پوری وضاحت نہیں ہے، اس کے برخلاف امام ابو الفضل رازی کے استقراء میں یہ تمام اختلافات وضاحت کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں، محقق ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے تیس سال سے زائد غور و فکر کرنے کے بعد سات احرف کو سات وجوہ اختلاف پر محمول کیا ہے، انہوں نے بھی امام ابو الفضل کا قول بڑی وقعت کے ساتھ نقل فرمایا ہے، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اُن کے مجموعی کلام سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ انھیں امام ابو الفضل کا استقراء خود اپنے استقراء سے بھی زیادہ پسند آیا ہے، اس کے علاوہ حافظ ابن حجر کے کلام سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان تینوں اقوال میں امام ابو الفضل رازی کے استقراء کو ترجیح دی ہے، کیونکہ انہوں نے علامہ ابن قتیبہ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ہذا وجہ حسن (یہ اچھی توجیہ ہے) پھر امام ابو الفضل کی بیان کردہ سات وجوہ بیان کر کے تحریر فرمایا ہے:

قلت وقد اخذت کلام ابن قتیبہ و نقحہ،
 میرا خیال ہے کہ امام ابو الفضل رازی نے ابن قتیبہ کا قول اختیار کر کے
 اُسے اور نکھار دیا ہے۔

آخری دور میں شیخ عبد العظیم الزرقانی نے بھی اپنی کے قول کو اختیار کر کے اس کی تائید میں متعلقہ دلائل پیش کئے ہیں؛

بہر کیف! استقراء کی وجہ میں تو اختلاف ہے، لیکن اس بات پر امام مالکؒ علامہ ابن قینہؒ، امام ابو الفضل رازیؒ، محقق ابن الجریؒ اور قاضی باقلانی پانچوں حضرات متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد قرأت کے وہ اختلافات ہیں جو سات نوعیتوں میں منحصر ہیں،

احقر کی ناچیز رائے میں ”سبعۃ احرف“ کی یہ تشریح سب سے زیادہ بہتر ہے، حدیث کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے، اور یہ مختلف طریقے اپنی نوعیتوں کے لحاظ سے سات ہیں، ان سات نوعیتوں کی کوئی تعیین چونکہ کسی حدیث میں موجود نہیں ہے اس لیے یقین کی گنجائش تو کسی کے استقراء کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ حدیث میں وہی مراد ہے، لیکن بظاہر امام ابو الفضل رازیؒ کا استقراء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ موجودہ قرأت کی تمام انواع کو جامع ہے،

اس قول کی وجہ ترمیح | ”سبعۃ احرف“ کی تشریح میں جنہو اقوال حدیث تفسیر اور علوم قرآن کی کتابوں میں بیان ہوئیں، ہمارے نزدیک ان

سب میں یہ قول رک سات حروف مراد اختلاف قرأت کی سات نوعیتیں ہیں) سب سے زیادہ راجح، قابل اعتماد اور اطمینان بخش ہے، اور اس کی مندرجہ ذیل وجہ ہے :-

۱۔ اس قول کے مطابق ”حروف“ اور ”قرآت“ کو دو الگ الگ چیزیں مقرر دینا نہیں پڑتا، علامہ ابن جریرؒ اور امام طحاویؒ کے اقوال میں ایک مشترک الجھن یہ ہے کہ ان میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک حروف کا اختلاف اور دوسرے قرآت کا اختلاف، حروف کا اختلاف اب ختم ہو گیا، اور قرآت کا اختلاف باقی ہے، حالانکہ احادیث کے لئے بڑی ذخیرہ

میں کوئی ایک ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ ”حروف“ اور قرأت ”دوالگ الگ چیزیں ہیں“ احادیث میں صرف حروف کے اختلاف کا ذکر ملتا ہے، اور اسی کے لئے کثرت سے ”قرآءة“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اگر قرأت ”ان حرف“ سے الگ ہوتی تو کسی نہ کسی حدیث میں ان کی طرف کوئی اشارہ تو ہونا چاہئے تھا، آخر کیا وجہ ہے کہ ”حروف“ کے اختلاف کی احادیث تو تقریباً تو اتر تک پہنچی ہوئی ہیں، اور ”قرأت“ کے جداگانہ اختلاف کا ذکر کسی ایک حدیث میں بھی نہیں ہے؟ محض اپنے قیاس سے یہ کہہ دینا کیونکر ممکن ہے کہ اختلاف حروف کے علاوہ قرآن کریم کے الفاظ میں ایک دوسری قسم کا اختلاف بھی تھا؟

مذکورہ بالا قول میں یہ ابھن بالکل رفع ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس میں ”حروف“ اور ”قرآءت“ کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے،

۲۔ علامہ ابن حبریر کے قول پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ سات حروف میں سے کچھ حرف منسوخ یا متروک ہو گئے، اور صرف ایک حرف قریش باقی رہ گیا، موجودہ قرأت اسی حرف قریش کی ادائیگی کے اختلافات ہیں) اور اس نظریہ کی قباحتیں ہم آگے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے، مذکورہ بالا آخری قول میں یہ قباحتیں نہیں ہیں، کیونکہ اس کے مطابق ساتوں حروف آج بھی باقی اور محفوظ ہیں،

۳۔ اس قول کے مطابق ”سات حروف“ کے معنی بلا تکلف صحیح ہو جاتے ہیں جبکہ دوسرے اقوال میں یا ”حروف“ کے معنی میں تاویل کرنی پڑتی ہے یا سات کے عدد میں ۴۔ ”سبعة احرف“ کے باب میں جتنے علماء کے اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں سب سے زیادہ جلیل القدر اور عہد رسالت سے قریب ہستی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اور وہ علامہ نیشاپوری کے بیان کے مطابق اسی قول کے قائل ہیں،

۵۔ علامہ ابن قتیبہ اور محقق ابن الجوزی ”دونوں علم قرأت کے مسلم الثبوت امام ہیں“ اور دونوں اسی قول کے قائل ہیں، اور مؤخر الذکر کا یہ قول پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے تیس سال سے زائد اس حدیث پر غور کرنے کے بعد اس قول کو اختیار کیا، اور

اس قول پر وارد ہونے والے | اب ایک نظر ان اعتراضات پر بھی ڈال لیجئے جو اس قول
اعتراضات اور ان کا جواب پر وارد ہو سکتے ہیں یا وارد کئے گئے ہیں۔

۱۔ اس پر ایک اعتراض تو یہ کیا گیا ہے کہ اس قول میں جتنی وجوہ اختلاف بیان
کی گئی ہیں وہ زیادہ تر صرف اور نحوی تقسیمات پر مبنی ہیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے جہنم قتیہ پر عرش ارشاد فرمائی اس وقت صرف و نحو کی یہ فنی اصطلاحات اور تقسیمات
راجح نہیں ہوتی تھیں، اُس وقت اکثر لوگ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے، ایسی صورت
میں ان وجوہ اختلاف کو ”سبعۃ احرف“ قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن حجر
نے یہ اعتراض نقل کر کے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ:-

ولا يلزم من ذلك توہین ما ذهب اليه ابن قتيبة
لاحتمال ان يكون الاخصار المذکور فی ذلك وقع اتفاقاً
وانما اطلع عليه بالاستقراء وفي ذلك من الحكمة
البالغة ما لا يخفى

”اس سے ابن قتیبہ کے قول کی کمزوری لازم نہیں آتی، اس لئے کہ
یہ ممکن ہے کہ مذکورہ اخصار اتفاقاً ہو گیا ہو، اور اس کی اطلاع استقراء
کے ذریعہ ہو گئی ہو، اور اس میں جو حکمت بالغہ ہے وہ پوشیدہ نہیں“

ہماری ناچیز فہم کے مطابق اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے عہد رسالت
میں یہ اصطلاحات راجح نہ تھیں، اور شاید یہی وجہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
”سبعۃ احرف“ کی تشریح اس دور میں نہیں فرمائی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ فنی اصطلاحات
جن مفہیم سے عبارت ہیں وہ مفہیم تو اس دور میں بھی موجود تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان مفہیم کے لحاظ سے وجوہ اختلاف کو سات میں منحصر قرار دیدیا ہو تو
اس میں کیا تعجب ہے؟ ہاں اُس دور میں اگر سات وجوہ اختلاف کی تفصیل بیان

کی جاتی، تو شاید عامۃ الناس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی، اس لئے آپ نے اس کی تفصیل بیان فرمانے کے بجائے صرف اتنا واضح فرمادیا کہ یہ وجوہ اختلاف کُل سات میں مختصر ہیں بعد میں جب یہ مصطلحات راجح ہو گئیں تو علماء نے استقراء تام کے ذریعہ ان وجوہ اختلاف کو اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کر دیا، یہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کسی خاص شخص کے استقراء کے بارے میں یقین کامل سے یہ کہنا پوشکل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی، لیکن جب مختلف لوگوں کا استقراء یہ ثابت کر رہا ہے کہ وجوہ اختلاف کُل سات ہیں، تو اس بات کا قریب قریب یقین ہو جاتا ہے ”بعۃ احرف“ سے آپ کی مراد سات وجوہ اختلاف تھیں، خواہ ان کی تفصیل بعینہ وہ نہ ہو جو بعد میں استقراء کے ذریعہ معین کی گئی ہے، بالخصوص جبکہ ”بعۃ احرف“ کی تشریح میں کوئی اور صورت معقولیت کے ساتھ بنتی ہی نہیں ہے،

سات حروف کے ذریعہ | (۲) اس قول پر دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کو سات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا، تاکہ امت کے لئے تلاوت قرآن میں آسانی پیدا کی جائے، یہ

آسانی علامہ ابن جریر کے قول پر تو سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ عرب میں مختلف قبائل کے لوگ تھے، اور ایک قبیلے کے لئے دوسرے قبیلے کی لغت پر قرآن پڑھنا مشکل تھا لیکن امام مالک، امام رازی اور ابن الجزری وغیرہ کے اس قول پر تو ساتوں حروف ایک لغت قریش ہی سے متعلق ہیں، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب قرآن کریم ایک ہی لغت پر نازل کرنا تھا تو اس میں قرآت کا اختلاف باقی رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اعتراض کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن میں سات حروف کی جو سہولت امت کے لئے مانگی تھی اس میں قبائل عرب کا اختلاف لغت آپ کے پیش نظر تھا، حافظ ابن جریر طبری نے اسی بنا پر ”سات حروف“ کو ”سات لغات عرب“ کے معنی پہنچائے ہیں، حالانکہ یہ وہ بات ہے جس کی تائید کسی حدیث سے نہیں ہوتی، اس کے برعکس ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ بیان فرمادیا ہے کہ سات حروف کی آسانی طلب کرتے ہوئے آپ کے پیش نظر کیا بات تھی؟ امام ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابی بن کعب کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:-

لقى رسول الله صلى الله عليه وسلم جبريل عن احوار
المراء فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لجبريل:
انني بعثت الى امة امة فيهم الشيخ الفاني والعجوة
الكبيرة والغلام، قال فمرهم فليقرءوا القرآن على
سبعة احرف^{له}

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مروہ کے پتھروں کے قریب حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہوئی، آپ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا: میں ایک آن پڑھ امت کی طرف بھیجا گیا ہوں جس میں لب گور بڑھے بھی ہیں، سن رسیدہ بوڑھیاں بھی، اور بچے بھی، حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ ان کو حکم دیجئے کہ وہ قرآن کو سات حروف پڑھیں۔
ترمذی ہی کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا:-

انني بعثت الى امة امة فيهم العجوة والشيخ
والكبيرة والغلام والذئبي ليم يقرأ كتابا
قطعه

”مجھے ایک آن پڑھ امت کی طرف بھیجا گیا ہے، جن میں بوڑھیاں بھی ہیں، بوڑھے بھی، سن رسیدہ بھی، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور ایسے لوگ بھی جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔“

اس حدیث کے الفاظ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتلا رہیں کہ امت کے لئے سات حروف کی آسانی طلب کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہ بات تھی کہ آپ ایک اُمّی اور ان پڑھ قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، جس میں ہر طرح کے انفرادی ہیں، اگر قرآن کریم کی تلاوت کے لئے صرف ایک ہی طریقہ متعین کر دیا گیا تو امت مشکل میں مبتلا ہو جائے گی، اس کے برعکس اگر کئی طریقے رکھے گئے تو یہ ممکن ہو گا کہ کوئی شخص ایک طریقے سے تلاوت پر قادر نہیں ہو تو وہ دوسرے طریقے سے انہی الفاظ کو ادا کرے، اس طرح اس کی نماز اور تلاوت کی عبادت درست ہو جائیں گی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بوڑھوں، بوڑھیوں یا آن پڑھ لوگوں کی زبان پر ایک لفظ ایک طریقے سے چڑھ جاتا ہے اور اس کے لئے زیر زبر کا معمولی فرق بھی دشوار ہوتا ہے، اس لئے آپ نے یہ آسانی طلب فرمائی کہ مثلاً کوئی شخص معروف کا صیغہ ادا نہیں کر سکتا تو اس کی جگہ دوسری قرأت کے مطابق جمہول کا صیغہ ادا کرے، یا کسی کی زبان پر صیغہ مفرد نہیں چڑھتا تو وہ اسی آیت کو صیغہ جمع سے پڑھ لے، کسی کے لئے ہجے کا ایک طریقہ مشکل ہو تو دوسرا اختیار کر لے، اور اس طرح اس کو پورے قرآن میں سات قسم کی آسانیاں مل جائیں گی،

آپ نے مذکورہ بالا حدیث میں ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کی آسانی طلب کرتے وقت یہ نہیں فرمایا کہ میں جس امت کی طرف بھیجا گیا ہوں وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کی لغت جدا ہے، اس لئے قرآن کریم کو مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت دی جاوے، اس کے برخلاف آپ نے قبائلی اختلافات سے قطع نظر ان کی عمروں کا تفاوت اور ان کے اُمّی ہونے کی صفت پر زور دیا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سات حروف کی آسانی دینے میں بنیادی عامل قبائل کا لغوی اختلاف نہ تھا، بلکہ امت کی ناخواندگی کے پیش نظر تلاوت میں ایک عام قسم کی سہولت دینا پیش نظر تھا جس سے امت کے تمام افراد فائدہ اٹھا سکیں،

(۳) اس قول پر تیسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اختلافِ قرأت کی جو سات نوعیتیں بیان کی گئی ہیں وہ خواہ مالک یا ابو الفضل رازیؒ کی بیان کی ہوئی ہوں یا علامہ ابن قتیبہؒ، محقق ابن الجزریؒ اور قاضی ابن الطیبؒ کی، بہر حال ایک قیاس اور تخمینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اسی وجہ سے ان حضرات میں سے ہر ایک نے ان سات وجوہ اختلاف کی تفصیل الگ الگ بیان کی ہے، اُن کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی،

اس کا جواب یہ ہے کہ ”سبعة احرف“ کی کوئی واضح تشریح کسی حدیث یا کسی صحابی کے قول میں نہیں ملتی، اس لئے اس باب میں جتنے اقوال ہیں، اُن سب میں روایات کو مجموعی طور پر جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ قول زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی بنیادی اعتراض واقع نہیں ہوتا، روایات کو مجموعی طور پر دیکھنے کے بعد ہمیں اس بات کا تو قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث میں سات احرف سے مراد اختلافِ قرأت کی سات نوعیتیں ہیں، یہی ان نوعیتوں کی تعیین و تشخیص، سو اس کے بارے میں ہم پہلے بھی یہ عرض کر چکے ہیں کہ اسے معلوم کرنے کا ذریعہ استقرار کے سوا کوئی اور نہیں، امام ابو الفضل رازیؒ کا استقرار ہمیں جامع و مانع ضرور معلوم ہوتا ہے، مگر یقین کے ساتھ ہم کسی کے استقرار کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، کہ حضورؐ کی مراد یہی تھی، لیکن اس سے یہ اصولی حقیقت مجروح نہیں ہوتی کہ ”سبعة احرف“ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اختلافِ قرأت کی سات نوعیتیں تھیں، جن کی تفصیل کا یقینی علم حاصل کرنے کا نہ ہمارے پاس کوئی راستہ ہے اور نہ اُس کی چنداں ضرورت ہے،

۲۔ اس قول پر چوتھا اعتراض یہ ممکن ہے کہ اس قول میں ”سبعة“ سے الفاظ اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کا اختلاف مراد لیا گیا ہے، معانی سے اس میں بحث نہیں ہے، حالانکہ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سات قسم کے معانی ہیں، امام محمد امجدیؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں :-

كان الكتاب الاول ينزل من باب واحد على حرف واحد ونزل القرآن من سبعة ابواب على سبعة احرف زاجروا امر وحلال وحرام وحكم ومتشابه وامثال الخ،

پہلے کتاب ایک باب سے ایک حرف پر نازل ہوتی تھی اور قرآن کریم سات ابواب سے سات حروف پر نازل ہوا (وہ سات حروف یہ ہیں) زاجر (کسی بات سے روکنے والا) امر (کسی چیز کا حکم دینے والا) حلال (حرام، محکم جس کے معنی معلوم ہیں) متشابه (جس کے لفظی معنی معلوم نہیں) اور امثال !

اسی بنا پر بعض علماء سے منقول ہے کہ انھوں نے سات حروف کی تفسیر سات قسم کے معانی سے کی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے، امام طحاویؒ اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسے ابو سلمہؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؒ سے روایت کیا ہے، حالانکہ ابو سلمہ کی ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعودؒ سے نہیں ہوئی اس کے علاوہ قدیم زمانہ کے جن بزرگوں سے اس قسم کے اقوال منقول ہیں، ان کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان کا مقصد ”سبعة احرف“ والی حدیث کی تشریح کرنا نہیں تھا، بلکہ ”سبعة احرف“ کے زیر بحث مسئلہ بالکل الگ ہو کر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قرآن کریم اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے، رہے وہ لوگ جنھوں نے ”سبعة احرف“ والی حدیث کی تشریح ہی میں اس قسم

کی باتیں کہی ہیں، اُن کا قول بالکل برہی البطلان ہے، اس لئے کہ سچے جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں، اُن کو سرسری نظر ہی سے دیکھ کر ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ حروف کے اختلاف سے مراد معانی اور مضامین کا نہیں، بلکہ الفاظ کا اختلاف ہے۔ چنانچہ محقق علماء میں سے کسی ایک نے بھی اس قول کو سخت یار نہیں کیا، بلکہ اس کی تردید کی ہے۔^۱

فتوح سب سے پہلے محفوظ ہیں یا متروک ہو گئے؟
 کتب سب سے پہلے محفوظ ہیں یا متروک ہو گئے؟
 کے بعد ہم بحث یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف

آج بھی باقی ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ میں متقدمین سے تین قول منقول ہیں :-

(۱) پہلا قول حافظ ابن جریر طبریؒ اور ان کے متبعین کا ہے، پیچھے ہم عرض کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک "حروف سبعہ" سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں اسی بنا پر وہ یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم ان ساتوں حروف پر پڑھا جاتا تھا، لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب اسلام دور دراز ممالک تک پھیلا تو ان حروف سبعہ کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے، مختلف لوگ مختلف حروف پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور ایک دوسرے کی تلاوت کو غلط ٹھہراتے تھے، اس فتنہ کے انسداد کے لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے پوری اُمت کو صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے مطابق سات مصاحف مرتب فرما کر مختلف صوبوں میں بھیج دیتے اور باقی تمام مصاحف کو نذر آتش کر دیا تاکہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے، لہذا اب صرف لغت قریش کا حرف باقی رہ گیا ہے، اور باقی چھ حروف محفوظ نہیں ہیں اور تراویحوں کا جو اختلاف آج تک باقی چلا آتا ہے وہ اسی ایک حرف قریش کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں۔^۲

۱۔ تفصیل تردید کے لئے ملاحظہ ہو الاقناع ص ۲۹ ج ۱، نو ۱۶، اور النشر فی القراءات عشر

۲۔ ابن الجزریؒ ص ۲۵ ج ۱، ۱۱۵ ج ۱

حافظ ابن جریر کا نظریہ
اور اس کی قباحتیں

حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ اپنا یہ نظریہ
اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بڑی تفصیل اور جزم و وثوق
کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اس لئے یہ قول بہت مشہور ہوا

اور آجکل حروفِ سبعہ کی تشریح عموماً اسی کے مطابق کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ
بیشتر محقق علماء نے اسے اختیار نہیں کیا، بلکہ اس کی سختی کے ساتھ تردید فرماتی ہے،
کیونکہ اس قول پر متعدد الجھنیں ایسی کھڑی ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے،
اس نظریہ پر سب سے پہلا اعتراض تو وہی ہوتا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس
میں ”حروف“ اور ”فراآت“ کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ بات
کسی حدیث سے ثابت نہیں،

دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف تو
یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ ساتوں حروف منزل من اللہ تھے، دوسری طرف یہ فرماتے ہیں
کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورے سے چھ حروف کی تملادت کو ختم فرمایا
حالانکہ اس بات کو باور کرنا بہت مشکل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان حروف کو بیکسر ختم کرنے پر
متفق ہو گئے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے حضور کی فرمائش پر امت کی آسانی کے لئے نازل فرمایا
تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع بیشک دین میں حجت ہی، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ممکن نہیں
معلوم ہوتا کہ جس چیز کا قرآن ہونا تو اتر کے ساتھ ثابت ہوا سے وہ صفحہ ہستی سے متاثر
پر متفق ہو جائیں،

حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دراصل
امت کو قرآن کریم کی حفاظت کا حکم ہوا تھا اور اسے ساتھ ہی یہ اختیار بھی دیدیا تھا
کہ وہ سات حروف میں سے جس حرف کو چاہے اختیار کر لے، چنانچہ امت نے اس اختیار
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اجتماعی مصلحت کی خاطر چھ حروف کی تملات چھوڑ دی

اور ایک حرف کی حفاظت پر متفق ہو گئی، اس اقدام کا منشاء نہ ان حروف کو منسوخ قرار دینا تھا اور نہ ان کی تلاوت کو حرام قرار دینا تھا، بلکہ اپنے لئے اجتماعی طور پر ایک حرف کا انتخاب تھا،

لیکن یہ جواب بھی اس لئے کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اگر صورت یہی تھی تو کیا یہ مننا نہ تھا کہ امت اپنے عمل کے لئے خواہ ایک حرف کو اختیار کر لیتی، باقی چھ حروف کا وجود مسک سے ختم کرنے کے بجائے اُسے کم از کم کسی ایک جگہ محفوظ رکھتی، تاکہ ان کا وجود ختم نہ ہو، قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے :-

رِثَاتُكُمْ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

بلاشبہ ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے ہیں،

جب ساتوں حروف قرآن تھے تو اس آیت کا صاف تقاضا یہ ہے کہ وہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں گے، اور کوئی شخص ان کی تلاوت چھوڑنا بھی چاہے تو وہ ختم نہیں ہو سکیں گے، حافظ ابن جریر طبری نے اس کی نظیر میں یہ مسئلہ پیش کیا ہے کہ قرآن کریم نے جھوٹی قسم کھانے کے کفارے میں انسانوں کو تین باتوں کا اختیار دیا ہے، یا تو وہ ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا دس مسکینوں کو کپڑا دے، اب اگر امت باقی صورتوں کو ناجائز قرار دیتے بغیر اپنے عمل کے لئے ان میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لے تو یہ اُس کے لئے جائز ہے، اسی طرح قرآن کے سات حروف میں سے امت نے ایک حرف کو اجتماعی طور پر اختیار کر لیا، لیکن یہ مثال اس لئے درست نہیں کہ اگر امت کفارہ یمین کی تین صورتوں میں سے ایک صورت اس طرح اختیار کر لے کہ باقی صورتوں کو ناجائز تو نہ کہے لیکن عملاً ان کا وجود بالکل ختم ہو کر رہ جائے، اور لوگوں کو صرف اتنا معلوم رہ جائے کہ کفارہ یمین کی دو صورتیں اور تھیں جن پر امت نے عمل ترک کر دیا، لیکن وہ صورتیں کیا تھیں؟ ان کا جاننے والا بھی کوئی باقی نہ رہا تو یقیناً امت کے لئے ایسے اقدام کی گنجائش نہیں ہے،

پھر سوال یہ ہے کہ باقی چھ حروف کو ترک کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی؟

حافظ ابن جریر نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں ان حروف کے اختلاف کی وجہ سے شدید جھگڑے ہو رہے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورہ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان سب کو ایک حرف پر متحد کر دیا جائے، لیکن یہ بھی ایسی بات ہو جسے باور کرنا بہت مشکل ہو۔ حروف کے اختلاف کی بنا پر مسلمانوں کا اختلاف تو خود سرکارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا، احادیث میں ایسے متعدد واقعات مروی ہیں کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو مختلف طریقے سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے سنا تو باہمی اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ صحیح بخاریؒ کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ کے گلے میں چادر ڈال کر انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تھے، اور حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ حروف کا یہ اختلاف منکر میرے دل میں زبردست شکوک پیدا ہونے لگے تھے، لیکن اس قسم کے واقعات کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حروف سب کو ختم کرنے کے بجائے انھیں حروف کی رخصت سے آگاہ فرمایا، اور اس طرح کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو سکا، صحابہ کرامؓ سے یہ بعید ہو کہ انھوں نے اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے بجائے چھ حروف ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو،

پھر عجیب بات ہو کہ علامہ ابن جریرؒ کے قول کے مطابق صحابہؓ نے چھ حروف تو اختلاف کے ڈر سے ختم فرمادیئے، اور ستر اہمیں (جو ان کے قول میں حروف سے الگ ہیں) جو ان کی توں باقی رکھیں، چنانچہ وہ آج تک محفوظ چلی آتی ہیں، سوال یہ ہے کہ افتراق و اختلاف کا جو اندیشہ مختلف حروف پر قرآن کی تلاوت جاری رکھنے میں تھا کیا وہی اندیشہ قرأت کے اختلاف میں نہیں تھا؟ جبکہ ان ستر اہم کی روشنی میں بعض مرتبہ ایک ایک لفظ میں مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے، اگرچہ حروف ختم کرنے کا منشاء یہی تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ سب ایک طریقے سے قرآن کی تلاوت کیا کریں تو قرأتوں کے اختلاف کو آخر کیوں ختم نہیں کیا گیا؟ جب قرأت کے اختلاف کو باوجود مسلمانوں کے انشراحہ کو روکا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھایا جاسکتا

کہ ان تمام طریقوں سے تلاوت جائز ہے تو یہی تعلیم حروفِ سبعة کے باب میں فتنہ کا سبب کیوں سمجھی گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر حروفِ سبعة اور قرأت کے بارے میں صحابہ کرام کی طرف ایسی حیرت انگیز دو علیٰ منسوب کرنی پڑتی ہے جس کی کوئی معقول توجیہ سمجھ میں نہیں آتی،

پھر حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرف اتنے بڑے اقدام کی نسبت کسی صریح اور صحیح روایت کی بنا پر نہیں بلکہ بعض محل الفاظ کی قیاسی تشریح کے ذریعہ کی گئی ہے جن روایات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیح قرآن کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ انھوں نے چھ حروف کو ختم فرما دیا تھا بلکہ اس کے خلاف دلیلیں موجود ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اب کسی صحیح اور صریح روایت کے بغیر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ان چھ حروف کو بالکل بے نشان کر دینا گوارا کر لیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار فرمائش پر بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ جن صحابہ کرامؓ کو جمع و ترتیب قرآن کے نیک کام میں محض اس لئے تامل رہا ہو کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، جنہوں نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھنے میں اپنی عمریں کھپائی ہوں، اور جنہوں نے منسوخ التلاوة آیات تک کو محفوظ کر کے امت تک پہنچایا ہو، ان سے یہ بات بے انتہا بعید ہے کہ وہ سب کے سب چھ حروف کو ختم کرنے پر اس طرح متفق ہو جائیں کہ آج ان حروف کا کوئی نام و نشان تک باقی نہ رہے، جن آیات کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی صحابہ کرامؓ نے انھیں بھی کم از کم تاریخی حیثیت میں باقی رکھ کر ہم تک پہنچایا ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ حروف جن کے بارے میں حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ منسوخ نہیں ہوئے، بلکہ محض مصلحتاً ان کی تشریحات و کتابت ختم کر دی گئی، ان کی کوئی ایک مثال کسی ضعیف روایت میں بھی محفوظ نہ رہ سکی، یہی وجہ ہے کہ بیشتر محقق علماء نے حافظ ابن جریر بطبریؒ کے اس قول کی تردید

فرمائی ہے، جن کے اقوال کی تفصیل آگے آرہی ہے،

(۲) دوسرا مسلک امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا ہے

امام طحاوی کا قول

پہچے گذر چکا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن کریم نازل تو صرف ایک لغت قریش پر ہوا تھا، لیکن امت کی آسانی کے خیال سے یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ قرآن کی تلاوت میں شات کی حد تک دو سکر مرادفات استعمال کر سکتے ہیں اور یہ مرادفات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمادی تھے، اسی اجازت کو حدیث میں قرآن کریم کے ساتھ پڑنازل ہونیسے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن یہ اجازت ابتداء اسلام میں تھی بعد میں جب تک قرآنی لغت کے عادی ہو گئے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اجازت منسوخ ہو گئی، اور جب پڑھنے والی وفات پہلے رضائین حضرت جبرئیل سے قرآن کریم کا آخری ذکر کیا تو اس وقت یہ مرادفات منسوخ کر دیئے گئے، اور اب صرف ہی حرف باقی ہے جس پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، یعنی حرف قریش، باقی چھ مرادفات منسوخ ہو چکے،

یہ قول حافظ ابن جریر کے قول کے مقابلہ میں اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں صحابہ کرام کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی گئی کہ چھ حروف انہوں نے ترک کئے بلکہ نسخ کی نسبت خود عہد رسالت کی طرف کی گئی ہے، لیکن اُس پر ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ اس قول کے مطابق چھ حروف منزل من اللہ نہیں تھے، حالانکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ کے درمیان جو اختلاف پیش آیا اس میں حضرت ہشامؓ نے حضور کے سامنے سورۃ فرقان اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، تو اُسے سنکر آپ نے فرمایا، هَكَذَا اُنزِلَتْ (یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے) اور پھر حضرت عمرؓ نے اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، اُسے سنکر بھی آپ نے فرمایا هَكَذَا اُنزِلَتْ (یہ سورت اسی طرح نازل کی گئی ہے) ان الفاظ کا کھلا ہوا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقے منزل من اللہ تھے،

دوسرے جیسا کہ سچھے عرض کیا گیا اس قول میں بھی قرآات کی حیثیت واضح نہیں

ہوتی کہ وہ سات حروف میں داخل تھیں یا نہیں، اگر داخل تھیں تو چھ حروف کی طرح ان کے بارے میں بھی یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ منزل من اللہ نہیں ہیں، حالانکہ یہ اجماع کے خلاف ہے، اور اگر داخل نہیں تھیں تو ان کے علاوہ وجود پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس قول پر بھی شرح صدر نہیں ہوتا،

سب سے بہتر قول تیسرا قول جو سب سے زیادہ اطمینان بخش اور بے غبار ہے وہ یہی ہے کہ سات احرف سے مراد چونکہ اختلافِ قرارت ہی کی سات

مختلف نوعیتیں ہیں جن کا ذکر پچھے آچکا ہے، اس لئے یہ ساتوں حروف آج بھی پوری طرح محفوظ ہیں اور باقی ہیں، اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے، البتہ اتنا فرق ضرور ہوا کہ ابتداءء سلام میں قرارتوں کے اختلافات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان میں مراد الفاظ کے اختلاف کی کثرت تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لغتِ قرآن کے پوری طرح عادی نہیں ہوتے انھیں زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے، بعد میں جب اہل عرب لغتِ قرآن کے عادی ہو گئے تو مرادفات وغیرہ کے بہت سے اختلافات ختم کر دیئے گئے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے جو آخری دور کیا، (اور جسے اصطلاح میں عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے) اُس وقت بہت سی قرارتیں منسوخ کر دی گئیں، جس کی دلیل آگے آرہی ہے، لیکن جتنی قرارتیں اُس وقت باقی رہ گئیں وہ ساری کی ساری آج تو اتر کے ساتھ چلی آتی ہیں، اور ان کی تلاوت ہوتی ہے،

”أحرف سبعہ“ کی چھپیدہ بحث میں یہ وہ بے غبار رہتے، جو جس پر تمام روایات حدیث بھی اپنی اپنی جگہ صحیح بیٹھ جاتی ہیں، اور نہ ان میں کوئی تعارض یا اختلاف باقی رہتا ہے، اور نہ کوئی اور معقول اشکال پیش آتا ہے، اس سلسلے میں ممکنہ شبہات کا جواب ہم آگے تفصیل کے ساتھ دیں گے، جس سے اُس قول کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو سکے گی، لیکن پہلے یہ سن لیجئے کہ اس قول کے قائل کون حضرات ہیں؟ یہاں ہم ان حضرات کے اسمائے گرامی اور حوالے پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اس قول کو اختیار کیا ہے یا حافظ ابن جریر طبری کی تردید کی ہے:-

اس قول کے قائلین | حافظ ابوالخیر محمد بن الجوزیؒ نے جو قرآت کے اہم اعظم مشہور ہیں، اور حدیث وفقہ میں حافظ ابن کثیرؒ کے شاگرد اور حافظ ابن حجرؒ کے استاذ ہیں، اپنی مشہور کتاب ”النشر فی القرات العشر“ میں تحریر فرماتے ہیں:-

”اما كون المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الاحرف السبعة فان هذه مسألة كبيرة اختلف العلماء فيها فذهب جماعات من الفقهاء والقراء والمتكلمين الى ان المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الاحرف السبعة وبنوا ذلك على انه لا يجوز على الامة ان تشمل نقل شيء من الحروف السبعة التي نزل القرآن بها وقد اجمعت الصحابة على نقل المصاحف العثمانية من الصحف التي كتبها ابو بكر وعمر وارسال كل مصحف منها الى مصر من امصار المسلمين واجمعوا على ترك ما سوى ذلك، قال هؤلاء ولا يجوز ان ينهى عن القراءة ببعض الاحرف السبعة ولا ان يجمعوا على ترك شيء من القرآن، وذهب جماهير العلماء من السلف والخلف واعمة المسلمين الى ان هذه المصاحف العثمانية مشتملة على ما يحتمل رسمها فقط جامعة للعرضة الاخيرة التي عرضها النبي صلى الله عليه وسلم على جبرئيل عليه السلام متضمنة لها لم تنزل حرفاً منها، قلت وهذا القول هو الذي يظهر صوابه لان الاحاديث الصحيحة والاحاد المشهورة المستفيضة تدل عليه وتشهد له“

”رہا یہ مسئلہ کہ حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف تیار فرمائے تھے وہ ساتوں حرفوں پر مشتمل ہیں یا نہیں؟ سو یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جن میں علماء کا اختلاف ہے،

چنانچہ فقہائے تراز اور متکلمین کی جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساقوں حروف پر مشتمل ہیں، اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اُمت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کو نقل کرنا ترک کر دے جن پر قرآن نازل ہوا، اور صحابہ نے اجماعی طور پر یہ عثمانی مصاحف اُن صحیفوں سے نقل کئے تھے جو حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ نے لکھے تھے، اور اُن میں ہر ایک مصحف عالم اسلام کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تھا، اور اُن کے ماسوا جتنے صحیفے تھے اُن کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہ یہ بات جائز ہے کہ حروفِ سبعة میں سے کسی حرف کی قرأت روک دی جائے، اور نہ یہ کہ صحابہؓ قرآن کے کسی حصہ کے چھوڑنے پر متفق ہو جائیں، اور سلف و خلف کے علماء کی اکثریت کا قول یہی ہے، کہ یہ عثمانی مصاحف اُن حروف پر مشتمل ہیں جو اُن کے رسم الخط میں سما گئے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا، اُس کے تمام حروف ان مصاحف میں جمع ہیں، اُن میں سے کوئی حرف ان مصاحف میں نہیں چھوٹا، میرا خیال یہ ہے کہ یہی وہ قول ہے جس کی صحت ظاہر ہے، کیونکہ صحیح احادیث اور مشہور آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں اور اسی کی شہادت دیتے ہیں ۱۱

اور علامہ بدر الدین عینیؒ نقل فرماتے ہیں :-

واختلف الاصوليون هل يقرأ اليوم على سبعة أحرف فمنعه
الطبري وغيره وقال انما يجوز بحرف واحد اليوم وهو حرف
زيد ونحوه اليه القاضي ابوبكر، وقال ابو الحسن الأشعري
اجمع المسلمون على انه لا يجوز حفظ ما وسعه الله تعالى
من القرآءة بالأحرف التي انزلها الله تعالى ولا يسوغ للائمة

ان تمنع ما بطلقه الله تعالى، بل هي موجودة في قراءتنا مفترقة
 في القرآن غير معلومة فيجوز على هذا، وبه قال القاضي ان
 يقرباً بكل ما نقله اهل التواتر من غير تمييز حرف من حرف
 في حفظ حرف ناظم بحرف الكسائي وحزنة ولا حرج في ذلك^١۔
 ”اور اس بارے میں اصول علماء کا اختلاف ہے، کہ قرآن کریم کو آج سات حروف پر
 پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ علامہ (ابن جریر) طبری وغیرہ نے اس سے انکار
 کیا ہے اور کہا ہے کہ آج قرآن کی قراءت ایک ہی حرف پر جائز ہے، اور وہ حضرت
 زید بن ثابتؓ کا حرف ہے، اور قاضی ابوبکرؓ بھی اسی طرف مائل ہیں، لیکن امام
 ابوالحسن شہریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
 جو حروف نازل کر کے اُمت کو سہولت عطا فرمائی تھی اسے روکنا کسی کے لئے
 جائز نہیں اور اُمت اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ جس چیز کی اجازت اللہ نے
 دی ہو اسے روک دے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ^٢
 میں موجود ہیں، اور قرآن کریم میں متفرق طور سے شامل ہیں، البتہ معین طور سے
 معلوم نہیں، اس لحاظ سے اُن کی قراءت آج بھی جائز ہے، اور یہی قول قاضی^٣
 کا ہے، جتنے حروف تواتر کے ساتھ منقول ہیں اُن سب کو پڑھنا جائز ہے، اور ایک
 حرف کو دوسرے حرف سے ممتاز کرنے کی بھی ضرورت نہیں، چنانچہ نافعؓ کی
 قراءت کو کسائیؒ اور حمزہؒ کی قراءت کے ساتھ مخلوط کر کے یاد کر لیا جائے تو
 اس میں کچھ حرج نہیں ہے^٤۔

اور علامہ بدرالدین زرکشیؒ قاضی ابوبکرؓ کا قول نقل کرتے ہیں :-

لعمدة القاری، کتاب الخصومات، ص ۲۵۸ ج ۱۲ :

لہ غالباً قاضی عیاضؒ مراد ہیں،

لہ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو النشر فی القراءات العشر، ص ۱۸ و ۱۹ ج ۱

والسابع اختاره القاضي ابوبکر، وقال: الصحيح ان هذه الاحرف
السبعة ظهرت واستفاضت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم
وضبطها عنه الائمة واشبهتها عثمان^{رضي} والصحابة^{رضي} في المصحف^{رضي}
ساتوا قول قاضي ابوبکر^{رضي} نے اختیار کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ ساتوں
حروف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہرت کے ساتھ منقول ہیں، ائمہ نے انہیں
محفوظ رکھا ہی، اور حضرت عثمان^{رضي} اور صحابہ نے انہیں مصحف میں باقی رکھا ہے۔

اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حافظ ابن جریر کے قول کی بڑے سخت الفاظ
میں تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کچھ حروف کو ختم کرنے کا قول بالکل غلط ہے، اور اگر
حضرت عثمان^{رضي} ایسا کرنا بھی چاہتے تو نہ کر سکتے، کیونکہ عالم اسلام کا چپہ چپہ ان حروف
سب کے حافظوں سے بھرا ہوا تھا، وہ لکھتے ہیں:-

وأما قول من قال ابطال الاحرف الستة فقد كذب من قال
ذلك ولو فعل عثمان^{رضي} ذلك او اراده لخرج عن الاسلام ولما
مطل ساعة بل الاحرف السبعة كلها موجودة عندنا قاضية كما
كما كانت مثبتة في القرآت المشهورة المأثورة^{رضي}،

ترہا یہ قول کہ حضرت عثمان^{رضي} نے کچھ حروف کو منسوخ کر دیا تو جس نے یہ بات کہی
ہے اس نے بالکل غلط کہا ہے، اگر حضرت عثمان^{رضي} ایسا کرتے یا اس کا ارادہ کرتے
تو ایک ساعت کے توقف کے بغیر اسلام سے خارج ہو جاتے، بلکہ واقعہ یہ ہے

لہ البرهان فی علوم القرآن، ص ۲۲۳ ج ۱، علامہ غالباً قاضی ابوبکر باقلانی^{رضي} تکرار ہیں، کیونکہ یہی عبارت

علامہ نووی نے قاضی باقلانی کے نام سے روایت کی ہے (نووی شرح مسلم، ص ۲، ۳ ج ۱)

علامہ ابن حزم: الفصل فی الملل والایہواء والنحل، ص ۷۷، ۷۸ ج ۲ مکتبۃ المثنیٰ بغداد،

علامہ ابن حزم^{رضي} کا یہ قول اس صورت میں ہے جبکہ یوں کہا جا کہ حضرت عثمان^{رضي} نے (معاذ اللہ)

کچھ حروف کو منسوخ کر دیا، لیکن واضح رہے کہ حافظ ابن جریر کے قول کے مطابق انہوں نے کچھ حروف

کو منسوخ نہیں کیا بلکہ انکی قرأت ترک فرمائی تھی، اس لئے اگرچہ حافظ ابن جریر طبری کا قول درست

ہو لیکن وہ اتنے سخت الفاظ کے... مستحق نہیں ہیں،

کے ساتوں کے ساتوں حروف ہمارے پاس بعینہ موجود اور مشہور اور قرأتوں

میں محفوظ ہیں۔

اور مشہور شارح موطاء علامہ ابوالولید باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۹۷ھ) نے
سبباً احرف کی تشریح سات وجوہ قرأت سے کرنے کے بعد لکھے ہیں :-

فان قيل هل تقولون ان جميع هذه السبعة الاحرف ثابتة في
المصحف فان القراءة بجميعها جائزة قيل لهم كذلك نقول،
والدليل على صحة ذلك قوله عز وجل **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ
وَ اِنَّا لَهُ لَعَا فِطْوٰنٌ**، ولا يصح انفصال النكروا المنزل من قوله
فيكون حفظه دونها وهما يدل على صحة ما ذهبنا اليه ان
ظاهر قول النبي صلى الله عليه وسلم يدل على ان القرآن
انزل على سبعة احرف تيسيراً على من اراد قراءته ليقرا
كل رجل منهم بما تيسر عليه وبما هو اخف على طبعه و
اقرب الى لفظه لما يلحق من المشقة بذلك المألوف
من العادة في النطق ونحن اليوم مع عجمة السنننا و
بعدنا عن فصاحة العرب احوج^{له}،

” اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا آپ کا قول یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف مصحف میں
راج بھی موجود ہیں، اس لئے کہ ان سب کی قرأت (آپ کے نزدیک)
جائز ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ جی ہاں ہمارا قول یہی ہے، اور اس کی صحت کی
دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ
لَعَا فِطْوٰنٌ**۔ وہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے
والے ہیں، اور قرآن کریم کو اس کی قرأت سے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن تو

محفوظ رہا اور اس کی قرارات ختم ہو جائیں اور ہمارے قول کی صحت پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کھلے طور پر رد لالت کرتا ہے کہ قرآن کو سات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا تاکہ اس کی قرارت کرنے والے کو آسانی ہو تاکہ ہر شخص اس طریقہ سے تلاوت کر سکے جو اس کے لئے آسان ہو اس کی طبیعت کے لحاظ سے زیادہ سہل اور اس کی لغت سے زیادہ قریب ہوا کیونکہ گفتگو میں جو عادت پڑ جاتی ہے اُسے ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے، اور آج ہم لوگ اپنی زبان کی عجیبت اور عربی فصاحت سے دور ہونے کی بنا پر اس سہولت کے زیادہ محتاج ہیں۔

اور حضرت امام غزالیؒ "اصول فقہ" پر اپنی مشہور کتاب "المستصفیٰ" میں قرآن کریم کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:-

ثُمَّ نَقَلَ الْيَسَابِينَ دَفْعِي الْمَصْحَفِ عَلَى الْأَحْرَفِ السَّبْعَةِ الْمَشْهُورَةِ
نَقْلًا مُتَوَاتِرًا^{لہ}

"وہ کلام جو صحیفہ کی دو روایتوں میں مشہور سات حروف کے مطابق متواتر نقل پر ہم تک پہنچا ہے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام غزالیؒ بھی حروف سبوع کے آج تک باقی رہنے کے قائل ہیں، اور ملا علی قاریؒ "موتوفی ۱۰۱۴ھ" تحریر فرماتے ہیں:-

"وَكَاثِبَةٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالسَّلَامُ كَشَفَ لَهُ أَنَّ الْقِرَاءَةَ الْمَتَوَاتِرَةَ تَسْتَقِرُّ
فِي أُمَّتِهِ عَلَى سَبْعٍ وَهِيَ الْمَوْجُودَةُ الْآنَ الْمَتَّفِقَةُ عَلَى تَوَاتُرِهَا وَالْجَمْعُ
عَلَى أَنَّ مَا فَوْقَهَا شَاذٌ لَا يَحِلُّ الْقِرَاءَةَ بِهِ"

"اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ منکشف ہو گیا تھا، کہ

لہ المستصفیٰ، ص ۱۵ ج ۱، المكتبة التجارية الكبرى، مصر ۱۳۵۶ھ

لہ مرقاة المفاتیح، ص ۱۶ ج ۵، مکتبۃ المدادیہ ملتان، ۱۳۸۴ھ

مواثر قراءتیں آپ کی اُمت میں آخر کار سنا رہ جائیں گی، چنانچہ وہی آج موجود ہیں اور اُن کے مواثر پر اتفاق ہے، اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس کے علاوہ جو قراءتیں ہیں وہ سناذ ہیں اور اُن کی تلاوت جائز نہیں،

اس میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا تو درست نہیں ہے کہ سناذ قراءتوں کے ماسوا جتنی قراءتیں ہیں وہ سب سناذ ہیں، کیونکہ علماء قراءت نے اس کی سخت تردید کی ہے، لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک احرفِ سبعہ آج بھی باقی ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا قول صحیح گنہگار چکا ہے، کہ وہ سبعہ احرف میں سناذ کے عدد کو کثرت کے معنی پر محمول کرتے ہیں، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

”و دلیل بر آنکہ ذکر سبعہ بحجت تکثیر است نہ برائے تحدید اتفاق ائمہ است بر قراءت عشر و ہر قراءتے را ازین عشرہ دورادی ست دہریکے بادیگرے مختلف ست پس مرتقی شد عدد قراءتہ تا بیست“

”اور اس بات کی دلیل کہ سات کا عدد حدیث میں تکثیر کے لئے ہے نہ کہ تحدید کے لئے دس قراءتوں پر ائمہ کا اتفاق ہے، اور اُن دس قراءتوں میں سے ہر ایک کے دوراوی ہیں، اور ہر ایک دس سے مختلف ہے، پس قراءت کی تعداد بیس تک پہنچ گئی ہو“

اس عبارت میں اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ ”سبعہ“ کو جمہور کے خلاف تکثیر کے لئے قرار دیا ہے، (کیونکہ شاید بین قراءتوں کو سناذ وجوہ اختلاف میں منحصر قرار دینا ان پر واضح نہیں ہو سکا) لیکن اس سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جن حروف کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قراءتیں ہی ہیں، اور وہ منسوخ یا متروک نہیں ہوتے، بلکہ آج بھی باقی ہیں

آخری دور میں دینی علوم کے امام، محقق عصر، اور حافظ حدیث حضرت علامہ
 اور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے مسئلہ کی
 حقیقت مختصر الفاظ میں اس طرح واضح فرمادی ہے کہ اُسے حروفِ آخر کہنا چاہئے، یہاں
 ہم اُن کی پوری تحقیق نقل کرتے ہیں:-

واعلم انهم اتفقوا على انه ليس المراد من سبعة احرف القراءة
 السبعة المشهورة، بان يكون كل حرف منها قراءة من تلك
 القراءات، اعنى انه لا انطباق بين القراءات السبع والاحرف
 السبعة كما يذهب اليه الوهم بالنظر الى لفظ السبعة في
 الموضوعين، بل بين تلك الاحرف والقراءة عموم وخصوص
 وجهي، كيف، وان القراءات لا تنحصر في السبعة، كما صرح
 ابن الجزري في رسالة النشر في قراءة العشر، وانما اشهرت
 السبعة على الالسنه لانها التي جمعها الشاطبي ثم اعلم
 ان بعضهم فهم ان بين تلك الاحرف تغاير من كل وجه،
 بحيث لا يربط بينها وليس كذلك، بل قد يكون الفرق بالجزء
 والمزيد واخرى بالابواب، ومرة باعتبار الصيغ من الغائب
 والحاضر، وطورا بتحقيق الهنزة وتسهيلها، فكل هذه
 التغييرات يسيرة او كانت او كثيرة حرف برأسه، وغلط من
 فهم ان هذه الاحرف متغايرة كلها بحيث يتعذر اجتماعها
 اما انه كيف عد السبعة فتوجه اليه ابن الجزري وحقق
 ان التصرفات كلها ترجع الى السبعة وراجع القسطلاني و
 الذرقاني، بقي الكلام في ان تلك الاحرف كلها موجودة او رفع
 بعضها وبقى البعض فاعلم ان ما قرأه جبرئيل عليه السلام
 في العرش الاخيرة على النبي صلى الله عليه وسلم كلمة

ثابت فی مصحف عثمانؓ، ولما يتعین معنی الاحرف عند ابن جریر
 ذهب الی رفع الاحرف الست منها وبقی واحد فقط^۱
 یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ تمام علماء اس بآپر تو متفق ہیں کہ سات حروف سے مراد
 مشہور سات قرآتیں نہیں اور یہ بات نہیں ہے کہ ہر حرف ان سات قرآتوں
 میں سے ایک قرأت ہو، مطلب یہ ہے کہ سات قرآتیں اور سات حروف ایک
 چیز نہیں جیسے کہ سات کے لفظ سے پہلی نظر میں دہم ہوتا ہے، بلکہ ان حروف اور
 سات قرآتوں میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے، اور یہ دونوں ایک کیسی
 ہو سکتے ہیں جبکہ قرآتیں سات میں مختصر نہیں، جیسا کہ علامہ ابن المحرز نے
 المنشر فی قرآۃ العشر میں تصریح کی ہے، البتہ سات قرآتوں کا لفظ زبان پر
 اس لئے مشہور ہو گیا کہ علامہ شاطبی نے انہی سات قرآتوں کو جمع کیا ہے،
 پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ بعض لوگ یہ سمجھے ہیں کہ سات حروف کے درمیان
 کئی تغایر ہے، اور ان میں کوئی باہم ربط نہیں ہے، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں
 بلکہ بعض اوقات دو حروف میں فرق صرف صیغہ مجزؤ اور صیغہ مزید کا ہوتا
 ہے اور بعض مرتبہ صرف (صرفی) ابواب کا، اور بعض دفعہ غائب و حاضر کے
 صیغوں کا اور کبھی صرف ہمزہ کو باقی رکھنے اور اس کی تسہیل کرنے کا، پس یہ
 تمام تغیرات خواہ معمولی ہوں یا بڑے بڑے مستقل حروف ہیں، اور جو لوگ یہ سمجھ
 ہیں کہ حروف کے درمیان کئی تغایر ہے، اور ان کا (ایک کلمہ میں) جمع ہونا ممکن

۱۱ فیض الباری، ص ۳۲۱، ۳۲۲ ج ۳، ۱۱ مطلب یہ ہے کہ سات قرآتوں میں سے بعض قرآتیں
 احرف سبعہ میں سے ہیں، جیسے کہ تمام متواتر قرآئت اور بعض قرآتیں ایسی ہیں جو احرف سبعہ میں داخل
 نہیں، مثلاً قرآۃ سبعہ کی شاذ قرآتیں، یا وہ قرآتیں جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور احرف سبعہ
 کے بعض اختلافات ایسے ہیں جو قرآۃ سبعہ میں شامل نہیں، مثلاً امام یعقوبؒ، امام ابو جعفرؒ اور
 خلف کی متواتر قرآتیں کہ یہ احرف سبعہ میں سے ہیں، مگر معروف قرآۃ سبعہ میں سے نہیں ۱۲ حضرت

ان سے غلطی ہوئی ہے، رہی یہ بات کہ حدیث میں سات کے عدد کا کیا مطلب ہے؟ سو اس کا جواب علامہ ابن الجوزی نے دیا ہے، اور تحقیق یہ بیان کی ہے کہ یہ سارے تغیرات سات قسم کے ہیں، اور اس مسئلہ میں قسطلانی اور زقانی کی مراجعت بھی کر لیجئے،

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ تمام حروف موجود ہیں، یا ان میں سے بعض ختم کر دیئے گئے، اور بعض باقی ہیں، پس یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جتنے حروف حضور کے ساتھ قرآن کے ذور میں پڑھے تھے وہ سب حضرت عثمان کے مصحف میں موجود ہیں، اور چونکہ علامہ ابن جبرئیل پر حروف کے معنی واضح نہیں ہو سکے، اس لئے انھوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا کہ کچھ حروف ختم ہو گئے، اور صرف ایک باقی رہ گیا،

اسی طرح مصر کے علماء متاخرین میں سے مشہور محقق علامہ زاہد الکوثری (متوفی ۱۳۳۸ھ) تحریر فرماتے ہیں :-

والدول رأی القائلین بان الاحرف السبعة كانت في ميد
الامر ثم نسخت بالعرضة الاخيرة في عهد النبي صلى الله
عليه وسلم فلم يبق الاحرف واحد ورأى القائلين بان
عثمان رضي الله عنه، جمع الناس على حرف واحد ومنع من
الستة الباقية لمصلحة، واليه نحا ابن جبرئيل وتهيئته
ناس فتابعوه لكن هذا رأی خطير قام ابن حزم باشد
النكير عليه في الفصل وفي الاحكام وله الحق في ذلك والنتيجة
رأى القائلين بانها هي الاحرف السبعة المحفوظة كما هي
في العرضة الاخيرة، الخ

”پہلی رائے (کہ موجودہ قرآت ایک ہی حرف کی مختلف شکلیں ہیں) اُن حضرات کی ہر جویہ کہتے ہیں کہ سات حروف ابتداء اسلام میں تھے، پھر عوضہ اخیرہ (حضرت جبریلؑ سے حضورؐ کے آخری دور) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں منسوخ ہو گئے، اور اب صرف ایک باقی رہ گیا، نیز یہی رائے اُن حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک حرف پر جمع کر دیا تھا، اور ایک مصلحت کی وجہ سے باقی چھ حروف کی قرابت روک دی تھی، حافظ ابن جریرؒ کا یہی مسلک ہے، اور بہت سے لوگ اس معاملہ میں اُن سے مرعوب ہو کر اُن کے پیچھے لگ گئے، لیکن درحقیقت یہ بڑی سنگین اور خطرناک رائے ہے، اور علامہ ابن حزمؒ نے ”الفصل“ اور ”الاحکام“ میں اس پر سخت ترین نیکر ہے، جس کا انھیں حق تھا، اور دوسری رائے (کہ موجودہ قرآت ہی) احرافِ سبعہ ہیں، اُن حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہی وہ حروف ہیں جو عوضہ اخیرہ کے مطابق محفوظ چلے آتے ہیں !

ہم نے یہ تمام اقوال تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کئے ہیں کہ آجکل علامہ ابن جریر طبریؒ کا قول ہی زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اور علامہ ابن جریرؒ کی جلیل القدر شخصیت کے پیش نظر اسے عموماً ہر شک و شبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے، اس کی بناء پر ابن الجزریؒ کا یہ بے غبار قول یا تو لوگوں کو معلوم نہیں ہے، یا اگر معلوم ہے تو اسے ایک ضعیف قول سمجھا جاتا ہے، حالانکہ گذشتہ بحث کی روشنی میں یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ امام مالکؒ، علامہ ابن قتیبہؒ، علامہ ابو الفضل رازیؒ، قاضی ابو بکر ابن الطیبؒ، امام ابو الحسن شعریؒ، قاضی عیاضؒ، علامہ ابن حزمؒ، علامہ ابو الولید باجیؒ، امام غزالیؒ اور ملا علی قاریؒ جیسے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ساتوں حروف آج بھی محفوظ اور باقی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عوضہ اخیرہ کے وقت جتنے حروف باقی رہ گئے تھے اُن میں سے کوئی نہ منسوخ ہوا، نہ اسے ترک کیا گیا، بلکہ محقق ابن الجزریؒ نے اپنے اس قول کو اپنے سے پہلے جمہور علماء کا

مسلک قرار دیا ہے، علماء متاخرین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور علامہ زاہد کوثریؒ کا بھی یہی قول ہے، نیز مصر کے مشہور علماء، علامہ محمد نجیح مطیعیؒ، علامہ خضریٰ دمیاطیؒ اور شیخ عبد العظیم زرقانی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، لہذا دلائل سے قطع نظر، محض شخصیات کے لحاظ سے بھی یہ قول بڑا وزنی قول ہے،

اُس قول کے دلائل | اب وہ دلائل ذیل میں پیش خدمت ہیں جن سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، اس کے کچھ دلائل تو مذکورہ بالا

اقوال میں آچکے ہیں، مزید مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- قرآن کریم کی آیت **إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَحْنُ أَلَمَّا لَمْ كُنَّا** دَائِلَةٌ لِحَافِظُونَ

(ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جو آیات قرآنی خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ نہ فرمائی ہوں وہ قیامت تک باقی رہیں گی، دوسری طرف پیچھے وہ احادیث گزر چکی ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ قرآن کے ساتوں حروف منزل من اللہ تھے، اس کو مذکورہ آیت کا واضح تقاضا یہی ہے کہ وہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں

۲- اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف

پر مصحف تیار کیا ہوتا تو اس کی کہیں کوئی صراحت تو ملنی چاہئے تھی، حالانکہ نہ صرف

اس کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحف

عثمانی میں ساتوں حروف موجود تھے، مثلاً روایات میں یہ تصریح ہے کہ حضرت

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا مصحف حضرت ابو بکرؓ کے جمع فرمودہ صحیفوں

کے مطابق لکھوایا تھا، اور لکھنے کے بعد دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا، جس کے بار

میں خود حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں:-

فرضت المصحف علیہا فلم یختلفنا فی شئی، لہ
 ”میں نے مصحف کا مقابلہ ان صحیفوں سے کیا تو دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا“

اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر رطبریؒ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ساتوں حروف موجود تھے، اس لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں قرآن کریم کو لکھنا ان ساتوں حروف پر لکھا گیا ہوگا، لہذا اگر حضرت عثمانؓ نے کچھ حروف کو ختم کر دیا ہوتا تو حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ ارشاد کیسے درست ہو سکتا ہے کہ ”دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا“

۳۔ علامہ ابن الانباریؒ نے کتاب المصاحف میں حضرت عبیدہ سلمانیؓ کا جو مشہور تابعی ہیں یہ قول نقل فرمایا ہے :-

قرأتنا التي جمع الناس عثمانؓ علیہا ہی العرصة الاخری
 ”ہماری وہ قرأت جس پر حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع فرمایا وہ عرصة اخیرہ کی قرأت تھی“

حضرت عبیدہؓ کا یہ قول اس بات پر بالکل صریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان حروف میں سے کوئی نہیں چھوڑا، جو عرصة اخیرہ (حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ حضورؐ کے آخری قرآنی دور) کے وقت باقی تھے، اس پر بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ کا آخری دور صرف ایک حرف قریش پر ہوا تھا، اور اسی پر حضرت عثمانؓ نے سب کو جمع کر دیا، لیکن یہ بات بہت بعید ہے کہ جو حروف منسوخ نہیں ہوئے تھے وہ اس دور سے خارج رہے ہوں،

۵۔ حضرت محمد بن سیرینؒ بھی مشہور تابعی ہیں، علامہ ابن سعدؒ نے ان کا یہ قول

۱۔ مشکل الآثار، ص ۱۹۳ ج ۴، ۲۔ کنز العمال، حدیث نمبر ۴۸۲۰ ج ۱، دائرۃ المعارف
 دکن ۳۱۳، یہی روایت حافظ ابن حجرؒ نے بھی مندرجہ ابن ابی داؤدؒ اور طبریؒ کے حوالہ سے
 نقل کی ہے (فتح الباری، ص ۳۶ ج ۱)۔

نقل فرمایا ہے:-

«كان جبرئيل يعرض القرآن على النبي صلى الله عليه وسلم كل عام مرة في رمضان فلما كان العام الذي توفي فيه عرضه عليه مرتين، قال محمد، فأنا رجوان تكون قراءتنا العرصة الاخيرة»^۱

حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ رمضان میں حضور کے سامنے قرآن پیش کیا کرتے تھے، چنانچہ جب وہ سال آیا جس میں آپ کی وفات ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو مرتبہ قرآن پیش کیا، پس مجھے امید ہے کہ ہماری موجودہ قرات اس عرضہ اخیرہ کے مطابق ہے۔

۶۔ حضرت عامر شعبیؓ بھی مشہور تابعی ہیں، اور انھوں نے اس صحابہ سے استفادہ کیا ہے، علامہ ابن الجوزی نے ان سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے، یہ تینوں حضرات تابعی ہیں اور حضرت عثمان کے عہد سے ہنایت قریب ہیں، اس لئے ان کا قول اس باب میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے،

۷۔ پورے ذخیرہ احادیث میں ہمیں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک سات حروف کا اختلاف اور دوسرے قراءتوں کا اختلاف، اس کے بجائے بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں، کیونکہ ایک ہی قسم کے اختلاف پر سب وقت اختلاف قرات اور اختلاف احرف دونوں الفاظ کا اطلاق کیا گیا ہے، مثال کے طور پر حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں:-

كُنْتُ بِالْمَسْجِدِ فَدْخَلَ رَجُلٌ يَصَلِّيَ فَقَرَأَ قِرَاءَةً اُنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ وَ

۱۔ ابن سعد: الطبقات الكبرى، ص ۱۹۵ ج ۲ جزو ۶ دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ

ودخل اخر قراءة سوى قراءة صاحبه فلما قطينا الصلوة
 ادخلنا جميعاً على رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت ان
 هذا اقرأ قراءة انكروها عليه ودخل اخر فقرا قراءة سوى
 قراءة صاحبه فامرهما رسول الله صلى الله عليه وسلم فقرا
 فحسن النبي صلى الله عليه وسلم شأنهما فسقط في نفسي
 من التكذيب ولا اذ كنت في الجاهلية فلما رأي رسول الله صلى
 الله عليه وسلم ما قد غشيتني ضرب في صدرى ففضت
 عرقاً وكأنا النظر الى الله فرفقا فقال لي يا أبا ان ربي عز وجل
 ارسل الى ان اقرأ القرآن الى حرف فرددت اليه ان هون
 على أمتي فردّ الى الثانية اقرأه على حرفين فرددت اليه
 ان هون على أمتي فردّ الى الثالثة اقرأه على سبعة احرف
 عني مسجد من تھا کہ ایک شخص داخل ہو کر نماز پڑھنے لگا، اس نے ایک ایسی قرأت
 پڑھی جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کی
 قرأت کے سوا ایک اور قرأت پڑھی، پس جب ہم نے نماز ختم کرنی تو ہم سب
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، میں نے عرض کیا کہ اس شخص
 نے ایک ایسی قرأت پڑھی ہے جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص
 آیا اس نے پہلے شخص کی قرأت کے سوا ایک دوسری قرأت پڑھی، اس پر
 آپ نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا، ان دونوں نے قرأت کی تو حضور نے
 دونوں کی تحسین فرمائی، اس پر میرے دل میں تکذیب کے ایسے دوسے آنے لگے
 کہ جاہلیت میں بھی ایسے خیالات نہیں آئے تھے، پس جب رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم نے میری حالت دیکھی تو میرے سینے پر مارا جس سے میں پسینہ میں

میں مشرا بور ہو گیا، اور خوف کی حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اللہ کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ اے ابی! میرے پروردگار نے میرے پاس پیغام بھیجا تھا، کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی فرمائیے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں قرآن دو حرفوں پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی فرمائیے، تو اللہ تعالیٰ نے تیسری بار پیغام بھیجا کہ میں اسے سات حرفوں پر پڑھوں ۱۱

اس روایت میں حضرت ابی بن کعبؓ دونوں اشخاص کے اختلاف تلاوت کو بار بار اختلاف قراءت سے تعبیر فرما رہے ہیں، اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کے اختلاف سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ قراءت کے اختلاف اور حروف کے اختلاف کو عہد رسالت میں ایک ہی چیز سمجھا جاتا تھا، اور اس کے خلاف کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو دونوں کی جداگانہ حیثیت پر دلالت کرتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، اور جب قراءت کا محفوظ ہونا تو اترا اور اجماع سے ثابت ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ احرف سبعہ آج بھی محفوظ ہیں،

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حروف سبعہ کا جتنا حصہ عرضہ اخیرہ کے وقت باقی رہ گیا تھا وہ سارا کا سارا عثمانی مصاحف میں محفوظ کر لیا گیا تھا، اور وہ آج تک محفوظ چلا آتا ہے، نہ اسے کسی نے منسوخ کیا اور نہ اس کی قراءت ممنوع قرار دی گئی، لیکن ضروری ہے کہ مکمل وضاحت کے لئے ان ممکنہ سوالات کا جواب بھی دیا جائے جو اس قول پر وارد ہو سکتے ہیں،

اس قول پر وارد ہونے والے (۱) اس قول پر سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساتوں حروف کو باقی رکھا ہے تو پھر ان کا وہ امتیازی کا نامہ کیا تھا جسکی سوالات اور ان کا جواب

درج سے اُن کو ”جامع قرآن“ کہا جاتا ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم بے شمار صحابہ کو پورا یاد تھا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم کا معیاری نسخہ صرف ایک تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتب فرمایا تھا، یہ نسخہ بھی مصحف کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ ایک ایک سُورۃ علیحدہ علیحدہ صحیفوں میں لکھی ہوئی تھی، لیکن بعض صحابہ نے انفرادی طور پر اپنے اپنے مصاحف الگ الگ تیار کر رکھے تھے، اُن میں نہ رسم الخط متحرک تھا، نہ سُورتوں کی ترتیب یکساں تھی، اور نہ ساتوں حروف جمع تھے، بلکہ ہر شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس حرف کے مطابق قرآن سیکھا تھا اسی کو اپنے طور پر لکھ لیا تھا، اس لئے کسی مصحف میں کوئی آیت کسی حرف کے مطابق لکھی ہوئی تھی، اور دوسرے مصحف میں کسی اور حرف کے مطابق، جب تک عبد رسالت قریب تھا اور مسلمانوں کا تعلق مرکز اسلام یعنی مدینہ طیبہ سے مضبوط اور مستحکم تھا، مصاحف کے اس اختلاف سے کوئی قابل ذکر خرابی اس لئے پیدا نہ ہو سکی کہ قرآن کریم کی حفاظت میں اصل مدار مصاحف کے بجائے حافظہ پر تھا، اور صحابہ کی اکثریت اس بات سے باخبر تھی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، لیکن جب اسلام دوردراز ممالک تک پھیلا اور نئے نئے لوگ مسلمان ہوئے تو انھوں نے صرف ایک ایک طریقے سے قرآن سیکھا، اور یہ بات ان میں عام نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس لئے ان میں اختلافات پیش آنے لگا، بعض لوگ اپنی قرأت کو حق اور دوسرے کی قرأت کو باطل سمجھنے لگے، اُدھر چونکہ انفرادی طور پر تیار کئے ہوئے مصاحف بھی، حرف اور رسم الخط کے اعتبار سے مختلف تھے، اور ان میں حروف سب سے بچا کرنے کا اہتمام نہیں تھا، اس لئے کوئی ایسا معیاری نسخہ ان کے پاس موجود نہیں تھا جس کی طرف رجوع کر کے اختلاف رفع کیا جاسکے،

ان حالات میں حضرت عثمان نے محسوس کیا کہ اگر یہ صورت حال برقرار رہی اور انفرادی مصاحف کو ختم کر کے قرآن کریم کے معیاری نسخہ عالم اسلام میں نہ پھیلا دئے گئے تو زبردست فتنہ رُو نما ہو جائے گا، اس لئے انھوں نے مندرجہ ذیل کام کئے :-

۱۔ قرآن کریم کے سات معیاری نسخے تیار کرانے اور انھیں مختلف اطراف میں روانہ کر دیا،

۲۔ ان مصاحف کا رسم الخط ایسا رکھا، کہ اس میں ساتوں حروف سما جائیں، چنانچہ یہ مصاحف نقطوں اور حرکات سے خالی تھے، اور انھیں ہر حرف کے مطابق پڑھا جاسکتا

۳۔ جتنے انفرادی مصاحف لوگوں نے تیار کر رکھے تھے ان سب کو نذر آتش کر کے دفن کر دیا،

۴۔ یہ پابندی عائد کر دی کہ آئندہ جتنے مصاحف لکھے جائیں وہ سب ان سات مصاحف کے مطابق ہونے چاہئے،

۵۔ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفے الگ الگ سورتوں کی شکل میں تھے، حضرت عثمانؓ نے ان سورتوں کو مرتب کر کے ایک مصحف کی شکل دیدی،

ان اقدامات سے حضرت عثمانؓ کا مقصد یہ تھا کہ پورے عالم اسلام میں رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں حرورت سب سے اس طرح جمع ہو جائیں کہ بعد میں کسی شخص کو کسی صحیح قرأت سے انکار کرنے یا غلط قرأت پر اصرار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے، اور اگر کبھی قرأت میں کوئی اختلاف رونما ہو تو مصحف کی طرف رجوع کر کے اُسے باسانی رفع کیا جاسکے،

یہ بات حضرت علیؓ کے ایک ارشاد سے واضح ہے جو امام ابن ابوداؤدؒ نے کتاب المصاحف میں صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے:-

قال علیؓ لا تقولوا فی عثمانؓ الا خیراً فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن الاملاتنا، قال، ما تقولون فی ہذا القرآن ءة فقد بلغنی ان بعضهم یقول ان قراءتی خیر من قراءتک، وھذا یکاد ان یکون کفراً، قلنا فماترتی؟ قال اری ان نجتمع الناس علی مصحف واحد فلا تكون فرقة ولا اختلاف، قلنا نعم ما رأیت،

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا، انھوں نے ہم سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ان قرأتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ دوسروں سے کہتے ہیں کہ ”میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے“ حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کفر کے قریب تک پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے حضرت عثمانؓ سے کہا: ”پھر آپ کی کیا رائے ہے؟“ انھوں نے فرمایا میری رائے ہے ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ پھر کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے، ہم سب نے کہا آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی ہے۔“

یہ حدیث حضرت عثمانؓ کے کام کے بارے میں واضح ترین حدیث ہے، اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ”تصحیح الناس علی مصحف واحد“ فرما کر یہ ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ ہم ایک ایسا مصحف تیار کرنا چاہتے ہیں جو پورے عالم اسلام کے لئے یکساں ہو، اور اس کے ذریعہ باہمی اختلافات کو ختم کیا جاسکے، اور اس کے بعد کسی صحیح قرأت کے انکار اور منسوخ یا شاذ قرأت پر اصرار کی گنجائش باقی نہ رہے،^۱ نیز ابن ابی شیبہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ:-

اختلفوا فی القرآن علی عهد عثمان حتی اقتتل الغلامان المعلومین
فیہ ذلک عثمان بن عفان فقال عندی تکنون وتلعنون فیہ
فمن نأی عتی کان أشد تکن بیئاً واکثر لحننا، یا اصحاب محمد
اجتمعوا فاکتبتوا للناس اماماً،

حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے بارے میں اختلاف ہوا، یہاں تک کہ بچے اور معلمین لڑنے لگے، یہ اطلاع حضرت عثمانؓ کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا

کہ تم میرے قریب رہتے ہوئے (صحیح قراءتوں کی) تکذیب کرتے ہو اور اس میں غلطیاں کرتے ہو، لہذا جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور غلطیاں کرتے ہوں گے، پس اے اصحابِ محمدؐ جمع ہو جاؤ اور لوگوں کے لئے ایک ایسا نسخہ تیار کرو جس کی اقتدار کی جائے،

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مقصد قرآن کے کسی حرف کا ختم کرنا نہیں تھا، بلکہ انھیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض لوگ صحیح حروف کا انکار کر رہے ہیں اور بعض لوگ غلط طریقے سے تلاوت پر اصرار کر رہے ہیں، اس لئے وہ ایک معیاری نسخہ تیار کرنا چاہتے تھے، جو پوری دنیا کے سلام کے لئے یکساں ہو۔

لغت قریش پر لکھنے کا مطلب (۲) یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح بخاریؒ کی روایت کے مطابق جس وقت حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی قیادت میں مصحفِ قرآنی مرتب کرنے کے لئے صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، تو ان سے فرمایا تھا:-

إذا اختلفتم انتم وزید بن ثابتؓ فی شیء من القرآن فاکتبوا
بلسان قریش فانما نزل بلسانہمؓ،

جب تمھارے اور حضرت زید بن ثابتؓ کے درمیان قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہوا تو اسے قریش کی زبان پر لکھنا، کیونکہ قرآن انہی کی زبان پر نازل ہوا ہے۔

یہ بہت سے علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل کی یہی تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہو الفصل فی الملل و
الابواء والنحل: ابن حزمؒ، ص ۷۷ ج ۱، مکتبۃ المثنیٰ بغداد، اور البیان فی علوم القرآن:
مولانا عبدالرحمن حقانی، باب نمبر ۲ فصل نمبر ۲، ص ۶۲ مطبوعہ نعیمیہ دیوبند و منہال العسرفان:
للرزقانی، ص ۲۲۸ تا ۲۵۶ ج ۱،

۱۔ صحیح بخاری، باب جمع القرآن مع فتح الباری ص ۱۶ ج ۱،

.... اگر حضرت عثمانؓ نے ساتوں حروف باقی رکھے تھے تو اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟
 اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی وہ جملہ ہے
 جس سے حافظ ابن جریرؒ اور بعض دوسرے علماء نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف
 ختم کر کے صرف ایک حرف قریش کو مصحف میں باقی رکھا تھا، لیکن درحقیقت اگر حضرت
 عثمانؓ کے اس ارشاد پر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب سمجھنا
 درست نہیں ہے کہ انھوں نے حرف قریش کے علاوہ باقی چھ حروف کو ختم فرمایا تھا بلکہ
 مجموعی روایات دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے حضرت عثمانؓ کا یہ مطلب
 تھا کہ اگر قرآن کریم کی کتابت کے دوران رسم الخط کے طریقے میں کوئی اختلاف ہو تو
 قریش کے رسم الخط کو اختیار کیا جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی اس ہدایت
 کے بعد صحابہؓ کی جماعت نے جب کتابت قرآن کا کام شروع کیا تو پورے قرآن کریم میں
 ان کے درمیان صرف ایک اختلاف پیش آیا، جس کا ذکر امام زہریؒ نے اس طرح فرمایا ہے:-

فَاخْتَلَفُوا يَوْمَئِذٍ فِي التَّابُوتِ وَالتَّابُوتِ فَقَالَ النَّبِيُّ الْقُرَشِيُّونَ
 التَّابُوتِ وَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ التَّابُوتُ فَرَفَعَ اخْتِلَافَهُمْ إِلَى عُمَرَ
 فَقَالَ اَكْتُبُوهُ التَّابُوتِ فَانَّهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ نَزَلَ

”چنانچہ اس موقع پر ان کے درمیان ”تابوت“ اور ”تابوتہ“ میں اختلاف ہوا،
 قریشی صحابہؓ کہتے تھے کہ تابوت (بڑی تار سے لکھا جائے) اور حضرت زید بن
 ثابتؓ فرماتے تھے کہ تابوتہ (گول تار سے لکھا جائے) پس اس اختلاف
 کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا جس پر انھوں نے فرمایا کہ
 اسے التابوت لکھو، کیونکہ قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا ہے۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت زیدؓ اور قریشی صحابہؓ
 کے درمیان جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے مراد رسم الخط کا اختلاف تھا نہ کہ لغات کا۔

۳) تیسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سبعتہٴ احرف کے اختلاف کی جو تشریح فرمائی ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات حروف مصاحب عثمانی میں شامل نہیں ہو سکے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں :-

مرادف الفاظ سے
تلاوت کا مسئلہ

ان جبریل قال یا محمد اقرأ القرآن علی حرف، قال میکائیل استزده حتی بلغ سبعة احرف، قال کلُّ شافٍ کافٍ ما لم تغلط اية عذاب برحمة اور رحمة لعذاب نحو قولک تعالٰی وَاَقْبِلْ وَهَلْمًا وَاذْهَبْ وَاَسْرِعْ وَعَجَلًا

جبرئیل علیہ السلام نے (حضور سے) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھئے، میکائیل علیہ السلام نے حضور سے کہا اس میں اضافہ کرو ایسے، یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تا وقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کریں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ تعالٰیٰ (آؤ) کے معنی کو اقبل، علم، اذہب، اسرع اور عجل کے الفاظ سے ادا کریں،

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبعتہٴ احرف کا اختلاف درحقیقت مرادف الفاظ کا اختلاف تھا، یعنی ایک حرف میں کوئی ایک لفظ اختیار کیا گیا تھا، اور دوسرے حرف میں اسی کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، حالانکہ عثمانی مصاحب میں جو قرأتیں جمع ہیں ان کے درمیان مرادفات کا یہ اختلاف بہت کم، ان قراءتوں میں جو اختلاف ہے وہ زیادہ تر حرکات، صیغوں، تذکیر و تانیث اور لہجوں کا اختلاف ہے،

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم نے ”سات حروف“ کی جس تشریح کو اختیار کیا ہے اس میں قراءتوں کے درمیان سات قسم کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں، ان سات

اقسام میں سے ایک قسم بدلیت مرادفہ کا اختلاف ہی، حضرت ابو بکرؓ نے یہاں سات حروف کے مکمل تشریح نہیں فرمائی، بلکہ اس کی صرف ایک مثال دی ہے، اس لئے اختلاف کی صرف ایک قسم یعنی اختلاف الفاظ بدلیت کا ذکر فرمایا ہے،

اب اختلافِ قرآت کی یہ قسم یعنی اختلافِ الفاظ ابتدائے اسلام میں بہت زیادہ تھی، چونکہ تمام اہل عرب لغتِ قریش کے پوری طرح عادی نہ تھے، اس لئے شروع میں انھیں یہ سہولت زیادہ سے زیادہ دی گئی تھی، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے متبادل الفاظ میں سے جس لفظ کے ساتھ چاہیں تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ شروع میں ایسا بکثرت تھا کہ ایک قرأت میں ایک لفظ ہو اور دوسری قرأت میں اس کا ہم معنی دوسرا لفظ، لیکن جب لوگ لغتِ قرآن سے پوری طرح مافوس ہو گئے تو اختلافِ قرآت کی یہ قسم رفتہ رفتہ کم کر دی گئی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے قرآن کریم دو مرتبہ دور فرمایا، اس وقت بہت سے الفاظ منسوخ کر دیئے گئے، اور اس طرح الفاظ مرادفہ کا اختلاف بہت کم رہ گیا،

اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ الفاظ مرادفہ اپنے مصاحف میں جمع نہیں فرمائے، جو اس آخری دور میں منسوخ ہو چکے تھے، کیونکہ ان کی حیثیت اب منسوخ التلاوة آیات کی سی تھی، البتہ قسرا توں کا جو اختلاف آخری دور میں بھی باقی رکھا گیا تھا، اسے حضرت عثمانؓ نے جوں کا توں باقی رکھا، لہذا حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے حروف کے اختلاف کی جو قسم مذکورہ حدیث میں بطور مثال مذکور فرمائی ہے وہ قسم ہر جس کی بیشتر جزئیات عوضہ اخیرہ کے وقت منسوخ ہو چکی تھیں، چنانچہ وہ مصاحفِ عثمانی میں شامل نہیں ہو سکیں، اور نہ موجودہ قرآت ان پر مشتمل ہیں،

مذکورہ بالا نتائج تین مقدمات سے مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) عوضہ اخیرہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ حضور کے آخری قرآنی دور)

کے وقت قرآن کریم کی متعدد تراہیں منسوخ کی گئی تھیں،
(۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف عثمانی کو عرصہ اخیرہ کے مطابق
ترتیب دیا،

(۳) حضرت عثمان کے مصحف میں مرادف الفاظ کا وہ اختلاف موجود نہیں
ہے جو حضرت ابوبکر نے بیان فرمایا ہے،

جہاں تک تیسرے مقدمہ کا تعلق ہے وہ تو بالکل ظاہر ہے، اور دوسرے
مقدمہ کے دلائل ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں، جن میں سے صریح ترین دلیل حضرت
عبیدہ سلمانی کا یہ ارشاد ہے کہ حضرت عثمان نے ہمیں جس قرأت پر جمع کیا وہ عرصہ
اخیرہ کے مطابق تھی؛

اب پہلا مقدمہ باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عرصہ اخیرہ کے وقت متعدد
تراہیں منسوخ ہو گئی تھیں، اس کی دلیل محقق ابن الجزری کا یہ ارشاد ہے:-

ولاشك ان القرآن نسخ منه وغيره في العرصة الاخيرة
فقد صح النص بذلك عن غير واحد من الصحابة وروينا
باسناد صحيح عن زرار بن جبيش قال قال لي ابن عباس
ابي القراءتين تقرأ قلت الاخيرة قال فان النبي صلى الله
عليه وسلم كان يعرض القرآن على جبرئيل عليه السلام في
كل عام مرة قال فعرض عليه القرآن في العام الذي قبض
فيه النبي صلى الله عليه وسلم مرتين فشهد عبد الله
يعني ابن مسعود ما نسخ منه وما بدل؛

”اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عرصہ اخیرہ کے موقع پر قرآن کریم میں بہت کچھ

۱۔ کنز العمال، حدیث ۲۸۴۰ ص ۲۸۶ ج ۱،

۲۔ النشر فی القراءات العشر، ص ۳۲ ج ۱،

منسوخ کیا گیا اور بدل لیا گیا ہے، کیونکہ اس کی تصریح متعہ صحابہ سے منقول ہے۔ ہم تک صحیح سند کے ساتھ حضرت زبیر بن جحیش کا یہ قول پہنچا ہے کہ مجھ سے ابن عباس نے پوچھا تم کو کسی قرأت پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ آخری قرأت، انھوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، پس جس سال آپ کی وفات ہوئی اُس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا، اس موقع پر جو کچھ منسوخ ہوا اور جس قدر تبدیلی کی گئی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس کے شاہد تھے ۱۱

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عرضہ اخیرہ کے وقت بہت سی قرات میں خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے منسوخ قرار دیدی گئی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مراد ان الفاظ کے جن اختلاف کا ذکر فرمایا ہے اُس کی بہت سی جزئیات بھی یقیناً اسی وقت منسوخ ہو گئی ہوں گی، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے عرضہ اخیرہ کے مطابق مصحف تیار کرائے ہیں، ان میں الفاظ مرادفہ کا اختلاف بہت شاذ و نادر ہے،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۴) مذکورہ بالا تحقیق پر چونکہ اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ متعدد روایات سے ثابت ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحیح قرآن کا جو کارنامہ

انجام دیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس سے خوش نہیں تھے، اور انھوں نے اپنا مصحف بھی نذر آتش نہیں ہونے دیا، اگر حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم نہیں فرمائے تھے تو پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وجہ اعتراض کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کے کام پر دو اعتراض تھے، ایک یہ کہ کتابت قرآن کے کام میں انھیں کیوں شریک

۱۱ حافظ ابن حجر نے بھی اس مضمون کی متعدد روایات مختلف محدثین کے حوالوں سے نقل کی ہیں، (فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

نہیں کیا گیا؟ دوسرے یہ کہ دوسرے مصاحف کو نذر آتش کیوں کیا گیا؟ پہلے اعتراض کا ذکر صحیح ترمذی کی ایک روایت میں امام زہری نے فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ شکایت تھی کہ کتابت قرآن کا کام اُن کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا، جبکہ انھوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے مقابلہ میں زیادہ طویل عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کیا تھا حافظ ابن حجرؒ اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں حضرت عثمانؓ کا عذر یہ تھا کہ انھوں نے یہ کام مدینہ طیبہ میں شروع کیا تھا اور حضرت ابن مسعودؓ اُس وقت کوفہ میں تھے، اور حضرت عثمانؓ اُن کے انتظار میں یہ کارِ خیر مؤخر فرمانا نہیں چاہتے تھے، اس کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ کام سونپا تھا، اس لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ حج و ترویج قرآن کا یہ حرم بھی انہی کے ہاتھوں انجام پائے،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ نے یہ نسخہ مصحف تیار کرنے کے بعد باقی تمام انفرادی مصاحف کو نذر آتش کرنے کا حکم دیدیا تھا، اور وہ وہ اپنا مصحف نذر آتش کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ انھیں سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے، لیکن انھوں نے فرمایا کہ:

والله لا اذفعه اليهم، اذرائى رسول الله صلى الله عليه وسلم
بضعا وسبعين سورة ثم اذفعه اليهم، والله لا اذفعه اليهم
ثم اذى قسم من يهصحف ان كحواله نهين كرون كا، نجه رسول الله صلى الله
عليه وسلم نه ستره زياره سورتن سكحاني ين، پھر میں یہ مصحف انھیں دیدوں؟

لہ فتح الباری، ص ۱۶ ج ۶

لہ مسترک حاکم ص ۲۲۸ ج ۲، دائرۃ المعارف دکن ۳۲۳ھ، قال الحاکم ”ہذا حدیث صحیح الاسناد واقرہ الذہبی“

خدا کی قسم میں انھیں نہیں دوں گا،

جن حضرات نے کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق اپنے مصاحف لکھ رکھے تھے، حضرت ابن مسعودؓ نے انھیں بھی یہی ترغیب دی کہ وہ اپنے مصاحف حوالہ نہ کریں۔
حضرت خمیر بن مالکؓ فرماتے ہیں:-

”اھربالمصاحف ان تغیر، قال قال ابن مسعودؓ من استطاع منکم ان یغزل مصحفه فلیغله، ثم قال قرأت من فہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبعین سورۃ، أفأترک ما اخذت من فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ الہ وصحبہ وسلم“

”مصاحف میں تبدیلی کا حکم دیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے (لوگوں سے) فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے مصحف کو چھپا سکے وہ ضرور چھپالے..... پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سو تیس بڑھی ہیں تو کیا میں وہ چیز چھوڑ دوں جو میں نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک سے حاصل کی ہے؟“

اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف عثمانی مصاحف سے کچھ مختلف تھا، اور آپ اسے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس میں کیا چیزیں عثمانی مصحف سے مختلف تھیں؟ اس کی صراحت صحیح روایات میں نہیں ملتی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جن صحف میں قرآن کریم کو جمع فرمایا تھا ان میں سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں، اور ان میں ترتیب نہیں تھی، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف لکھوائے ان میں سورتوں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا گیا تھا،

امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں:-

أَنَّ جَمْعَ الْقُرْآنِ لَمْ يَكُنْ مَرَّةً وَاحِدَةً فَتَدَجَّمَ يَعْنِيهِ بِحَضْرَةِ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ جَمَعَ بَعْضُهُ بِحَضْرَةِ ابْنِ بَكْرِ
الصَّدِّيقِ، وَالْجَمْعُ الثَّلَاثُ هُوَ فِي تَرْتِيبِ السُّورَةِ، كَانَ فِي
خِلَافَةِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ،
”جَمَعَ الْقُرْآنَ بِكَامٍ أَيْ، هِيَ مَرْتَبَةٌ مِنْ مَكْمَلٍ نَهَيْتُمْ بِهَا، بَلْ كَرَأَنَ كَرِيمٌ كَأَكْجِ حَصَّةٍ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِي مَوْجُودٌ فِي مِجْمَعٍ هُوَ كَيْتَا، بَعَثَ كَجِجِ حَصَّةٍ
أَبُو بَكْرٍ صَدِّيقٍ مِنْهُ كِ زَمَانِهِ فِي هُوَ، أَوْ جَمَعَ الْقُرْآنَ كَاتِبِ سِرِّهِ وَهُوَ تَحَاجُّنَ فِي
سُورَتَيْنِ كَوِ مَرْتَبَةٍ كَيْتَا، يَهْ كَامِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ حَضْرَةِ عَثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ مِنْهُ
عَهْدِ خِلَافَتِهِ فِي هُوَ“

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف حضرت عثمانؓ کے مصاحف سے ترتیب میں
بہت مختلف تھا، مثلاً اس میں سورۃ نسا، پہلے اور سورۃ آل عمران بعد میں تھی، اور
حضرت ابن مسعودؓ نے شاید اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
قرآن کریم سیکھا ہوگا، اس لئے اُن کی خواہش تھی کہ یہ مصحف اسی ترتیب پر باقی رہے
اس کی تائید صحیح بخاریؒ کی ایک روایت سے ہوتی ہے، کہ عراق کا ایک باشندہ
ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور:-

قَالَ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ أَرَيْتِي مِصْحَفَكَ، قَالَتْ لِمَ؟ قَالَ لَعَلِّي
أُؤَلِّفُ الْقُرْآنَ عَلَيْهِ، فَإِنَّهُ يُقْرَأُ غَيْرَ مَوْلَعٍ، قَالَتْ وَمَا يُضْرَفُ
أَيْكَ قَرَأْتِ قَبْلَ،

۱۔ المستدرک للحاکمؒ ص ۲۲۹ ج ۲ ۲۔ علامہ سیوطیؒ نے ابن اثیرؒ کے حوالہ سے حضرت ابن
مسعودؓ کے مصحف کی پوری ترتیب نقل کی ہے جو مصاحف عثمانی سے بہت مختلف ہے والاتقان
ص ۶۶ ج ۱) ۳۔ صحیح بخاریؒ، باب تالیف القرآن،

”اس نے کہا کہ اُمّ المؤمنین! مجھے اپنا مصحف دکھائیے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا تاکہ میں (اپنے) قرآنی مصحف کو اس کے مطابق ترتیب دے لوں، اس لئے کہ وہ (ہمارے علاقہ میں) غیر مرتب طریقہ سے پڑھا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن کا جو حصہ بھی تم پہلے پڑھ لو تمہارے لئے مضر نہیں“

اس حدیث کی سترح میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ عراقی شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت پر کاربند تھا، اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنا مصحف نہ بدلا تھا اور نہ اُسے نابود کیا تھا، اس لئے اس کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور ظاہر ہے کہ عثمانی مصاحف کی ترتیب میں مناسبتوں کی رعایت دوسرے مصاحف کے مقابلہ میں زیادہ تھی، اس لئے اس عراقی شخص نے اپنے مصحف کو عثمانی مصحف کے مقابلہ میں غیر مرتب قرار دیا،

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ رسم الخط کا فرق بھی ہو، اور اس میں ایسا رسم الخط اختیار کیا گیا ہو جس میں عثمانی مصاحف کی طرح تمام سترار توں کی گنجائش نہ ہو، ورنہ اگر حافظ ابن جریرؒ کے بیان کے مطابق یہ کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف پر قرآن لکھوایا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف انہی متروک حروف میں سے کسی حرف پر لکھا ہوا تھا، تو اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات واقع ہوتے ہیں:-

(۱) صحیح بخاریؒ کی مذکورہ بالا حدیث میں عراقی باشندے نے صرف سورتوں کی ترتیب کا اختلاف کا ذکر کیا ہے، ورنہ اگر حرف کا اختلاف بھی ہوتا تو وہ زیادہ اہم تھا، اسے زیادہ اہتمام سے ذکر کیا جاتا،

(۲) حافظ ابن جریر وغیرہ کے قول کے مطابق سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہیں، اگر یہ بات صحیح ہوتی تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اور عثمانی مصاحف میں کوئی فرق نہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اس قول کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو حرف قریش پر جمع کر کے اسی کے مطابق مصاحف لکھوائے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی قریشی تھے،

(۳) حافظ ابن جریر اور ان کے متبعین نے چھ حروف کو ختم کرنے پر سب بڑی دلیل اجماع صحابہ پیش کی ہے، لیکن اگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کسی اور حرف پر پڑتے اور اس کی کتابت کو جائز سمجھتے تھے تو یہ اجماع کیسے متحقق ہو سکتا ہے، جس اجماع میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے فقیہ صحابی شامل نہ ہوں وہ اجماع کہلانہ کا مستحق ہی کہاں ہے؟ بعض حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کو قبول کر لیا تھا، لیکن اس بارے میں کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:-

”ابن ابی داؤد نے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے، کہ ”ابن مسعود کا بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمل پر راضی ہو جانا“ لیکن اس باب کے تحت کوئی ایسی صریح روایت نہیں لائے جو اس عنوان کے مطابق ہو“

حافظ ابن جریرؒ وغیرہ کے قول پر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ملتا، لہذا صحیح یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساتوں حروف عثمانی مصاحف میں باقی رکھے ہیں، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ چھ حروف کیوں ختم کر دیئے گئے؟ کیونکہ فی الواقع ایسا

لے فتح الباری، ص ۲۰ ج ۱، ۹

۱۵ صرف ایک روایت مسند احمد میں ایسی ملتی ہے جس سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ حروف ختم فرمادیئے تھے، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اسی پر اعتراض تھا دیکھئے الفتح الربانی، ص ۲۶ ج ۱۸) لیکن وہ ایک مجہول شخص سے مروی ہے، اس لئے مستند نہیں ہے،

ہوا ہی نہیں تھا، بلکہ اعتراض بہ تھا کہ جو مصاحف پہلے سے لکھے ہوئے موجود ہیں اور جن کی ترتیب اور رسم الخط عثمانی مصاحف کے مطابق نہیں ہے انھیں ضائع کیوں کیا جا رہا ہے جبکہ وہ بھی درست ہیں،

نتائج بحث "حروف سب" کی یہ بحث اندازے سے زیادہ طویل ہو گئی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے نتائج کا خلاصہ آخریں پیش کر دیا جائے، تاکہ اسے یاد رکھنا آسان ہو۔

(۱) امت کی آسانی کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ فرمائش کی کہ قرآن کریم کی تلاوت کو صرف ایک ہی طریقے میں منحصر نہ رکھا جائے، بلکہ اُسے مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ قرآن کریم سات حروف پر نازل کر دیا گیا،

۲- سات حروف پر نازل کرنے کا راجح ترین مطلب یہ ہے کہ اس کی قرأت میں سات نوعیتوں کے اختلافات رکھے گئے، جن کے تحت بہت سی قراءتیں وجود میں آسکیں،

۳- شروع شروع میں ان سات وجوہ اختلاف میں سے اختلاف الفاظ و مرادفات کی قسم بہت عام تھی، یعنی ایسا بکثرت تھا کہ ایک قرأت میں ایک لفظ ہوتا تھا اور دوسری قرأت میں اس کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، لیکن رفتہ رفتہ جب اہل عرب قرآنی زبان سے پوری طرح مانوس ہو گئے تو یہ قسم کم ہوتی گئی یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا آخری دور کیا، جسے اصطلاح میں عوضہ اخیرہ کہتے ہیں) تو اس میں اس قسم کے اختلافات بہت کم کر دیئے گئے، اور زیادہ تر صیغوں کی بناوٹ، تذکیر و تانیث، افراد و جمع، معروف و مجہول اور لہجوں کے اختلافات باقی رہے،

۴- جتنے اختلافات عوضہ اخیرہ کے وقت باقی رہ گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ نے ان سب کو اپنے مصاحف میں اس طرح جمع فرمادیا کہ ان کو لفظوں اور حرکات سے خالی رکھا، لہذا قرأتوں کے بیشتر اختلافات اس میں سما گئے، اور جو قرأتیں اس طرح ایک مصحف میں نہیں سما سکیں انھیں دوسرے مصاحف میں ظاہر کر دیا، اسی بنا پر عثمانی مصاحف میں کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظ کا اختلاف پیدا ہوا،

۵۔ حضرت عثمانؓ نے اس طرح سات مصاحف لکھوائے، اور ان میں سورتوں کو بھی مرتب فرمادیا جبکہ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفوں میں سورتیں غیر مرتب تھیں، نیز قرآن کریم کے لئے ایک رسم الخط متعین کر دیا، اور جو مصاحف اس ترتیب اور اس رسم الخط کے خلاف تھے انھیں نذر آتش کر دیا،
۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور وہ اس ترتیب کو باقی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنا مصحف نذر آتش کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ کے حوالے نہیں کیا،

سات حروف کے بالے میں | آخر میں ایک اور بنیادی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا اختلاف آراء کی حقیقت، ضروری ہے، اور وہ یہ ہو کہ ”سبعۃ احرف“ کی مذکورہ بحث کو بڑھنے والا سرسری طور پر اس شبہ میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم جیسی بنیادی

ایک غلط فہمی کا ازالہ، کتاب کے بالے میں جو حفاظتِ خداوندی کے تحت آج تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے محفوظ چلی آ رہی ہے مسلمانوں میں اتنا زبردست اختلاف آراء کیسے پیدا ہو گیا؟

لیکن ”سبعۃ احرف“ کی بحث میں جو اقوال ہم نے پیچھے نقل کئے ہیں اگر ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس شبہ کا جواب باسانی معلوم ہو جاتا ہے، جو شخص بھی اس اختلاف آراء کی حقیقت پر غور کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سارا اختلاف محض نظریاتی نوعیت کا ہے، اور عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت و صداقت اور اس کے بعینہ محفوظ رہنے پر اس اختلاف کا کوئی ادنیٰ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا،

کیونکہ اس بات پر سب کا بلا استثناء اتفاق ہے کہ قرآن کریم جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے وہ تو اتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے، اس میں کوئی ادنیٰ تغیر نہیں ہوا، اس بات پر بھی تمام اہل علم متفق ہیں کہ قرآن کریم کی جتنی قراتیں تو اتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں وہ سب صحیح ہیں، اور قرآن کریم کی تلاوت ان میں سے ہر ایک کے مطابق کی جاسکتی ہے، اس بات پر بھی پوری امت کا اجماع ہے کہ متواتر قراتوں کے علاوہ جو شاذ قراتیں مروی ہیں انھیں قرآن کریم کا جزو قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ ”عوضۃ اخیرہ“ یا اس سے پہلے جو قراتیں منسوخ کر دی گئیں وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب قرآن کا جزو نہیں رہیں، یہ بات بھی سب کے نزدیک ہر مشک و شبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن کے سات حروف میں جو اختلاف تھا وہ صرف لفظی تھا، مفہوم کے اعتبار سے تمام حروف بالکل متحد تھے، لہذا اگر کسی شخص نے قرآن کریم صرف ایک قرات یا حرف کے مطابق پڑھا تو اسے قرآنی مضامین حاصل ہو جائیں گے، اور قرآن کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے اسے کسی دوسرے حرف کو معلوم کرنے کی احتیاج نہیں ہوگی، اس میں بھی کوئی ادنیٰ اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف تیار کرائے وہ کامل احتیاط، سینکڑوں صحابہ کرام کی گواہی اور پوری امت مسلمہ کی تصدیق کے ساتھ تیار ہوئے تھے، اور ان میں قرآن کریم ٹھیک اس طرح لکھ دیا گیا تھا جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اور اس میں کسی ایک متنفس کو بھی اختلاف نہیں ہوا۔

لہذا جس اختلاف کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے وہ صرف اتنی بات میں ہے کہ حدیث میں ”سات حروف“ سے کیا مراد تھی؟ اب جتنی متواتر قراتیں جو

۱۵۷ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے مصحف کو باقی رکھنے پر تو مصر رہے، لیکن مصاحب عثمانیؓ کی کسی بات پر انھوں نے ادنیٰ اختلاف نہیں فرمایا،

ہیں، وہ مسات حروف پر مشتمل ہیں یا صرف ایک حرف پر؟ یہ محض ایک علی نظر بابتی اختلاف ہے، جس سے کوئی علی فرق واقع نہیں ہوتا، اس لئے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ان اختلافات کی بنا پر قرآن کریم معاذ اللہ مختلف فیہ ہو گیا ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے ایک کتاب کے بارے میں ساری دنیا اس بات پر متفق ہو کہ یہ فلاں مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اس مصنف کی طرف اس کی نسبت قابل اعتماد ہو اور خود اُسے اُس نے اُسے چھاپ کر تصدیق کر دی کہ یہ میری لکھی ہوئی کتاب ہے اور اس نسخے کے مطابق قیامت تک اسے شائع کیا جاسکتا ہے، لیکن بعد میں لوگوں کے درمیان یہ اختلاف پیدا ہو جائے کہ مصنف نے اپنے مسودے میں طباعت قبل کوئی لفظی ترمیم کی تھی یا جیسا شروع میں لکھا تھا ویسا ہی شائع کر دیا، ظاہر ہے کہ محض اتنے سے نظری اختلاف کی بنا پر وہ روشن حقیقت مختلف فیہ نہیں بن جاتی جس پر سب کا اتفاق ہے، یعنی یہ کہ وہ کتاب اسی مصنف نے اپنی ذمہ داری پر طبع کی ہے، اُسے اپنی طرف منسوب کیا ہے، اور قیامت تک اپنی طرف منسوب کر کے شائع کرنے کی اجازت دی ہے، اسی طرح جب پوری اُمت اس بات پر متفق ہو کہ قرآن کریم کو مصاحف عثمانی میں ٹھیک اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا، اور اس کی تمام متواتر تراہتیں صحیح اور منزل من اللہ ہیں، تو یہ حقائق اُن نظری اختلافات کی بنا پر مختلف فیہ نہیں بن سکتے، جو حروف سببہ کی تشریح میں پیش آئے ہیں، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم ۛ

ناسخ و منسوخ

نسخ کی حقیقت علوم قرآن میں ایک اور اہم بحث ناسخ و منسوخ کی ہے، یہ بحث بڑی پہلو دار اور طویل الذیل ہے، لیکن یہاں اس کی تمام تفصیلات بیان کرنے کے بجائے اس کے متعلق صرف بنیادی معلومات پیش کی ہیں؛ "نسخ" کے لغوی معنی ہیں "مٹانا"، "ازالہ کرنا" اور اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:-

رَفَعَ الْحُكْمَ الشَّرْعِيَّ بِدَلِيلٍ شَرْعِيٍّ

کسی حکم شرعی کو کسی شرعی دلیل سے ختم کر دینا

مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک شرعی حکم نافذ فرماتا ہے، پھر کسی دوسرے زمانے میں اپنی حکمت بالغہ کے پیش نظر اس حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ کوئی نیا حکم عطا فرمادیتا ہے، اس عمل کو "نسخ" کہا جاتا ہے، اور اس طرح جو پرانا حکم ختم کیا جاتا ہے اسے "منسوخ" اور جو نیا حکم آتا ہے اسے "ناسخ" کہتے ہیں۔ یہودیوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں "نسخ" نسخ کا عقلی نقل ثبوت نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اگر نسخ

کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بھی اپنی رائے میں تبدیلی کر لیتا ہے، اُن کا یہ کہنا ہے کہ اگر احکام الہی میں ناسخ و منسوخ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں (معاذ اللہ) اپنی غلطی واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا جسے اصطلاح میں ”بَدلہ“ کہتے ہیں،

لیکن یہودیوں کا یہ اعتراض بہت سطحی نوعیت کا ہے، اور ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ”نسخ“ کا مطلب رائے کی تبدیلی نہیں ہوتا، بلکہ ہر زمانے میں اُس دور کے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، ناسخ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ منسوخ کو غلط قرار دے، بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حکم کی مدت نفاذ متعین کر دے، اور یہ تبادلے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ سے تو وہی مناسب تھا، لیکن اب حالات کی تبدیلی کی بنا پر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامت فکر کے ساتھ غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمت الہیہ کے عین مطابق ہے، اور اسے کسی بھی اعتبار سے کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا، حکیم وہ نہیں ہے جو ہر قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے، بلکہ حکیم وہ ہے جو مرض اور مرض بگڑتے ہوئے حالات پر بالغ نظری کے ساتھ غور کر کے نسخہ میں اُن کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔ اور یہ بات صرف شرعی احکام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کائنات کا سارا کارخانہ اسی اصول پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے موسموں میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بہار، کبھی خسراں، کبھی برسات، کبھی خشک سالی، یہ سارے تغیرات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے عین مطابق ہے، اور اگر کوئی شخص اسے ”بدلہ“ قرار دے کر اس پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس سے معاذ اللہ خدا کی رائے میں تبدیلی لازم آتی ہے کہ اس نے ایک وقت سردی کو پسند کیا تھا، بعد میں غلطی واضح ہوئی، اور اس کی جگہ گرمی بھیج دی تو اسے

احق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، بعینہ یہی معاملہ شرعی احکام کے نسخ کا ہے کہ اُسے ”بدا“ قرار دیکر کوئی عیب سمجھنا انتہا درجہ کی کوتاہ نظری اور حقائق سے بیگانگی ہے، چنانچہ ”نسخ“ صرف امت محمدیہ علیٰ صا جہا السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے، جس کی بہت سی مثالیں موجودہ بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً بائبل میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز تھا، اور خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویاں لیاہ اور راحیل آپس میں بہنیں تھیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اسے ناجائز قرار دیدیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں ہر ہلپتا پھرتا جاندار حلال تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام کر دیئے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں طلاق کی عام اجازت تھی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں عورت کے زنا کا ہونے کے سوا اُسے طلاق دینے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی، غرض بائبل کے عہد نامہ جدید و قدیم میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی پرانے حکم کو نئے حکم کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا،

نسخ کے بارے میں متقدمین اور متاخرین لفظ ”نسخ“ کے استعمال میں علماء متقدمین اور علماء متاخرین کے درمیان اصطلاح کا ایک فرق رہا ہے، جسے

سمجھ لینا ضروری ہے،

متقدمین کی اصطلاح میں لفظ ”نسخ“ ایک وسیع مفہوم کا حامل تھا، اور

۱۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۱۸: ۱۸، ۱۸

۲۔ پیدائش ۹: ۳، ۱۱: ۱ اور استثنا ۱۲: ۷، ۷

۳۔ استثنا ۲۲: ۲۰، ۲۱

۴۔ انجیل متی ۱۹: ۱۵، ۱۵

اس میں بہت سی وہ صورتیں داخل تھیں جو بعد کے علماء کی اصطلاح میں ”نسخ“ نہیں کہلاتیں، مثلاً متقدمین کے نزدیک عام کی تخصیص اور مطلق کی تفسیر وغیرہ بھی ”نسخ“ کے مفہوم میں داخل تھیں، چنانچہ اگر ایک آیت میں عام الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور دوسری میں انہیں کسی خاص صورت سے مخصوص کر دیا گیا ہے، تو علماء متقدمین پہلی کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہلا حکم بالکل ختم ہو گیا، بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلی آیت سے جو عموم سمجھے میں آتا تھا دوسری آیت نے اس کو ختم کر دیا ہے،

مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُوْمِتْنَ،

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ

ایمان لے آئیں۔

اس میں ”مشرک عورتوں“ کا لفظ عام ہے، اور اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے، خواہ وہ بت پرست ہوں یا اہل کتاب، لیکن ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:-

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

اور تمہارے لئے حلال ہیں، اہل کتاب میں سے

باعفت عورتیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں ”مشرک عورتوں“ سے مراد وہ مشرک عورتیں تھیں جو اہل کتاب نہ ہوں، لہذا اس دوسری آیت نے پہلی آیت کے عام الفاظ میں تخصیص پیدا کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کہ ان الفاظ سے مراد مخصوص قسم کی مشرک عورتیں ہیں، متقدمین اس کو بھی ”نسخ“ کہتے ہیں، اور پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے ہیں،

اس کے برخلاف متاخرین کے نزدیک ”نسخ“ کا مفہوم اتنا وسیع نہیں، وہ

صرف اس صورت کو "نسخ" قرار دیتے ہیں، جس میں سابقہ حکم کو بالکلیہ ختم کر دیا گیا ہو۔ محض عام میں تخصیص یا مطلق میں تقیید پیدا ہو جانے سے تو اسے "نسخ" نہیں کہتے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں متاخرین یہ کہتے ہیں کہ اس میں نسخ نہیں ہوا، کیونکہ اصل حکم (یعنی مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت) بدستور باقی ہے، صرف اتنا ہوا ہی کہ دوسری آیت سے یہ واضح ہو گیا کہ پہلی آیت کا مفہوم اتنا عام نہیں تھا کہ اس میں اہل کتاب عورتیں بھی داخل ہو جائیں، بلکہ وہ صرف غیر اہل کتاب کے ساتھ مخصوص تھی،

اصطلاح کے اس فرق کی وجہ سے متقدمین کے نزدیک قرآن کریم میں منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ معمولی فرق کی وجہ سے ایک آیت کو منسوخ اور دوسری کو نسخ قرار دیتے تھے، لیکن متاخرین کی اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہے،

قرآن کریم میں نسخ کی بحث

اس بات میں تو اُمت کے کسی فرد کا اختلاف نہیں معلوم نہیں ہے کہ شرعی احکام نسخ کا سلسلہ پچھلی اُمتوں کے وقت سے جاری رہا ہے، اور اُمت محمدیہ علیٰ صا جہا التلام میں بہت سے احکام منسوخ ہوئے ہیں، مثلاً پہلے حکم یہ تھا کہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جائے، بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیدیا گیا، اس میں مسلمانوں میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے،

لیکن اس میں آراء کا کچھ اختلاف ہے کہ قرآن کریم میں نسخ ہوا ہے یا نہیں؟ دوسرا الفاظ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت موجود

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اللاتقان، ص ۲۲، ج ۲، ۲۔ جمال الدین القاسمی، تفسیر

القاسمی، ص ۲۲، ج ۱، عیسیٰ البانی الجلی مصری، ص ۱۰۰

ہے جس کا حکم منسوخ ہو چکا ہو اور اس کی تلاوت اب بھی کی جاتی ہو؟ جمہور اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، لیکن معتزلہ میں سے ابو مسلم اصفہانی کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ تمام آیات اب بھی واجب العمل ہیں، ابو مسلم اصفہانی کی اتباع میں بعض دوسرے حضرات نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور ہمارے زمانے میں اکثر تجدد پسند حضرات اسی کے قائل ہیں، چنانچہ جن آیتوں میں نسخ معلوم ہوتا ہے یہ حضرات ان کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے نسخ تسلیم نہ کرنا پڑے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ موقف دلائل کے لحاظ سے کمزور ہے، اور اسے اختیار کرنے کے بعد بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں ایسی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے جو اصول تفسیر کے بالکل خلاف ہے، جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے وجود کے قائل نہیں ہیں، دراصل ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ”نسخ“ ایک عیب ہے جس سے قرآن کریم کو خالی ہونا چاہئے، حالانکہ آپ سچھے دیکھ چکے ہیں کہ ”نسخ“ کو عیب سمجھنا کتنی کوتاہ نظری کی بات ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ ابو مسلم اصفہانی اور ان کے متبعین عموماً یہ بود و نصاف کی طرح اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام میں نسخ ہوا ہے، بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں نسخ نہیں ہے، اب اگر نسخ ”کوئی عیب ہے تو غیر قرآنی احکام میں یہ عیب کیسے پیدا ہو گیا؟ جبکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں، اور اگر یہ کوئی عیب نہیں ہے تو جو چیز غیر قرآنی احکام میں عیب نہیں تھی وہ قرآنی احکام میں عیب کیونکر قرار دیجی؟ کہا جاتا ہے کہ یہ بات حکمت الہی کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی آیت محض تبرکاً تلاوت کے لئے باقی رہ جاوے اور اس پر عمل کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہو۔

لیکن نہ جانے اس بات کو حکمت الہی کے خلاف کس بنا پر قرار دیا گیا ہے؟

حالانکہ قرآن کریم کی منسوخ احکم آیات کے باقی رہنے میں بہت سی مصلحتیں ہو سکتی ہیں مثلاً اس سے احکام شرعیہ میں تدریج کی حکمت واضح ہوتی ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے احکام کا پابند بنانے میں کس حکیمانہ طریقے سے کام لیا ہو؟ نیز اس سے شرعی احکام کی تاریخ کا علم ہوتا ہے، اور یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر کب اور کیا حکم نافذ کیا گیا تھا؟ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر پچھلی امتوں کے ان احکام کا ذکر فرمایا ہے جو امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا السلام) میں منسوخ ہو گئے، مثلاً ارشاد ہے :-

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَزْرًا مِمَّا كَلَّ ذِي ظُفْرٍ، وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْعَنَمِ
حَزْرًا مِمَّا عَلَيْهِمْ شَحْوَمُهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا،
أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (العام: ۱۳۶)

۳ اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے، اور گائے اور بکری (کے اجزاء میں سے) ان دونوں کی جسربیاں ان پر ہم نے حرام کر دی تھیں مگر وہ (چربی) جو ان (دونوں) کی پشت پر یا آنتوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملتی ہوئی ہو!

ظاہر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک منسوخ حکم کا تذکرہ اسی لئے فرمایا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت حاصل کی جائے، اگر قرآن کریم میں بعض منسوخ احکم آیات کی تلاوت اسی مقصد کے لئے باقی رکھی گئی ہو تو اس میں کونسی بات حکمت الہیہ کے خلاف ہے؟ پھر یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کے حکم کی حکمت معلوم ہے؟ یا وہ کبریت قرآنی کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ اُس کے نزول میں کیا کیا حکمتیں تھیں؟ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا، اور یقیناً نہیں ہو سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ کے کسی کام سے محض اس بنا پر کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس کی حکمت ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، جبکہ اس کام کا وقوع شرعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہو،

لہذا حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے قائل نہیں ہیں، ان کا وہ

بنیادی مفروضہ ہی سرے سے غلط ہو، جس پر انھوں نے اپنے نظریے کی ساری عمارت کھڑی کی ہے، انھوں نے بعض قرآنی آیات کو دو دروازے کے معانی صرف اس لئے پہنچا دیے ہیں کہ ان کی نظریں "نسخ" ایک عیب ہے، جس سے وہ قرآن کریم کو خالی دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے، اور اگر ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ نسخ کوئی عیب نہیں بلکہ حکمتِ الہی کا عین تقاضا ہے تو وہ ایسی آیتوں کی تفسیر وہی کریں گے جو عام طور سے کی جاتی ہے، کیونکہ ظاہر اور متبادر تفسیر وہی ہے،

قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّمَّا أَدْرَجْنَاهَا، أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (البقرہ: ۱۰۶)

"جس آیت کو بھی ہم منسوخ کریں گے یا بھٹلائیں گے، اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آئیں گے، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"

اس آیت کو جو شخص بھی غیر جانب داری کے ساتھ خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کریم کی آیات میں نسخ کا سلسلہ خود قرآن کریم کی تصریح کے مطابق جاری رہا ہے، لیکن ابو مسلم اصفہانی اور ان کے ہمنا جو نسخ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک عیب سمجھ کر قرآن کریم کو اس سے خالی قرار دینا چاہتے ہیں، وہ مذکورہ آیت میں دو دروازے کا تاویل کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایک فرضی صورت کا بیان کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض ہم نے کسی آیت کو منسوخ کیا تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت نازل کر دیں گے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی کوئی آیت ضرور منسوخ کی جائے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک آیت میں ارشاد ہے :-

إِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَكَدًّا قَانَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ۝

"اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہو تو میں سب سے پہلے اس کی پرستش کروں گا"

منکرین نسخ کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں ایک فرضی صورت کا بیان ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہو گا، اسی طرح مذکورہ بالا آیت

میں نسخ کا ذکر صرف ایک فرضی صورت کے طور پر کیا گیا ہے جس کا واقعہ میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے؛

لیکن آیت مذکورہ کی یہ تشریح ایک دروازہ کارتاویں سے زیادہ حیثیت نہیں کھتی اس لئے کہ اگر قرآن کریم کی آیات میں کبھی نسخ واقع نہیں ہونا تھا تو اللہ تعالیٰ کو بلاغ فرض ہی سہی اس کا ذکر فرمانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ قرآن کریم کا یہ منصب ہرگز نہیں ہے کہ جو واقعات کبھی پیش نہ آنے والے ہوں، انہیں بلاوجہ فرض کر کر کے اُن پر کوئی حکم لگائے، رہی ان کا نَ لِلرَّحْمٰنِ وَكَذٰلِكَ الْوَالِیٰ آیت، سو اس میں اور نسخ کی مذکورہ آیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) کسی لڑکے کی پیدائش ایک بالکل ناممکن چیز ہے، لہذا اس آیت کو پڑھنے والا ہر شخص فوراً یہ سمجھ لیگا کہ یہ بات محض ایک مفروضہ کے طور پر کہی گئی ہے، جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا، لیکن چونکہ اس کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کا سوال ہی نہیں ہے، اس کے برعکس "نسخ" کا وقوع خود ابو سلمہ اصفہانی کے نزدیک عقلی طور پر ناممکن نہیں ہے، اس لئے اُسے محض ایک فرضی صورت قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں،

یہ بات مذکورہ آیت کے شان نزول سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کتب تفسیر میں مروی ہے کہ بعض کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ اپنے متبعین کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں پھر اس کی ممانعت کر دیتے ہیں اور کوئی نیا حکم لے آتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں نسخ کو تسلیم کر کے اس کی حکمت بیان کی گئی ہے، نسخ کا انکار نہیں کیا گیا، منسوخ آیات قرآنی کی تعداد | جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متقدمین کی اصطلاح میں

لہ قرآن حکم از مولانا عبدالصمد رحمانی، ص ۲۱، مجلس معارف القرآن، دیوبند،

۱۷ روح المعانی، علامہ آلوسی، ص ۳۵ ج ۱،

نسخ کا مفہوم بہت وسیع تھا، اسی لئے انھوں نے منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ بتائی ہے، لیکن علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے متاخرین کی اصطلاح کے مطابق لکھا ہے کہ پورے قرآن میں کُل اُنیس آیتیں منسوخ ہیں، پھر آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان اُنیس آیتوں پر مفصل تبصرہ کر کے صرف پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کیا ہے، اور باقی آیات میں ان تفسیروں کو ترجیح دی ہے جن کے مطابق انھیں منسوخ ماننا نہیں پڑتا، ان میں سے اکثر آیتوں کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہات نہایت معقول اور قابل قبول ہیں، لیکن بعض توجیہات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، بہر حال جن پانچ آیتوں کو انھوں نے منسوخ تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں:-

كَتَبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ أَنْ تَرَكَ تَحِيْرًا
بِأَوْصِيَّتِهِ لَوْلَا ذَلِكَ لَفُتِنَ الْفَاسِقِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِينَ ۝ (البقرہ: ۱۸۰)

جب تم میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہو جائے اگر وہ مال چھوڑ رہا ہو تو اس پر والدین اور اقرباء کے لئے وصیت بالمعروف کرنا فرض قرار دیدیا گیا ہے، یہ حکم متقیوں پر لازم ہے ۝

یہ آیت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب میراث کے احکام نہیں آئے تھے، اور اس میں ہر شخص کے ذمہ یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کر کے جائے کہ اس کے والدین یا دوسرے رشتہ داروں کو کتنا کتنا مال تقسیم کیا جائے؟ بعد میں آیت میراث یعنی يُوَصِّيْكُمْ اللّٰهُ فِيْ اٰوْاٰلَادِكُمْ الخ نے اس کو منسوخ کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نے تمام رشتہ داروں میں ترکہ کی تقسیم کا ایک ضابطہ خود متعین کر دیا، اب کسی شخص پر مرنے سے پہلے وصیت کرنا فرض نہیں رہا،

(۲) سورۃ انفال میں ارشاد ہے :-

إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرٌ صَابِرُونَ يُغْلِبُوا أِمَّا تَيْنِ وَإِنْ
يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يُغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَإِنَّمَا
قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝ (الانفال: ۶۵)

اگر تم میں سے بیس آدمی استقامت رکھنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب
آجائیں گے، اور اگر تم میں سے ستر آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب
آجائیں گے، کیونکہ یہ کافر ایسے لوگ ہیں جو صحیح سمجھ نہیں رکھتے ۝

یہ آیت اگرچہ بظاہر ایک خبر ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے ایک حکم ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں
کو اپنے سے دس گنا زائد دشمن کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں، یہ حکم اگلی آیت کے
ذریعہ منسوخ کر دیا گیا۔

أَلَا نَخَفْتُ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا، فَإِنْ يَكُنْ
مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يُغْلِبُوا أِمَّا تَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ
يَغْلِبُوا أَلْفِينَ يَا ذِئْبِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (الانفال: ۶۶)

اب اللہ نے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دی ہے، اور اللہ کو علم ہے کہ اب تم میں
کچھ کمزوری ہے، پس (اب) اگر تم میں سے ستر افراد استقامت رکھنے والے ہونگے
تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے، اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ ہزار پر
اللہ کے حکم سے غالب ہوں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۝

اس آیت نے پہلی آیت کے حکم میں تخفیف پیدا کر دی، اور دشمن گنے دشمن کے بجائے
دو گنے کی حد مقرر کر دی، کہ اس حد تک راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں،

(۳) تیسری آیت جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے منسوخ قرار دیا ہے، سورۃ احزاب

کی یہ آیت ہے :-

لَا يَجْعَلُ اللَّهُ لِكُلِّ امْرَأَةٍ مِنْكُمْ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تُبَدَّلَ لِيَمِينٍ مِنْ أَزْوَاجٍ
وَلَوْ أَعْجَبَكَ مَحْسَنُهُنَّ، (الاحزاب: ۵)

”راے نبیؐ) آپ کے لئے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ حلال ہے کہ ان (موجودہ ازواج) کو بدل کر دوسری عورتوں سے نکاح کریں، خواہ آپکو اُن کا حسن پسند آئے“

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید نکاح کرنے سے منع فرمادیا گیا تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور اس کی ناسخ آیت وہ ہے جو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب میں مذکورہ بالا آیت سے پہلے مذکور ہے، یعنی :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ إِلَّا

لئے نبیؐ، ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ ازواج حلال کر دی ہیں جنہیں آپ نے اُن کا ہر دیدیا ہو، الخ (الاحزاب : ۵۰)

حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعہ سابقہ ممانعت منسوخ ہو گئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نسخ یقینی نہیں ہے، بلکہ اس کی وہ تفسیر بھی بڑی حد تک بے تکلف اور سادہ ہے، جو حافظ ابن جریر طبریؒ نے اختیار کی ہے، یعنی یہ کہ یہ دونوں آیتیں اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی نازل ہوئی ہیں، یا آیہمَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الْآتِي دَالِ آیت میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مخصوص عورتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ اُن کے ساتھ نکاح آپ کے لئے حلال ہے، پھر اگلی آیت لَيَجُوزُ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ فِي ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں، (۴) چوتھی آیت جو حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک منسوخ ہے، سورہ مجادلہ کی یہ آیت :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَوَلَّوْا فَمَا لِلرِّسُولِ فَقْتًا مَوَالِيْنَ يَدِي
نَجُواكُمْ صَدَقَةٌ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرٌ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا
فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (المجادلہ : ۱۲)

”لے ایمان دلو؛ جب تم کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرگوشی کرنی ہو تو سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو یہ تمہارے لئے باعث خیر و طہارت ہے، پھر اگر تمہارے پاس (صدقہ کرنے کے لئے) کچھ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔“

یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہو گئی :-

ءَاَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَىٰكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمَّا تَفْعَلُوا آذَاتًا اللَّهُ عَلَيْكُمْ قَارِئٌ مَّا الصَّلَاةَ وَالْذِّكْرَةَ وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ، (المجادلہ : ۱۳)

”کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو، پس جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی تو (اب) نماز قائم رکھو، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔“

اس طرح سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم منسوخ کر دیا گیا،

(۵) پانچویں آیت سورہ قمر میں کی مندرجہ ذیل آیت ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قِيمَ اللَّيْلِ إِلَّا قَلِيلًا نَّضْفَهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا
لَيْلَ مَزْمَلٍ رَأَىٰ خَضْرَاءَ صَالِيٍّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مراہیں) رات کو (تہجد میں) کھڑے رہئے،

مگر تھوڑا سا حصہ آدمی رات یا اس میں سے بھی کچھ کم کر دیجئے۔ (المزمل : ۱)

اس آیت میں رات کے کم از کم آدھے حصہ میں تہجد کی نماز کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں اگلی آیتوں نے اس میں آسانی پیدا کر کے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا، وہ آیتیں یہ ہیں :-

تَعْلَمَ أَنَّ لَنْ نَحْضُوهُ قَتَابَ عَلَيْكُمْ قَارِئٌ وَأَمَّا تَيْسَرًا مِنْ
الْقُرْآنِ ، (المزمل : ۲۰)

”اللہ کو معلوم ہے کہ تم (آئندہ) اس حکم کی پابندی نہیں کر سکو گے، اس لئے اللہ نے تمہیں معاف کر دیا، پس (اب) تم قرآن کا اتنا حصہ پڑھ لیا کرو،

جو تمھارے لئے آسان ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد کا حکم واجب تو پہلے بھی نہیں تھا، لیکن پہلے اس میں زیادہ تاکید بھی تھی اور اس کا وقت بھی زیادہ وسیع تھا، بعد میں تاکید بھی کم ہو گئی، اور وقت کی اتنی پابندی بھی نہ رہی،

یہ ہیں وہ پانچ آیتیں جن میں حضرت شاہ صاحبؒ کے قول کے مطابق نسخ ہوا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ پانچ مثالیں صرف اس صورت کی ہیں جس میں ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن کریم کے اندر موجود ہیں، اس کے علاوہ ایسی مثالیں قرآن کریم میں باقی ہیں بہت سی ہیں جن میں ناسخ تو قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن منسوخ موجود نہیں، مثلاً تحویل قبلہ کی آیات وغیرہ،

نتیجہ بحث مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں نسخ کا وجود (معاذ اللہ) کوئی عیب نہیں ہے، جس سے قرآن کریم کو خالی دکھانے کی کوشش کی جائے، بلکہ یہ حکمت الہی کا عین تقاضا ہے، لہذا کسی آیت کی کسی تفسیر کو محض اس بنا پر رد نہیں کرنا چاہئے کہ اس کے مطابق قرآن میں نسخ لازم آتا ہے، بلکہ اصول تفسیر کے مطابق جو تفسیر راجح ہو اسے اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں، خواہ اس میں آیت کو منسوخ قرار دینا پڑتا ہو،
واللہ سبحانہ اعلم ۛ

تاریخِ حفاظتِ قرآن

نزولِ قرآن کی تاریخ اور اس کے متعلقہ مباحث سے ضروری حد تک فارغ ہونے کے بعد اب ”تاریخِ حفاظتِ قرآن“ کے موضوع پر گفتگو پیش نظر ہے جس میں یہ بتایا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے زمانوں میں قرآنِ کریم کی حفاظت کس طرح کی گئی؟ اُسے کس طرح لکھا گیا؟ اور یہ کوششیں کتنے مراحل سے گزری ہیں؟ نیز اس سلسلے میں غیر مسلموں اور ملحدوں کی طرف سے جو شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ان کا انشاء اللہ مکمل اور اطمینان بخش جواب دیا جائیگا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حفاظتِ قرآن کے

قرآنِ کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے

عہدِ رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلے میں یہ امتیاز عطا فرمایا تھا کہ اس کی حفاظت قلم اور کاغذ سے زیادہ حفاظت کے سینوں سے کرائی جانی چاہئے صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا:۔

ومنزل علیہ کتاباً لا یغسلہ الماء
یعنی میں تم پر ایک ایسی کتاب نازل کرنے والا ہوں جسے
پانی نہیں دھوسکے گا»

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عام کتابوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ دنیوی آفات کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں، چنانچہ تورات، انجیل، اور دوسرے آسمانی صحیفے اسی طرح نابود ہو گئے لیکن قرآن کریم کو سینوں میں اس طرح محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے، چنانچہ ابتداءً اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپ کے الفاظ کو اسی وقت دہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:-

لَا تُحِزُّكَ بِهِ سَنَاقِلٌ لِّتَعْجَلَ بِهِ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ
”آپ قرآن کریم کو جلدی سے یاد کر لینے کے خیال سے اپنی زبان کو حرکت نہ
دیجئے، کیونکہ اس (قرآن) کو جمع کرنا اور پڑھوانا تو ہم نے اپنے ذمے
لے لیا ہے“

(القیٰمہ: ۱۶، ۱۷)

اس آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور ادھر وہ آپ کو یاد ہو جاتیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت

جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا، پھر آپ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے صرف معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اُس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرام کو قرآن کریم سکھانے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نمازیں اُسے پڑھتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ روز فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجد نبویؐ میں قرآن سکھانے سکھانے والوں کی آوازیں کا اتنا شور مہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمائی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کر دو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے۔

اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، اور انھیں صدیوں تک گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد قرآن کریم کی وہ منزلِ ہدایت نصیب ہوئی تھی جسے وہ اپنی زندگی کی سب سے عزیز پونجی تصور کرتے تھے، اس لئے انھوں نے اسے یاد رکھنے کے لئے کیا کچھ اہتمام کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اُن کے مزاج اور افتادِ طبع سے واقف ہے، چنانچہ تھوڑی سی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی تعداد تیار ہو گئی جسے قرآن کریم از بر یاد تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظ قرآن کی اس جماعت میں حضرت ابو بکرؓ

عمرہ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعیدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالم مونیٰ ابن جحیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن ناسؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت أم سلمہؓ، حضرت أم ورقہؓ، حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت معاویہ بن جبلؓ، ابو حلیمہ معاویہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت صحیح بن جاریہؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت تیمم دارمیؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، اور حضرت ابو زید رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے۔

پھر یہ تو صرف اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی ہیں جن کا نام حافظ قرآن کی حیثیت سے روایات میں محفوظ رہ گیا، ورنہ ایسے صحابہ تو بے شمار ہوں گے جنہوں نے پورا قرآن کریم یاد کیا تھا، لیکن اس حیثیت سے اُن کا نام روایات میں محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات ایک قبیلے میں ستر ستر قاری قرآن کی تعلیم کے لئے بھیجے ہیں، چنانچہ صرف غزوہ بدرؓ کے موقع پر ستر ستر صحابہؓ کے شہید ہونے کا ذکر روایات میں موجود ہے، اور حفاظ صحابہ کی تقریباً اتنی ہی تعداد آپ کے بعد جنگ یمامہ میں شہید ہوئی، بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ جنگ یمامہ کے موقع پر سات سو قراقران صحابہؓ شہید ہوئے تھے،

اس کے علاوہ یہ تو صرف اُن صحابہؓ کا ذکر ہے جن کو پورا قرآن کریم یاد تھا، اور ایسے صحابہؓ کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے،

لہ النشر فی القراءات العشر ص ۶ ج ۱۔ الاتقان، ص ۲۳ و ۲۴ ج ۱، اوتاریخ القرآن لکرمی، ص ۶۰

لہ الاتقان، ص ۲۳ ج ۱

لہ عمدۃ القاری ص ۱۶ و ۱۷ ج ۲۰ مطبوعہ دمشق،

لہ البرہان فی علوم القرآن للزکشی ص ۲۲۱ تا ۲۲۳ ج ۱

غرض ابتداء سے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بنیادی طریقہ یہی اختیار کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کو یاد کرا دیا گیا، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اُس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی، کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں، اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اس قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں،

اس طریقہ سے قرآن کریم کی نشر و اشاعت کس تیزی کے ساتھ ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرو بن سلمہؓ عہد رسالت کے ایک کسب صحابی تھے، ان کا گھرا ایک چمچہ کے کنارے واقع تھا، جہاں آنے جانے والے مسافر آرام کیا کرتے تھے، اُن کی عمر سات سال تھی اور ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن آنے جانے والوں سے قرآن کریم کی مختلف آیتیں اور سورتیں سن سن کر انھیں مسلمان ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم کا ایک اچھا خاصا حصہ یاد ہو گیا تھا،

عہد رسالت میں کتابتِ قرآن

پہلا مرحلہ

حفاظتِ قرآن کا اصل مدار تو اگرچہ حافظہ پر تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا، کتابت کا طریق کار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ :-

كنت اكتب الوحي لرسول الله صلى الله عليه وسلم وكان اذا نزل عليه الوحي اخذته برجاء شديدة وعرقا مثل الجمان ثم سترت عليه، فكنت ادخل عليه بقطعة الكتف او كسوة فاكتب وهو يعلو علي فما انفرغ حتى تكاد رجلي تنكسر من نقل القرآن حتى اقول لا امشي على رجلي ابد افاذا فرغت قال اقرأ فاقراء فان كان فيه سقط اقامه ثم اخرج به الى الناس^{عليه}

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو سخت گرمی لگتی تھی، اور آپ کے جسم اہلر پر پینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر آپ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی، تو میں مونڈھے کی کوئی بڑی ریاکسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا آپ کھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہر حال! جب میں فارغ ہوتا تو آپ فرماتے: ”پڑھو!“ میں پڑھ کر سُناتا، اگر اس میں کوئی فرد گزاشت ہوئی تو آپ اس کی اصلاح فرمادیتے، اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔
کتابت وحی کا کام صرف حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی کے سپرد نہ تھا، بلکہ آپ نے بہت سے صحابہ کو اس مقصد کے لئے مقرر فرمایا ہوا تھا، جو حسب ضرورت کتابت وحی کے

۱۔ رواہ البیہقی فی الاوسط ورجالہ موثقون الدرر فیہ وحدث فی کتاب خالی فہو رجالہ (مجمع الزوائد) لیرالدین البیہقی ص ۵۲ ج ۱، باب عرض الکتاب بعد الملائمہ، دارالکتب العربی، بیروت

فرائض انجام دیتے تھے، کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے۔ لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ حضرات ہیں:-

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ، حضرت ابان بن سعید بن العاصؓ، حضرت حنظلہ ابن الریحؓ، حضرت معقب بن ابی فاطمہؓ، حضرت عبداللہ بن ارتم الزہریؓ، حضرت شرجیل بن حسنہؓ، حضرت عبد بن رواحہؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت مغرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن پاک کو کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتب وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورہ میں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے، چنانچہ اُسے آپ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا تھا، اس زمانہ میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیا ب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، اور چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں،

۱۷ علوم القرآن، صحیح صالح، ترجمہ اردو غلام احمد حریری، ص ۱۰۱ بحوالہ مستشرق بلد شبر وغیرہ
ملک برادرز لاہلپور ۱۹۶۸ء

۱۸ یہاں تک کے نام فتح الباری، ص ۱۸، ج ۹ سے ماخوذ ہیں،

۱۹ ان حضرات کے اسمائے گرامی کیلئے دیکھئے زاد المعاد لابن قیمؒ، ص ۳۰ ج ۱ مطبوعہ مینینہ مصر،
۲۰ فتح الباری، ص ۱۸ ج ۹ بحوالہ مسند احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابوداؤد، ابن حبان وحاکم وصحیح،
ابن حبان وحاکمؒ، ۲۱ ایضاً ص ۱۱ ج ۹ وعمدۃ القاریؒ، ص ۱۷ ج ۲، اوارۃ الطباعة المنیریہ دمشق

اس طرح عہد رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ کتابی شکل میں نہ تھا بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن کریم کی آیات اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے جاری تھا جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اور سہیل بنی حضرت سعید بن زیدؓ حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اور جب حضرت عمرؓ نے مسلمان ہونے کی خبر سنا کر غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، تو ان کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا، جس میں سورہ طہ کی آیات درج تھیں، اور حضرت خباب بن ارتؓ انھیں پڑھا رہے تھے،

اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے انفرادی طور پر اپنے پاس قرآن کریم کے مکمل یا نامکمل نسخے لکھ رہے تھے، مثلاً صحیح بخاریؒ میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ:-

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهي ان يسافر بالقران الى
ارض العدو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کرنے سے منع فرمایا،

۱۔ سنن دارقطنی ص ۱۲۳ ج ۱ طبع مدینہ طیبہ، باب نہی الحدیث عن مس القرآن و صح الزوائد،
للہیثمی ص ۶۱ ج ۹ طبع بیروت، مناقب عمرؓ و سیرت ابن ہشام بہامش زاد المعاد ص ۸۶ و ۸۷،
ج ۱، حافظ زلیخا نے اس واقعہ کو سنداً جید قرار دیا ہے، (نصب الرایہ)
۲۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، ص ۱۹ و ۲۰ ج ۱، اصح المطالع،

یزعجم طبرانی میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قرأ الرجل في غير المصحف الف درجة وقرأه في المصحف تصاعفت على ذلك الفی درجة،^۱
 ”کوئی شخص قرآن کریم کے نسخہ میں دیکھے بغیر تلاوت کرے تو اس کا ثواب ایک ہزار درجہ ہے، اور اگر قرآن کے نسخہ میں دیکھے کہ تلاوت کرے تو دو ہزار درجہ ہے“

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پاس عہد رسالت ہی میں قرآن کریم کے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے، ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو دیکھ کر تلاوت کرنے یا اسے لے کر دشمن کے علاقہ میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا،

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جمع قرآن

دوسرا مرحلہ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وترآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ درہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوتے تھے، کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، زیادہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں، اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوتے تھے،

اس بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ

۱۔ مجمع الزوائد، ص ۱۶۵ ج ۲، مطبوعہ برودت، قال البیہقی: رواه الطبرانی وفيه ابو سعید بن عون وثقة ابن مبعدي رواية وضعه في آخره وفيه رجاله ثقات،

کارنامہ جن محرمات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ رضی عنہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابو بکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا، تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمرؓ نے ابھی آ کر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کر دینے کا کام شروع کر دیں“ میں نے عرض سے کہا، کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا، اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ: ”تم نوجوان اور سجدہ را آدمی ہو، ہمیں تمھارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو، لہذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کر کے انھیں جمع کر دو“

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے ان سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ... مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا!

اس موقع پر صحیح قرآن کے سلسلہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا، نیز قرآن کریم کے جو مکمل نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے، حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیش نظر ان میں سے صرف کسی ایک طریقہ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی کوئی آیت لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص ان کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:-

- ۱- سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے تھے،
- ۲- پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ان کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا، اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے بلکہ لہذا حضرت زیدؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ بھی اپنے حافظہ سے اس کی توثیق فرماتے تھے،

۳۔ کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سال آپ پر پیش کر دی گئی تھی، اور آپ نے اس بات کی تصدیق فرمادی تھی کہ یہ اُن حروفِ سبعہ کے مطابق ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے، علامہ سیوطی کی اس بات کی تائید متعدد روایات سے بھی ہوتی ہے،

۴۔ اس کے بعد اُن لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہ نے تیار کر رکھے تھے، امام ابو شامہ فرماتے ہیں کہ اسطریق کار کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے، اور صرف حافظہ پر اتکا کرنے کے بجائے بعینہ اُن آیات سے نقل کیا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں ہے تو حضرت زید بن ثابت کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ ”سورہ برامۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ فَخُذُوا حِذْرًا فَاسْمِعُوا بَنِيكُمْ وَالشَّيْطَانُ سَوِيءٌ“ اُن کے پاس ملیں، اُن کے پاس کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے پاس کسی کو اُن کا جز و قرآن ہونا معلوم نہ تھا،

۱۵ الاتقان، ص ۶۰ ج ۱، ۱۵

۱۵ داہنا طلب القرآن متفرقا ليعارض بالجمع عند من بقى ممن جمع القرآن ليشارك الجميع في علم ما جمع راہبران فی علوم القرآن، ص ۲۳۸ ج ۱

۱۵ الاتقان، ص ۶۰ ج ۱،

بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی قرآن کریم کی متصرف آیتیں لے لے کر آ رہے تھے ان میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں۔ درنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہی یہ بات تو اتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، اول تو جن سینکڑوں حفاظ کو پورا قرآن کریم یاد تھا، انھیں یہ آیت بھی یاد تھیں، دوسرے آیات قرآنی کے جو مکمل مجموعے مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے ان میں بھی یہ آیت لکھی ہوئی تھی، لیکن چونکہ حضرت زید بن ثابتؓ نے مزید احتیاط کے لئے مذکورہ بالا ذرائع پر اکتفا کرنے کے بجائے متفرق طور سے لکھی ہوئی آیتوں کو جمع کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا تھا، اس لئے انھوں نے یہ آیت اس وقت تک اس نئی مجموعے میں درج نہیں کی، جب تک اس تیسرے طریقے سے بھی وہ آپ کو دستیاب نہیں ہوگئی۔ دوسری آیات کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ حفاظ صحابہؓ کو یاد ہونے اور عہد رسالت کے مکمل مجموعوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ کسی کئی صحابہؓ کے پاس الگ سے لکھی ہوئی بھی تھیں، چنانچہ ایک ایک آیت کسی کئی صحابہؓ لے کر آ رہے تھے، اس کے برعکس سورۃ برات کی یہ آخری آیات سینکڑوں صحابہؓ کو یاد تو تھیں، اور جن حضرات کے پاس آیات فترآنی کے مکمل مجموعے تھے ان کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں کسی اور کے پاس نہیں!

بہر حال! حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انھیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا، لیکن ہر سورۃ علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں میں مشتمل تھا، اصطلاح

لہ ابرہان فی علوم القرآن، ص ۲۳۲ و ۲۳۳ ج ۱، لہ عن سالم قال جمع ابو بکر القرآن فی قرطیس (التفان ص ۶۰ ج ۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ نسخہ بھی جڑے کے پارچوں پر لکھا گیا لیکن حافظ ابن بھر نے اس کی تردید کی ہے، (ایضاً)

میں اس نسخہ کو "ام" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں :-

(۱) اس نسخہ میں آیات قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں، ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی؛

(۲) اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے؛

(۳) یہ نسخہ خطِ حیری میں لکھا گیا تھا؛

(۴) اس میں صرف وہ آیتیں درج کی گئی تھیں جنکی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی،

(۵) اس کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن سے متعلق یہ تفصیلات ذہن میں رہیں تو اس روایت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد حضرت علیؓ نے قرآن کریم جمع کر لیا تھا، اس لئے کہ جہاں تک آیات قرآنی کے انفرادی مجموعوں کا تعلق ہے وہ سر

حضرت علیؓ نے ہی نہیں اور بھی متعدد صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، لیکن ایسا معیار کی

نسخہ جو پوری امت کی اجماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو سب سے پہلے حضرت ابو بکر

رضی اللہ عنہ نے تیار کر دیا،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لکھوانے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے

پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کی

وصیت کے مطابق انھیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل

۱۔ اتقان ۱۰ ج ۱

۲۔ منہل العرفان، ص ۲۲۶ و ۲۲۷ ج ۱ و تاریخ القرآن للکروی ص ۲۸ (۲)

۳۔ تاریخ القرآن از عبد الصمد ص ۳۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء

کر دیا گیا، پھر مروان بن حکم نے اپنے عہد حکومت میں حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفہ طلب کئے تو انھوں نے دینے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ جب حضرت حفصہؓ کی وفات ہو گئی تو مروان نے وہ صحیفہ منگوائے اور انھیں اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور ترتیب سورہ کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف کی اتباع لازمی ہے، اور کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو ان کے رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

تیسرا حصہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، ادھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرام نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود اُس نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا، اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے

کی قرارت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قرار توں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوا سے حضرت زیند کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، اور رے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیار ہی نہ موجود تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حردن کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حردن جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قرأت صحیح اور کونسی غلط ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا،

اس کارنامہ کی تفصیل روایات حدیث کے ذریعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قرار توں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہو آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمان نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا، وہاں میں دیکھا کہ شام کے لوگ ابی بن کعب کی قرأت پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی، سوتی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعود کی قرأت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں،

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قرأت کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلم نے دوسری قرأت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا

اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرارت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے اُن سے مشورہ کیا، اور فرمایا کہ ”مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرارت تمہاری قرارت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟“ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ”آپ نے کیا سوچا ہے؟“ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ”میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے“ صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی،

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ”ہم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قرارتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الادب قرار ہو،“ اس غرض کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابو بکرؓ کے زمانے کے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم تھے، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان صحابہؓ میں سے چار حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے

اُن سے فرمایا کہ جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصّہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم اپنی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، یہاں تک کہ ابن ابی داؤدؓ کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، جن میں حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت کثیر بن افلاجؓ، حضرت مالک بن ابی عامرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے۔

(۱) حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرار میں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر زبر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراروں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً مسرہا لکھا، تاکہ اسے نَسْرُهَا اور نُنْسِرُهَا دونوں طرح پڑھا جاسکے، کیونکہ یہ دونوں قرار تیں درست ہیں۔

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی

۱۳ یہ پوری تفصیل فتح الباری ص ۳ تا ۵ ج ۹ سے ماخوذ ہے،

۱۴ مستدرک حاکم، ص ۲۲۹ ج ۲،

۱۵ مناب العرفان ص ۲۵۳ و ۲۵۴ ج ۱،

ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ
مصحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم بھستانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ
کل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام،
ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ
میں محفوظ رکھا گیا،^۱

(۲) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو
سامنے رکھا جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اس کے ساتھ ہی
مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار فرمایا، جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ
کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے زمانے کی جو
متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، انھیں دوبارہ طلب کیا گیا
اور ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۃ
احزاب کی ایک آیت **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ
عَلَيْهِ عَلَيْهِ عَلْمٌ** لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی،
پہچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں
تھی، کیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

فَقَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْحِزَابِ حِينَ نَسَخْنَا الْمَصْحَفَ قَدْ كُنْتُ
أَسْمَعُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ بِهَا، فَالْتَمَسْنَا
فَوَجَدْنَا هَا مَعَ خَزِيمَةَ بْنِ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيِّ،
مجھے مصحف لکھتے وقت سورۃ احزاب کی آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ
خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی^۲

۱ صحیح بخاری فتح الباری، ص ۱۴ ج ۹

۲ صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۱۴ ج ۹

اس سے ساف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک ان تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۃ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی،

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش کر دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے، تاکہ رسم الخط، مسئلہ فتراقوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے،

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کا زمانہ کوپوری امت نے بہ نظر احسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش ہوئی تھی، جس کے اسباب ”سبعۃ احرف“ کی بحث میں گزر چکے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

لالتقوا فی عثمانؓ الاخیراً فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف
الا عن ملامتنا،

”عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوائے نہ ہو، کیونکہ اللہ کی قسم، انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں (اور)“

تہلیل تلاوت کے اقدامات

چوتھا مرحلہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؓ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی،

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر بر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہل عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے،

نقط اہل عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، بلکہ لکھنے والا خالی حروف لکھنے پر اکتفا کرتا تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، سیاق و سباق کی مدد سے مشتبه حروف میں امتیاز بھی آسانی ہو جاتا تھا، بلکہ بسا اوقات نقطے ڈالنے کو محبوب سمجھا جاتا تھا، مورخ مدائنی نے ایک ادیب کا مقولہ نقل کیا ہے کہ :-

كثرة النقط في الكتاب سوء ظن بالمتكاتب اليه
تخطت في كثرت من نقطه والنا مكتوب اليه (کی فہم) سے بدگمانی
کے مراد ہے «

چنانچہ مصاحف عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، اور عمومی رواج کے علاوہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ اس رسم الخط میں تمام متواتر قرار تیں سما سکیں، لیکن بعد میں عجمی اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی سہولت کے لئے قرآن کریم پر نقطے ڈالے گئے، اس میں روایات مختلف ہیں کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلقین کے تحت کیا، اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیانؓ نے ان سے یہ کام کرایا، اور بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے عبد الملک بن مروان کی فرمائش پر یہ کام کیا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ حجاج بن یوسفؓ نے حسن بصریؓ، یحییٰ بن یعربؓ اور نصر بن عاصم لیشیؓ کے ذریعہ انجام دیا، بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہی نقطوں کا موجد بھی ہی، اس سے پہلے نقطوں کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن علامہ قلعندیؒ نے جو رسم الخط اور فن انشاء کے محقق ترین عالم ہیں، اس کی تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ نقطوں کی ایجاد اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ایک روایت کے مطابق عربی رسم الخط کے موجد قبیلہ بولان کے مرآمر بن مرہ، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ ہیں، مرآمر نے حروف کی صورتیں ایجاد کیں، اسلم نے فصل وصل کے طریقے وضع کئے، اور عامر نے نقطے بنائے، اور ایک روایت یہ بھی

۱۔ البرہان فی علوم القرآن ص ۲۵۰ ج ۱ الاتقان ص ۱۱ ج ۱ ۲ نوع ۶۶ ،

۲۔ صبح الاعشی ص ۱۵۵ ج ۳ ،

۳۔ البرہان ص ۲۵۰ ج ۲ نوع ۱۲ ،

۴۔ الاتقان ص ۱۱ ج ۲

۵۔ تفسیر لفظی ص ۶۳ ج ۱ و تاریخ القرآن للکردی ص ۱۸۱ ،

۶۔ صبح الاعشی ص ۱۲ ج ۳ ،

ہے کہ نقطوں کے سب سے پہلے استعمال کا سہرا حضرت ابوسفیان بن حربؓ کے دادا ابوسفیان ابن امیہ کے سر ہے، انھوں نے یہ حجرہ کے باشندوں سے سیکھے تھے، اور حجرہ کے باشندوں نے اہل انبار سے؛ لہذا نقطے ایجاد تو بہت پہلے ہو چکے تھے، لیکن قرآن کریم کو متعدد مصلحتوں کے تحت اُن سے خالی رکھا گیا تھا، بعد میں جس نے بھی قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہ نقطوں کا موجد نہیں ہے، بلکہ صرف قرآن کریم میں ان کا استعمال سب سے پہلے اس نے کیا؛

حركات | نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر زبر پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے، کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؓ اور نصر بن عامر لیشیؓ سے کرایا، اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؓ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل معروف ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ (ـ) زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ (ـ) پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ (ـ) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ت) یا (ـ) یا (ـ) معتز کے لئے بعد میں خلیل بن احمدؓ نے ہمزہ اور شدید کی علامتیں وضع کیں، اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؓ، نصر بن عامرؓ اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی اس موقع پر

۱۵ صبح الاعشی، ص ۱۳ ج ۳

۱۵ صبح الاعشی ص ۱۵۵ ج ۳ ۱۵ تفسیر القرطبی، ص ۶۳ ج ۱

۱۵ صبح الاعشی ص ۱۶۰ ج ۳ و تاریخ القرآن لکرم دی، ص ۱۸۰

۱۵ الاتقان ص ۱، ج ۲ و صبح الاعشی ص ۱۶۱ ج ۳

حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی موجودہ صورتیں (عربی) معترض کی گتیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے ان کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم،

احزاب یا منزلیں | صحابہؓ اور تابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر سفتے ایک قرآن کریم ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت

کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے "حزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح قرآن کریم کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا، حضرت اوس بن حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ سے پوچھا آپ نے قرآن کے کتنے حزب بنائے ہوئے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایک حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا تیسرا سات سورتوں کا، چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، چھٹا تیرہ سورتوں کا، اور آخری حزب مفصل میں ق سے آخر تک کا،

اجزایا پائلے | آجکل قرآن کریم تین اجزاء پر منقسم ہے جن میں تیس پائلے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے

کے لئے آسانی کے خیال سے تین مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تین پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے مصاحف نقل کرتے وقت ان میں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانے کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے دستاویز نسخوں میں ان کا رواج ہے، بظاہر

لہ البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۵۰ ج ۱،

لہ تاریخ القرآن از مولانا عبدالصمد صآرم، ص ۸۱،

لہ البرہان، ص ۲۵۰ ج ۱، حزیہ دیکھئے مناقب العرفان، ص ۲۰۲ ج ۱،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم
اخماس اور اعشار | قردن اولیٰ کے فتر آنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ "خمس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اخماس" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا، علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مأمون نے اس کا حکم دیا تھا، لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، مصنف ابن ابی شیبہؒ میں روایت ہے:

عن مسروق عن عبد الله بن مسعود انه كره التعشير في المصحف
 "مسروق کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مصحف میں اعشار کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اعشار" کا تصور صحابہؓ کے زمانے ہی میں پیدا ہو چکا تھا، ایک اور علامت جس کا رواج بعد میں ہوا، اور آج تک جاری ہے رکوع **رکوع** | کی علامت ہے، اور اس کی تعیین معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہو وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف "ع") بنا دی گئی، اس کو جتو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور

۱۔ ماہل العرفان، ص ۲۰۳ ج ۱ ۲۔ الاتقان، ص ۱۷۱ ج ۲، فرع ۷۷

۳۔ البرہان، ص ۲۵ ج ۱

۴۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ، ص ۲۹۷ ج ۲، کتاب الصلوة، مطبعة العلوم الشریعیہ دکن

۳۸۷

میں کی؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان رکوعات کی تعیین بھی حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں ہو چکی تھی، لیکن روایات سے اس دعوے کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو ”رکوع“ اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

ان المشائخ رحمهم الله جعلوا القرآن على خمس مائة واربعين ركوعاً وادعوا لذلك في المصاحف حتى يحصل النخم في ليلة السابعة والعشرين^١؛

”مشائخ نے قرآن کریم کو پانچ سو چالیس رکوعوں پر تقسیم کیا ہے، اور مصحف میں اس کی علامتیں بنا دی ہیں، (تاکہ) تراویح میں، قرآن کا ختم ستائیسویں شب میں ہو سکے“

رموز اوقات تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارات لکھ دیتے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو ”رموز اوقات“ کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی دان انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد بن طیفیل سجاولی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے ہیں، ان رموز کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ تاج القرآن از مولانا عبدالصمد ص ۸۱

۲۔ فتاویٰ عالمگیریہ، فصل التراویح ص ۹۴ ج ۱ مطبوعہ نولکشور،

۳۔ النشر فی القراءات العشر لابن الجزری ص ۲۲۵ ج ۱

۴۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے لیکن جہیم نے قرآن کریم کے قرون نسخوں میں جو کتب کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی۔ اور بعض اصحاب نے ہمیں خطیں لکھا کہ ان کی کتب کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رکوع کی علامت لگانے میں مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو۔ واللہ اعلم
از ناشر
۱۳/۱۲/۹۳ھ

ط، یہ ”وقف مطلق“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے،

ج، یہ ”وقف جائز“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے،

نہ، یہ ”وقف مجوز“ کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا تو درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے،

ص، یہ ”وقف مخصص“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دو سر مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے،

ہر، یہ ”وقف لازم“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے ”وقف واجب“ بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا زیادہ بہتر ہے،

لا، یہ ”لَا تَقِفْ“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ ٹھہرو، لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹنا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں ہے۔

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاد ندویؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں مثلاً:۔
 مع، یہ بمعانفہ“ کا مخفف ہے، یہ علامت اُس جگہ لکھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ ۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ ۖ كَشَرٍ رَّعِ اَخْرَجَ شَطْرًا ۗ الْح، اس میں اگر التورۃ پر وقف کر لیا تو الانجیل پر وقف درست نہیں، اور اگر الانجیل پر وقف کرنا ہے تو التورۃ پر درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں، تو درست ہے، اس کا ایک نام ”مقابلہ“ بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دہی امام ابو الفضل رازیؒ نے فرمائی ہے؛

سکتہ، یہ ”سکتہ“ کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہئے لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو،

وقفہ؛ اس جگہ ”سکتہ“ سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے،

ق؛ یہ ”قیل علیہ الوقف“ کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے،

قف؛ یہ لفظ ”قف“ ہے، جس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، اور یہ اُس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں،

صلیٰ؛ ”الوصل اولیٰ“ کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں کہ ”ملا کر پڑھنا بہتر ہے“
 صل؛ ”قدیوصل“ کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملا کر
 پڑھنے کو پسند کرتے ہیں،
 یہ رموز کافی مشہور ہیں، لیکن احقر کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا واضح دمج
 کون ہے؟

قرآن کریم کی طباعت پانچواں مرحلہ

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے
 تھے، اور ہر ذر میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن
 کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے
 مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف
 کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے، جس کے لئے مستقل تصنیف
 چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں،

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے تیمبرگ کے مقام پر ۱۳۱۱ھ میں قرآن کریم
 طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد
 مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل
 نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر
 سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۸۵۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان
 میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۶۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر
 چھاپا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے،

۱۔ طباعت کی تاریخ کے لئے دیکھئے تاریخ القرآن لکھنؤ، ص ۸۶ اور علوم القرآن ڈاکٹر صبحی صالح

فِترَاتُ اُور اُن کی تَدْوِیْن

”مسبۃ احرف“ کی بحث میں گذر چکا ہے کہ تلاوت کی سہولت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فِترَآنِ کریم کو متعدد قراءتوں میں نازل فرمایا تھا، قراءتوں کے اس اختلاف سے آیات کے مجموعی معنی میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن تلاوت اور ادائیگی کے طریقوں میں فرق ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے آسانی پیدا ہو گئی ہے، ائمہ مسلمہ نے فِترَآنِ کریم کی ان قراءتوں کو بھی ہر دور میں محفوظ رکھا ہے، اور اس غرض کے لئے بے مثال خدمات انجام دی ہیں، یہاں ان جلیل القدر خدمات کا مختصر تذکرہ بھی ممکن نہیں، البتہ چند اشارات ضروری ہیں،

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ فِترَآنِ کریم کی اشاعت کا اصل مدار کتابت کے بجائے حافظہ اور نقل و روایت پر ہے، ادھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مصاحف عثمانی کو نقل و روایات سے اسی لئے خالی رکھا گیا تھا، تاکہ اس میں تمام مسلم قراءتیں سما سکیں، چنانچہ جب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مصاحف عالم اسلام کے مختلف خطوں میں روانہ کئے تو اُن کے ساتھ ایسے فِترَآن کو بھی بھیجا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انھوں نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق لوگوں کو فِترَآنِ کریم کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح ”علم قراءت“ کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری اُمت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ ”قراءت“ قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں :-

۱۔ مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو،

۲۔ عربی صرف و نحو کے قواعد کے مطابق ہو،

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قرآن میں مشہور ہو۔

جس قرأت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو، اسے قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا، اس طرح متواتر قرأتوں کی ایک بڑی تعداد نسلابعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قرأتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قرأت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قرأتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنی شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبیدہ قاسم ابن سلامؓ، امام ابو حاتم سجستانیؓ، قاضی اسمعیلؓ اور امام ابو جعفر طبریؓ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں، جن میں بیس سے زیادہ قراتیں جمع کھیں، پھر علامہ ابو بکر احمد بن موسیٰ بن عباس ابن مجاہدؓ (متوفی ۲۴۲ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قرأت کی قراتیں جمع کی گئی تھیں، ان کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قرات کی قراتیں دوسرے قرات کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراتیں یہی ہیں باقی قاریوں کی قراتیں صحیح یا متواتر نہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؓ نے محض اتفاقاً ان سات قرأتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا اور دوسری قراتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہدؓ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ ”سبعۃ احرف“ کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراتیں مراد ہیں جنہیں ابن مجاہدؓ نے جمع کیا ہے، حالانکہ ”سبعۃ احرف“ کی صحیح تشریح وہ ہے جو پچھلے ایک مستقل عنوان کے تحت گزر چکی ہے،

بہر حال، علامہ ابن مجاہدؓ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے

وہ یہ ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن کثیر الداریؓ (متوفی ۱۲۲ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس

بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابویوب انصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قرأت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قرأت کے راویوں میں بڑھی اور قبل زیادہ مشہور ہیں،

۲۔ نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیمؓ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا، جو براہ راست حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قرأت مدینہ منیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کے راویوں میں ابوموسیٰ قالونؓ (متوفی ۱۶۹ھ) اور ابوسعید دریش زہمؓ (متوفی ۱۶۹ھ) مشہور ہوئے،

۳۔ عبداللہ النجیبی جو ابن عامر کے نام سے معروف ہیں، (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قرأت کافن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؓ سے حاصل کیا، جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قرأت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور ان کی قرأت کے راویوں میں ہشام اور ذکوان زیادہ مشہور ہیں،

۴۔ ابو عمر زبان بن العلاء بن عمارؓ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے حضرت مجاہدؓ اور سعید بن جبیرؓ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قرأت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قرأت کے راویوں میں ابو عمر الدوریؓ (متوفی ۱۶۹ھ) اور ابوشعیب سوسیؓ (متوفی ۱۶۹ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۵۔ حمزہ بن حبیب التیامیؓ مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمی (متوفی ۱۸۸ھ) آپ سلیمان اعشىؓ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؓ کے اوہ زبیر بن حبیشؓ کے، اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشامؓ (م ۱۸۸ھ) اور خالد بن خالدؓ (م ۱۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۶۔ عام ابن ابی الجود الاسدی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت زبیر بن جلدیؓ کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اور ابو عبد الرحمن سہلیؓ کے واسطے سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قرأت کے راویوں میں شعب بن عیاش (متوفی ۱۳۷ھ) اور حفص بن سلیمانؓ (متوفی ۱۳۷ھ) زیادہ مشہور ہیں، آجکل عموماً تلاوتِ حفصؓ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے،

۷۔ ابوالحسن علی بن حمزہ الکسانی النخویؓ (متوفی ۱۵۹ھ) ان کے راویوں میں... ابوالحارث مروزیؓ (متوفی ۱۷۷ھ) اور ابو عمر الدوریؓ (جو ابو عمروؓ کے بھی راوی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قرأت میں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں،

لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قرأتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بدینِ جتّ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ صحیح قرأتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدد علماء نے (مثلاً علامہ شذلیؒ اور ابو بکر بن ہرآنؒ نے) سات کے بجائے دس قرأتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ ”قرأتِ عشرہ“ کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دس قرأتوں میں مندرجہ بالا سات قرأت کے علاوہ ان تین حضرات کی قرأتیں بھی شامل کی گئیں:-

۱۔ یعقوب بن اسحاق حضرمیؓ (متوفی ۲۶۵ھ) آپ نے سلام بن سلیمان الطویل سے استفادہ کیا اور انھوں نے عامؓ اور ابو عمروؓ سے، آپ کی قرأت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی،

۲۔ خلف بن ہشامؓ (متوفی ۲۵۲ھ) آپ نے سلیم بن عیسیٰ بن حمزہ بن جبیب زبیر سے استفادہ کیا تھا، چنانچہ آپ حمزہؓ کی قرأت کے بھی راوی ہیں آپ کی قرأت کوفہ میں زیادہ رائج تھی،

۳۔ ابو جعفر یزید بن القعقاع (متوفی ۳۳ھ) آپ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ سے استفادہ کیا تھا، اور آپ کی قرأت مدینہ طیبہ میں رائج رہی،

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چوڑے قاریوں کی قرأتیں جمع کیں، اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قرأت کی قراتوں کا اضافہ کیا:-

۱۔ حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) آپ کبار تابعین میں سے ہیں، اور آپ کی قرأت کامرکز بصرہ میں تھا،

۲۔ محمد بن عبدالرحمن ابن محیصنؒ (متوفی ۲۳۳ھ) آپ حضرت مجاہدؒ کے شاگرد اور ابو عمروؒ کے استاذ ہیں، اور آپ کامرکز مکہ مکرمہ میں تھا،

۳۔ یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۱۸۷ھ) آپ بصرہ کے باشندے تھے، اور ابو عمروؒ اور حمزہؒ سے استفادہ کیا تھا،

۴۔ ابو الفرج محمد بن احمد شنبوزیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ بغداد کے باشندے تھے، اور اپنے استاذ ابن شنبوزیؒ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے شنبوزی کہلاتے تھے،

بعض حضرات نے چوڑے قاریوں میں حضرت شنبوزیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے،

ان میں سے پہلی دس قرأتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں،

ہمارے زمانے کے مشہور مستشرق منٹگمری واٹ (Montgomery watt)

نے اپنے استاذ بیل (Bell) کی متابعت میں علامہ ابن مجاہدؒ کے عمل کی جو غلط تشریح کی ہے یہاں اس کی نشان دہی بھی مناسب ہے، انھوں نے لکھا ہے

کہ ابن مجاہد نے سات قرابتیں جمع کر کے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ حدیث میں قرآن کریم کے جن "سات حروف" کا تذکرہ ہو ان سے یہی "سات قرابتیں" مراد ہیں، دوسری طرف ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان سات قرابتوں کے علاوہ دوسری کوئی قرابت قابل اعتماد نہیں چنانچہ دوسرے علمائے نے بھی ان کے اس نظریہ کو قبول کر لیا، اور اسی بنا پر علامہ ابن مقسم اور ابن شبنوز کو اپنے نظریات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا، کیونکہ وہ دوسری قرابتوں کو بھی قابل اعتماد سمجھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ واٹ کے مذکورہ بالا بیان میں ایک بات بھی درست نہیں، ہم سچے بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں مختلف علماء اور قرآن نے اپنی اپنی سہولت کے لحاظ سے کئی کئی قرابتیں ایک ایک کتاب میں جمع کر رکھی تھیں، ان میں سے کسی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کے علاوہ دوسری قرابتیں ناقابل اعتماد ہیں، خود امام ابن مجاہد نے بھی ان سات قرابتوں کو جمع کرتے وقت کہیں یہ نہیں لکھا کہ "سات حروف" کی تشریح ہے، اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ صحیح قرابتیں انہی سات میں منحصر ہیں، دوسرے علماء نے بھی ان کے عمل سے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ دوسری قرابتوں کو ناقابل اعتماد قرار دینا چاہتے ہیں، اس کے بجائے تمام محقق علماء اس خیال کی ہمیشہ تردید کرتے آئے ہیں، علم قرأت کے مستند ترین عالم علامہ ابن الجزری نے جو "محقق" کے لقب سے مشہور ہیں اپنی کتابوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ہے، ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"ہم نے اس بحث کو اس لئے طول دیا ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض بے علم لوگ صرف انہی سات قرابتوں کو صحیح سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد صرف یہی سات

قرارتیں ہیں..... اسی بنا پر بہت سے ائمہ متقدمین نے ابن مجاہد پر یہ تنقید کی ہے کہ انہیں سات قرارتیں جمع کرنے کے بجائے سات سے کم یا سات سے زائد قرارتیں ذکر کرنی چاہئے تھی، یا اپنی مراد واضح کر دینی چاہئے تھی تاکہ بے علم لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔^۱

حافظ ابن حجر^۲ اور علامہ سیوطی^۳ نے بہت سے ائمہ قرارت کے اقوال نقل کئے ہیں، جن میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ابن مجاہد نے صرف ”مصاحف سبعہ“ کے عدد کی رعایت سے ”سات قرارتیں“ جمع کر دیں، ورنہ ان کا مقصد باقی قرارتوں کو غلط یا ناقابل اعتماد قرار دینا نہیں تھا۔^۴

رہا ابن مقسم^۵ اور ابن شبنوذہ کا قصہ، تو دراصل علماء نے جو ان کی تردید کی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان سات قرارتوں کے علاوہ دوسری قرارتوں کو کیوں صحیح سمجھتے ہیں؟ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُمت کے تمام علماء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ کسی قرارت کے صحیح ہونے کے لئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے، ایک یہ کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ عربی صرف و نحو کے قواعد کے مطابق ہو، تیسرے یہ کہ وہ صحیح سند کے ساتھ منقول اور ائمہ قرارت میں مشہور ہو، یہ شرائط جس قرارت میں بھی پائی جائیں وہ قابل قبول ہے، خواہ وہ سات قرارتوں میں شامل ہو یا نہ ہو، اور جہاں ان میں سے کوئی بھی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ ناقابل اعتماد ہے، خواہ وہ ان سات قرارتوں میں شامل ہی کیوں نہ ہو، لیکن ابن مقسم^۶ اور ابن شبنوذہ نے اس اجماعی اصول کی خلاف ورزی کی تھی، ابوبکر محمد بن مقسم^۷ کا کہنا یہ تھا کہ قرارت

۱۔ النثر فی القراءات العشر، ص ۳۵ و ۳۶ ج ۱

۲۔ فتح الباری، ص ۲۵ تا ۲۷ ج ۹ والاتقان ص ۸۲ و ۸۳ ج ۱، نورع ۲۲

۳۔ ابن مقسم کا پورا نام ابوبکر محمد بن الحسن بن یعقوب اور ابن شبنوذہ کا پورا نام محمد بن احمد ابن یثوب ہے،

کے صحیح ہونے کے لئے صرف پہلی دو شرطیں کافی ہیں، لہذا اگر کوئی قرارت مصحف عثمانی کے رسم الخط کے مطابق ہو اور عربیت کے لحاظ سے بھی صحیح ہو تو اسے قبول کر لیا جائے گا، خواہ اس کی کوئی سند موجود نہ ہو، اور ابن شبنوذ نے اس کے برعکس یہ کہا تھا کہ اگر کوئی قرارت صحیح سند سے منقول ہو تو خواہ رسم عثمانی میں اس کی گنجائش نہ نکلتی ہو، اسے پھر بھی قبول کر لیا جائیگا، اس بنا پر اُمت کے تمام علماء نے ان دونوں کی تردید کی، اس مقصد کے لئے مباحثہ کی مجلسیں بھی ہوئیں، اور بالآخر ان دونوں نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کر لیا:

—————

۱۔ التشریح فی القراءات العشر، ص ۳۵۱ ج ۱ اولاتقان ص ۱۹ ج ۱ و تاریخ بغداد،
للخطیب ص ۲۸۰ ج ۱ طبع بیروت و دوفیات الاعیان لابن خلکان، ص ۲۹۰ ج ۱ طبع مصر

حفاظتِ قرآن متعلقِ شبہات

اور ان کا جواب

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا تھا:-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَعَافِيُونَ ۝

ہم نے ہی قرآن کریم نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کریں گے۔

اس میں یہ پیشینگوئی کر دی گئی تھی کہ قرآن کریم قیامت تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہے گا، اور دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹانے یا اس میں تحریف و ترمیم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی، گزشتہ صفحات میں آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پیشینگوئی کو عملی طور پر کس طرح سچا کر کے دکھایا، اور ہر دور میں اس کی کس طرح حفاظت کی گئی، چنانچہ آج یہ بات پورے دثوق اور دعوے کے ساتھ بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم ہمارے پاس اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم دی تھی، اور اس میں آج تک کسی ایک نقطے یا شوشے کا بھی فرق نہیں ہو سکا،

یہ بات صرف مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں بلکہ منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور اس سے انکار کی جرأت نہیں کی، لیکن جب نگاہوں پر تعصب یا عناد کا پردہ پڑ جائے تو ایک شفاف چشمہ بھی گرد لگانے لگتا ہے، چنانچہ بعض غیر مسلم مصنفین نے قرآن کریم کی حفاظت کے معاملہ میں بھی کچھ شبہات اعتراض اٹھائے ہیں، یہاں ہم ان شبہات کی حقیقت اختصار کے ساتھ واضح کرنا چاہتے ہیں، ابتدائی زمانہ کی کچھ آیات محفوظ

نہیں رہیں، پہلا اعتراض

قرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں، بلکہ ان کی حفاظت کا سارا دار و مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حفظ پر تھا، چنانچہ عین ممکن ہو کہ ابتدائی زمانہ کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہوں، اس دعوے کی دلیل میں پہلے نے قرآن کریم کی دو آیتیں پیش کی ہیں:-

۱- سَنَقِرُ لَكَ فَلَا تَنْسِي إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ،

(سورۃ اعلیٰ: ۶)

ہم آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ بھولیں گے نہیں، مگر جو کچھ اللہ چاہے

۲- مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِمَّا

أَوْ مِثْلَهَا، (بقرہ: ۱۰۹)

”ہم جس آیت کو منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے ہم اس سے

بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے“

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقفیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم

کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

پہلی آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دہراتے رہتے تھے، اور اس میں آپ کو شدید تعب ہوتا تھا، اس آیت میں آپ کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہذا آپ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے، لیکن اس پر یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظ سے محو ہو گئیں، اس کا جواب دینے کے لئے **إِنَّمَا مَّا شَاءَ اللَّهُ** (مگر جو کچھ اللہ چاہے) کے الفاظ بڑھادیئے گئے، جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اسی وقت وہ آیت آپ کے حافظ سے محو ہو سکے گی اس کے بغیر نہیں، اسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہونے کی بنا پر آپ کے اور صحابہ رض کے حافظوں سے محو ہو جائیں گی،

لہذا ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرمادیا تو ان کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا، مگر ساتھ ساتھ انھیں لوگوں کے حافظے سے بھی محو کر دیا گیا، ورنہ جہاں تک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو صراحتہً کہا جا رہا ہے کہ آپ انھیں کبھی نہیں بھول سکیں گے، اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوئیں، ان کے فراموش ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے؟

رہا ان آیتوں سے اس بات پر استدلال کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کریم لکھا نہیں جانا تھا، سو یہ ایک قطعی بے بنیاد اور لغو استدلال ہے، ہم سچے پتا سچے

ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے قرآن کریم کی آیتوں کا صحیحہ کے پاس لکھا ہوا ہونا مستند روایات سے ثابت ہے، لہذا پہلی آیت میں صرف ”نسیان“ (مُجْهولِ جانے) کے ذکر پر اکتفا کا منشا یہ نہیں ہے کہ اس وقت قرآن کریم مکتوب شکل میں نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں ذکر ہی صرف ”نسیان“ کا چل رہا ہے، اس لئے اس مقام پر لکھی ہوئی آیتوں کو مٹانے کا ذکر کیا جاتا تو وہ قطعی بے موقع اور بے محل بات ہوتی، یہی وجہ ہے کہ دوسری آیت میں چونکہ ”نسخ“ ہی موضوع گفتگو ہے اس لئے اس میں ”نسخ“ لکھے ہوئے کو مٹانے اور ”انسا“ (بھلا دینا) دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ”نسخ“ کے لغوی معنی زائل کرنے اور مٹانے کے آتے ہیں لہذا یہ لفظ صراحتاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود تھا، اور اس کی بعض آیتوں کو منسوخ ہونے کی بنا پر مٹایا گیا ہے، حیرت ہو کہ یہ آیت جو صراحتاً قرآن کریم کے مکتوب ہونے پر دلالت کر رہی ہے اس کو پہلے قرآن کے غیر مکتوب ہونے کی تائید میں پیش کر رہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ
ایک آیت یاد نہیں ہی تھی؛ دوسرا اعتراض

بنانے کی کوشش کی ہے، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو مسجد میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا کہ :-

وَحِمَّةُ اللَّهِ، لَقَدْ آذَكْرَنِي آيَةٌ كُنْتُ أَسْلَيْتُهَا،
”اللہ ان پر رحم کرے، انھوں نے مجھے ایک ایسی آیت یاد دلادی

جو مجھ سے بھول گئی تھی بلکہ

اس روایت کو ذکر کرنے سے مار گویا توتھ کا مقصد یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کسی وقت بھول سکتے ہیں تو (معاذ اللہ) دوسری آیات میں بھی یہ امکان ہے، نیز وہ اس روایت سے غالباً یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کریم مکھا ہوا نہیں تھا، ورنہ آپؐ یہ آیت نہ بھولتے، لیکن یہ اعتراض اس قدر بھرا اور بے بنیاد ہے کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسے درست تسلیم نہیں کر سکتا، کیونکہ مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بسا اوقات ایک بات انسان کو یاد تو ہوتی ہے، مگر چونکہ عرصہ دراز تک اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، نہ اُس کی طرف خیال جاتا ہے، اس لئے وہ ذہن میں مستحضر نہیں رہتی، اور جب کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ فوراً حافظے میں تازہ ہو جاتی ہے، یہ حقیقت میں بھول نہیں ہوتی، بلکہ عارضی طور پر خیال سے نکل جانا ہوتا ہے، یہی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی، اس لئے ایسے واقعہ کو بنیاد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسیان کی... نسبت کرنا اتہام درجے کی بے انصافی ہے، جس کا منشا تبعتب کے سوا کچھ نہیں، بلکہ اگر مسٹر مار گویا توتھ بصیرت اور انصاف کی نگاہ سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اس واقعے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اس غیر معمولی طریقے سے فرمائی ہے کہ اس کے کسی حصے کے گم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، کیونکہ اس واقعے سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت اتنے بے شمار افراد کو یاد کرادی گئی تھی کہ اگر کوئی آیت کسی وقت اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر مستحضر نہ رہے تب بھی اس کے ضائع ہونے کا ڈر و ڈور کوئی امکان نہیں تھا،

رہی یہ بات کہ اُس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں

موجود نہیں تھا، سو یہ پہلی بات سے زیادہ بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہے، اہم عرض کر چکے ہیں کہ واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر مستحضر نہیں رہی تھی، جو ایک صحابی کی تلاوت سے فوراً ذہن میں تازہ ہو گئی، اس کے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود نہیں تھا، کیا مستشرق موصوفہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک مرتبہ لکھی گئی وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ذہن سے اوجھل نہیں ہو سکتی؛ پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آتی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے آپ کے قرآن کریم کو یاد رکھنے کا کتابت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا، لہذا مذکورہ واقعہ سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال وہی شخص کر سکتا ہو جس نے اپنے اوپر انصاف اور بصیرت کے سارے دروازے بند کر لئے ہوں،

سورۃ نسا میں سورۃ العام کا حوالہ | پروفیسر مارگولینو تھ نے قرآن کریم کے
تیسرا اعتراض غیر مکتوب ہونے پر ایک اور عجیب و
غریب استدلال یہ کیا ہے کہ سورۃ نسا۔

میں قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

وَقَدْ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ دَاعِيَةَ اللَّهِ
يُكْفِرُ بِهَا وَكَيْفَ تَكْفُرُ بِهَا فَمَا كُنْتُمْ تُكْفِرُونَ بِهَا فَمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ وَأَمْعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا
فِي حَيْثُ يَنْتَهِرُهُمْ غَيْرِهِ (نساء: ۱۲۰)

”اور اللہ تم پر قرآن میں یہ اتار چکے ہے کہ جب تم (کسی مجلس میں) اللہ کی
آیتوں کے ساتھ کفر اور استہزاء ہوتا ہو اسنو تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو، نہ تک
کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں“

یہ آیت مدنی ہے اور اس میں سورۃ العام کی جس مکی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ
مندرجہ ذیل ہے :-

وَإِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ
حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَيْثُ يَنْتَهِرُهُمْ غَيْرِهِ ط (الانعام: ۶۸)

”اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب جوئی کرتے ہیں تو ان

لوگوں سے کنارہ کش ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں“

پہلی آیت میں دوسری آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن دونوں کے الفاظ مختلف ہیں، مارگوئیو نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کریم کی آیات لکھی ہوئی نہیں تھیں، ورنہ اگر قرآن لکھا ہوا ہوتا تو پہلی آیت میں بعینہ وہی الفاظ ذکر کئے جاتے جو دوسری آیت میں مذکور ہیں، الفاظ کے اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کے نزول کے وقت دوسری آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے،

لیکن مارگوئیو تھ کا یہ استدلال اس قدر بدیہی طور پر غلط ہے کہ اس کا جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر سورہ نساء کے نزول کے وقت سورہ انعام کی مذکورہ آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے تو پھر بعد میں وہ کیسے قرآن کریم میں لکھے گئے؟ اگر سورہ انعام کے اصل الفاظ محفوظ نہ ہوتے تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ بعد میں لکھنے والے سورہ انعام میں بھی بعینہ وہ الفاظ لکھے جو سورہ نساء میں مذکور ہیں، ان دونوں آیتوں کا لفظی اختلاف تو درحقیقت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں آیتوں کے الفاظ ہمیشہ سے پوری طرح محفوظ اور غیر متبدل تھے، اور ان میں کسی کے قیاس و گمان کو کوئی دخل نہیں رہا، کیونکہ اگر قرآن کریم کی کتابت قیاس اور اندازے سے ہوئی ہوتی تو ان دو آیتوں کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے تھا،

واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے محاورات میں جب کسی سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، بعض مرتبہ سابقہ گفتگو کے بعینہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں (جسے انگریزی میں

Direct Narration کہتے ہیں)

اور بعض اوقات الفاظ بعینہ وہی نہیں ہوتے صرف سابقہ گفتگو کے بنیادی مفہوم کو

دوسرے الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے (جسے انگریزی میں Indirect Narration

کہا جاتا ہے) ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت بہت کم استعمال

ہوتی ہے، یعنی ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جس سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جا رہا ہو اس کے پورے پورے الفاظ دہرائے جائیں، اس کے بجائے ادبی محاورات میں زیادہ تر دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے، یعنی اس گفتگو کے مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا جاتا ہے، سورۃ نسا میں بھی یہی دوسری صورت اختیار کی گئی ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فترآن کریم کی ہر سورۃ بسا اوقات اپنے جملوں کی ساخت کے اعتبار سے جداگانہ اُسلوب رکھتی ہے، لہذا اگر ایک سورت کے جملوں کے درمیان کسی دوسری سورت کا جملہ بعینہ جوڑ دیا جائے تو آیتوں کے تسلسل (Sequence) میں فرق پڑ جاتا ہے، اور جملوں کی وہ روانی (Flow) برقرار نہیں رہتی جس کی اثر انگیزی سب کے نزدیک مسلم ہے، چنانچہ جس شخص کو بھی ادبی ذوق کا کچھ حصہ ملا ہو وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر سورۃ نسا کی مذکورہ آیت میں سورۃ انعام کے بعینہ الفاظ نقل کر دیئے جائیں تو عبارت کا زور اور تسلسل ٹوٹ جائے گا،

اس کے علاوہ سورۃ انعام جس کی مذکورہ آیت کے بارے میں مارگو کیونجھ کا دعویٰ ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہیں تھی، پوری کی پوری ایک مرتبہ نازل ہوئی ہے، اور اس میں یہ آیت بھی موجود ہے :-

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا بَيْنَ يَدَيْهِ

(انعام: ۹۲)

”اور یہ (قرآن) بھی ایسی ہی کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، جو بڑی برکت والی ہے اور اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں (تورات و انجیل وغیرہ) کی تصدیق کرنے والی ہے“

اس میں قرآن کے لئے لفظ ”کتاب“ استعمال کیا گیا ہے، اگر سورۃ انعام کے نزول کے وقت تک قرآن کریم کو لکھنے کا معمول نہیں تھا تو اسے ”کتاب“ کہنے کا کیا مطلب ہو سکتا؟

غرض جس پہلو سے دیکھئے، مارگو کیوتھ کا یہ اعتراض بالکل بے بنیاد، لغو اور محض تعصبی
عناد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے،

امام بخاریؒ پر مارگو کیوتھ کا ایک بہتان
چوتھا اعتراض
پر ایک چوتھا اعتراض ان الفاظ
میں کیا ہے:-

”بخاریؒ کا کہنا ہے کہ ایک جملہ **إِلَّا أَنْ تَصَلُّوا مَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَبَيْنَ تَكْبَرِهِ**
مِنَ الْقَرَابَةِ، درمیرہ کہ تم اس رشتہ داری کا پاس کر دو میرے اور تمہارے
درمیان موجود ہے، بذریعہ وحی نازل ہوا تھا، لیکن مشراح کا کہنا ہے کہ یہ جملہ
قرآن میں نہیں ملتا، اس لئے وہ اس جملے کو سورۃ **عَلَا** آیت **عَلَا** یعنی **إِلَّا**
الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى کی تشریح قرار دیتے ہیں۔“

لیکن ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ مارگو کیوتھ جلیبے
عالمی شہرت کے مستشرق نے امام بخاریؒ پر ایسا شرمناک بہتان باندھا ہے جس کی متعصبانہ
بددیانتی یا افسوسناک جہالت کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اس عبارت کے مارگو کیوتھ
نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ امام بخاریؒ ایک ایسے جملے کو قرآن کریم کا جزو ماننے میں
جو اس وقت قرآن میں موجود نہیں ہے، حالانکہ ہر شخص صحیح بخاری اٹھا کر دیکھ سکتا ہے
کہ امام بخاریؒ نے آیت کے الفاظ بعینہ وہی نقل کئے ہیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں،
اور **إِلَّا أَنْ تَصَلُّوا** الخ والا جملہ اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے، امام بخاریؒ کی پوری
عبارت یہ ہے:-

باب قوله **إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى** حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ
عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ قَوْلِهِ **إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى**
فَقَالَ سَعِيدُ بْنُ جَبْرِ قُرْبَى آلُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فقال ابن عباس عجلت، ان النبي صلى الله عليه وسلم لم يكن بطن من قرئش الا كان له فيهم قرابة فقال الا ان تصلوا ما بيني وبينكم من القرابة

ملاحظہ فرمائیے، یہاں امام بخاری نے باب کے عنوان میں آیت کا وہی جملہ نقل کیا ہے، جو قرآن کریم میں موجود ہے، پھر اس کی تشریح میں حضرت ابن عباس سے آیت **اَلَا اَلتَّوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ** کی تفسیر پوچھی گئی تھی جس کے جواب میں آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ **اَلَا اَن تَصَلُوْا مَا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقُرَابَةِ**، لیکن مارگو ليو تھ ص ۱۰ پوری ڈھٹائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ امام بخاری اس جملے کو بذریعہ وحی نازل شدہ مانتے ہیں، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحقیق و انصاف کے یہ دعویٰ قرآن کریم کے خلاف تعصب کے کس ادھی روگ میں مبتلا ہیں، اور اسلام کے خلاف بغض و عناد نے انھیں کس بُری طرح جکڑا ہوا ہے، **فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا** حضرت عائشہ سے کچھ آیتیں گم ہو گئی تھیں | مارگو ليو تھ نے پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ مسند احمد کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے

پانچواں اعتراض

کہ حضرت عائشہ سے کچھ آیتیں گم ہو گئی تھیں

یہاں مارگو ليو تھ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے :-
عن عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم قالت لفتن انزلت آية الرجم ورضعات الكبير عشر فكانت في ورقة تحت سرير في بليتي فلما اشتكى رسول الله صلى

لہ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۃ حم عسق، ص ۴۱۳، ج ۲، طبع کراچی، دفعہ الباری

ص ۲۴۵، ج ۸ و عمدة القاری، ص ۱۵۷، ج ۱۹

لہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایٹھکس، ص ۵۴۳، ج ۱۰

علیہ وسلم تشاغلنا بامرہ و دخلت دویۃ لنا فاکلمتها،
حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ رحم کی آیت اور بڑے آدمی کے دل رضعت
کی آیت نازل ہوئی تھیں، یہ آیتیں میرے گھر میں ایک تخت کے نیچے غنڈ
پر رکھی ہوئی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (مرضِ وفات کی)
تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے، ہمارا
ایک پالتو جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھا لیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا کہ
یہ باجماع امت وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی، خود حضرت عائشہ
بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوة ہونے کی قائل ہیں، لہذا اگر انھوں نے یہ آیات
کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منشاء سوائے ایک یادگار کے تحفظ کے
کچھ نہ تھا، ورنہ اگر یہ آیات حضرت عائشہ رضی کے نزدیک قرآن کریم کا جزو ہوتیں تو
وہ کم از کم ان کو تو یاد رکھیں، وہ ان کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں، لیکن
انھوں نے ساری عمر ایسی کوشش نہیں کی، اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت
عائشہ رضی کے نزدیک یہ آیات محض ایک علی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں اور قرآن کریم
کی دوسری آیات کی طرح اس کو مصحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیش نظر
بھی نہیں تھا، لہذا اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرج نہیں آتا،

عہد رسالت میں حفاظ کی تعداد | بعض حضرات کو حفاظت قرآن سے
متعلق حضرت قتادہ کی ایک اور روایت
سے مشابہ ہوتا ہے، یہ روایت صحیح

چھٹا اعتراض

بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے :-

سألت أنس بن مالك رضي الله عنه من جمع القرآن علي

عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال اربعة کلہم من
الانصار، ابي بن کعبہ ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت
وابوزیدؓ،

”میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
زمانے میں قرآن کریم کس نے جمع کیا تھا؟ انہوں نے فرمایا چار افراد نے
جن میں سے ہر ایک انصار میں سے تھا، حضرت اُبی بن کعبہؓ، حضرت معاذ
ابن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابو زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔“

اس روایت سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک
میں قرآن کریم کے حافظ بس ہی چار حضرات تھے، حالانکہ یہ خیال درست نہیں،
ہم سمجھتے ہیں ان حضرات صحابہؓ کے اسماء گرامی شمار کر لیں گے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانے میں ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، لہذا حضرت انسؓ کی مذکورہ
بالا روایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحابہؓ کی پوری جماعت میں ان چار حضرا
کے سوا کوئی اور قرآن کریم کا حافظ نہیں تھا، بلکہ مذکورہ بالا حدیث میں ”قرآن کریم
کو جمع کرنے“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور اس لفظ کا صحیح مفہوم قرآن کریم کو لکھنا
ہے، اور حضرت انسؓ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چار حضرات وہ ہیں جن کے پاس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں قرآن کریم کا پورا پورا لکھا ہوا موجود
اس کے علاوہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبری کی ایک روایت کے حوالے
سے حضرت انسؓ کے اس ارشاد کا پورا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آؤس اور خزرج
کے قبیلوں میں باہمی مفاخرت کا سلسلہ چلا، قبیلہ آؤس کے حضرات نے اپنے قبیلے
کے اُن افراد کے نام شمار کرائے جنہیں اسلام میں خصوصی مقام حاصل ہوا، اس
کے جواب میں قبیلہ خزرج کے حضرات (جن میں حضرت انسؓ بھی شامل تھے) یہ فرمایا
کہ ہم میں چار حضرات ایسے ہیں جنہوں نے پورا قرآن کریم جمع کیا تھا، لہذا اس ارشاد
کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آؤس اور خزرج کے قبیلوں میں قرآن کریم کو جمع

کرنے والے ہی چار حضرات تھے

حضرت عبداللہ بن مسعود اور معوذتین
ساتواں اعتراض

بعض لوگ مُسَدِّحِیُّہ کی اس روایت کو بہت اچھلتے ہیں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ معوذتین (سورہ فلق اور سورہ ناس) کو قرآن کریم کا جزو نہیں مانتے تھے، حالانکہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پوری اُمت کی طرح معوذتین کو قرآن کریم کا جزو قرار دیتے تھے، اور جن روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان دو سورتوں کے قرآن ہونے کے قائل نہ تھے وہ درست نہیں ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے قرآن کریم کی جو متواتر قراتیں منقول ہیں ان میں معوذتین شامل ہیں، قراتِ عشرہ میں سے حضرت عاصمؓ کی قرات حضرت ابو عبد الرحمنؓ، حضرت زبیر بن جہشؓ اور حضرت ابو عمرو الشیبانیؓ سے منقول ہے، اور یہ تینوں حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں، اسی طرح حضرت حمزہؓ کی قرات علقمہؓ، اسودؓ، ابن وہبؓ، مسروقؓ، عاصم بن صخرہؓ اور حارثؓ سے منقول ہے، اور یہ تمام حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں، اس کے علاوہ قراتِ عشرہ میں سے کسائیؓ، اور خلفؓ کی قراتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعود پر ختم ہوتی ہیں، کیونکہ کسائیؓ حمزہؓ کے شاگرد ہیں، اور خلفؓ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات

۱۰ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۳۱ و ۳۲ ج ۹ باب القراءین اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱ Watt : W. Montgomery ; Bell's Introduction to the Quran PP. 46

۱۲ التشریفی القرات العشر، لابن الجری، ص ۱۵۶ ج ۱،

۱۳ التشریفی القرات العشر، لابن المحبزی، ص ۱۶۶ ج ۱،

پر اہمیت کا اجماع ہے کہ قرآنِ عشرہ کی ساری اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور سلسلہ بعد نسل تو اتر سے نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں، اس لئے اگر کوئی خبر واحد ان متواتر قسراتوں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الرد ہے، اور اسے قبول نہیں کیا جاسکتا،

اسی بنا پر محقق علماء اور محدثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع یا کم از کم ناقابل قبول بتایا ہے، جو حضرت ابن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں، ان علماء میں شیخ الاسلام علامہ نوویؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام رازیؒ، قاضی ابوبکر بن عربیؒ، علامہ بحر العلومؒ اور آخری دور کے مشہور محقق عالم علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ شامل ہیں،

اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ نور الدین سیبویؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں، پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاسکتا ہے؟ لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقف ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہو کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا شذوذ نہ پایا جائے، تمام محدثین نے حدیث صحیح کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو، چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا، حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ اپنی مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

لہ فیض الباری، ص ۲۶۲ ج ۱،

۱۔ دیکھئے علی الترتیب الثانی، ص ۸۱ ج ۲، المحلی، لابن حزم، ص ۱۱۳ ج ۱، فوارج الرحموت شرح مسلم الشریعۃ از بحر العلوم، ص ۱۲ ج ۲، مقالات الکوثری، ص ۱۶، تفصیلی عبارتوں کیلئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوذتین" ماہنامہ البلاغ شعبان ۱۳۹۳ھ

۲۔ فتح الباری، ص ۶۳ ج ۸ و صحیح الزوائد للہیثمی، ص ۱۴۹ ج ۴،

”بِسْ حَدِيثٍ مَعْلُومٍ“ وہ حدیث ہے جس میں کوئی علت معلوم ہوتی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو، باوجودیکہ ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو، اور یہ ”علت“ اُس سند میں بھی واقع ہو جاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں، اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں اور اس علت کا ادراک علم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی راوی کو منفرد دیکھ کر اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ کبھی دوسرے قرآن بھی مل جاتے ہیں!

اسی طرح حدیث کی ایک قسم ”شاذ“ ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں، لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے اُن کی حدیث قبول نہیں کی جاتی، لہذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کا جز نہیں مانتے تھے علامہ نوویؒ اور ابن حزمؒ وغیرہ نے اُن کو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔

- (۱) یہ روایتیں معلول ہیں، اور ان کی سبب بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اُن قراءتوں کے خلاف ہیں جو اُن سے بطریق تواتر منقول ہیں
- (۲) مسند احمدؒ کی وہ روایت جس میں حضرت ابن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ ”أَمَّمَا لَيْسَتْ مِّنْ كِتَابِ اللَّهِ (معوذتین اللہ کی کتاب کا جز نہیں ہیں)“ صرف عبدالرحمن بن یزید نخعیؒ سے منقول ہے، اور کسی نے صراحتاً اُن کا یہ جملہ نقل نہیں کیا، اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محدثین کے اصول کے مطابق حدیث شاذ“ مقبول نہیں ہوتی،

لہ مقصد فتح الملہم، ص ۵۲، ج ۱، ۵ دیکھئے۔ مجمع الزوائد، لہبیشی، ص ۱۲۹، ج ۴، والفتح الربانی ص ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ج ۱، ۸

۳۔ اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی بہر حال یہ اخبارِ احاد ہیں، اور اس بات پر اہمیت کا اجماع ہے کہ جو خبر واحد متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قرأتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں ان کی صحت قطعی ہے، لہذا ان کے مقابلے میں یہ اخبارِ احاد یقیناً واجب الرد ہیں،

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیوں کر روایت کر دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن کریم کا جزؤ ماننے میں، لیکن کسی وجہ سے انھوں نے اپنے مصحف میں ان کو لکھا نہ ہو، اس واقعہ کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہیم ہوا، اور اس نے اسے اس طرح روایت کر دیا، گویا وہ انھیں سکرے جزؤ قرآن ہی نہ مانتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ معوذتین کو جزؤ قرآن ماننے کے باوجود انھوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہیں لکھا تھا، اور نہ لکھنے کی وجہ بہت سی ہو سکتی ہیں، مثلاً علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ انھوں نے معوذتین کو اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں،

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابو بکر الانباریؓ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: اگر میں سورۃ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا، امام ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا، اور مسلمانوں کے حافظے پر اعتماد کیا،^۱

۱۔ مقالات الکوفریؒ، ص ۱۶، ۱۷ تفسیر القرطبیؒ، ص ۱۱۲ و ۱۱۱، ج ۱،

بہر کیفیت! اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ اور معوذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت معقول توجیہات ہو سکتی ہیں، اور ان سے یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ ان کو قرآن کریم کا جزو ہی نہیں مانتے تھے، جبکہ ان سے تو اتر کے ساتھ پورا قرآن ثابت ہے، جس میں معوذتین بھی شامل ہیں،

خلافت صدیقی میں جمع قرآن کی روایت پر مستشرقین کا آٹھواں اعتراض

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کریم کو جمع کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا گیا، اس کی تفصیل ہم سچھے ذکر کر چکے ہیں، بعض مستشرقین نے اس واقعہ ہی کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرکاری سطح پر... قرآن کریم کی جمع و ترتیب کی کوشش نہیں ہوئی، بلکہ سرکاری سطح پر اس نوعیت کا پہلا کارنامہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت حفصہؓ کے جس نسخے سے استفادہ کیا تھا وہ حضرت حفصہؓ کا ذاتی نسخہ تھا، کوئی سرکاری طور پر تیار کیا ہوا نسخہ نہیں تھا، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے صحیح بخاریؒ کی اس روایت پر متعدد اعتراضات کئے ہیں جو حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے، اور جس میں حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جمع قرآن کا واقعہ بیان کیا ہے، ان تمام اعتراضات کا خلاصہ پروفیسر منٹگمری واٹ نے بیان کیا ہے، یہاں ان تمام اعتراضات کو بیان کر کے جواب دینا اس لئے غیر ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات ایسے ہیں جن کا جواب ایک معمولی واقفیت کا انسان خود سمجھ سکتا ہے، البتہ ان میں سے چند اہم اعتراضات کا جواب یہاں پیش خدمت ہے،

لہ یہ روایت سچھے صفحہ پر گزر چکی ہے،

مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ صحیح بخاریؒ کی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں حج قرآن کا محرک یہ تھا کہ پیامہ کی جنگ میں حفاظ و قرآن کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی، حالانکہ تاریخی طور پر یہ محرک صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ جنگ پیامہ کے شہداء کی فہرست میں ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، جو قرآن کے حافظ ہوں کیونکہ شہداء زیادہ تر نو مسلم تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض قطعی بے بنیاد اور لغو ہے اسے سب سے پہلے فریڈرک شالے (Fredrich Schwally) نے کیا تھا۔ اس کے بعد کے مستشرقین بھی آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کرتے چلے گئے، اور کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی، کہ پیامہ کے شہداء کی فہرست دیکھ کر اس بات کی تحقیق کرتا، کہ یہ اعتراض کس حد تک صحیح ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ پیامہ کی جنگ میں مدینہ طیبہ کے ریزہ والے ہاجرین و انصار کی تعداد تین سو ساٹھ اور مدینہ طیبہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے رہنے والے ہاجرین کی تعداد تین سو تھی، ظاہر ہے کہ ان چھ سو ساٹھ افراد کے پورے نام تو تاریخ میں محفوظ نہیں رہے، البتہ ان میں سے اٹھارہ ہاجرین و انصار کے نام حافظ ابن کثیرؒ نے نقل فرمائے ہیں:

ان اٹھارہ افراد میں سے ایک حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ نہیں، جو حافظ اور قاری ہونے کے اعتبار سے صحابہؓ میں ممتاز ترین مقام کے حامل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار حضرات سے بطور خاص قرآن کریم سکھنے کا حکم دیا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھے، آپؐ کی ہجرت سے پہلے مسجد قبا میں امام یہی تھے، اور حضرت عمرؓ بھی ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، سفر میں بھی اکثر صحابہؓ کی امامت یہی فرماتے، کیونکہ انھیں اقرأ (قرآن کریم کا سب سے بڑا عالم) سمجھا جاتا تھا؛

۱۔ ایضاً، ص ۱۹۲، ۱۔ تالیخ الطبری، ص ۵۱۶، ۲۔ ج ۲، ۳۔ البدایہ والنہایہ، ص ۳۴۰ ج ۷

۴۔ دیکھئے الاستیعاب، لابن عبدالبر، علی ہاشم الاصابہ، ص ۶۸ و ۶۹ ج ۲،

دوسرے بزرگ حضرت ابو حذیفہؓ ہیں جو حضرت سالمؓ کے مولیٰ تھے، اور تاریخ اسلام میں جو اسیوں مسلمان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت کے علاوہ حضرت سالمؓ سے خصوصی تعلق کی بنا پر علم قرآن کریم کے معاملہ میں ان کے مقام بلند کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،

تیسرے بزرگ حضرت زید بن الخطابؓ ہیں، جو حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی ہیں اور بالکل ابتدا میں اسلام لے آئے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہوا کا ہوا بھی جھونکا چلتا ہے وہ مجھے زید بن الخطابؓ کی یاد دلاتا ہے،

چوتھے بزرگ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے باپے میں پیچھے گزر چکا ہے کہ وہ کاتبینِ وحی میں سے تھے، قرآن کریم سے ان کا خصوصی تعلق بالکل ظاہر اور واضح ہے،

ایک اور بزرگ حضرت عباد بن بشرؓ ہیں، جو بدری صحابی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ انصاری صحابہ میں تین حضرات ایسے تھے جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے تمام دوسرے صحابہؓ پر فائق تھے، ان تین حضرات میں سے ایک حضرت عباد بن بشرؓ بھی تھے،

نیز حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ بھی یساکہ کی جنگ میں شہید ہوئے، جو مشہور صحابی ہیں، اور قرآن کریم کی تعلیم میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جیسے اقرابہ صحابہؓ کے شاگرد ہیں، حضرت زید بن ثابتؓ کے بھائی حضرت یزید بن ثابتؓ، حضرت برابر بن عازبؓ کے چچا حضرت قیس بن الحارثؓ، حضرت معاذؓ

۱۔ الاصابہ للحافظ ابن حجر، ص ۲۳۳ ج ۲،

۲۔ البدایہ والنہایہ، لابن کثیر، ص ۳۳۶ ج ۶ مطبعۃ السعادیہ مصر،

۳۔ زاد المعاد، لابن القیم، ص ۳۰ ج ۱ معینیہ مصر،

۴۔ الاصابہ، ص ۲۵۵ ج ۲، والاستیعیاب علی ہامش الصحابہ ص ۲۲۲ تا ۲۲۶ ج ۲،

۵۔ الاصابہ ص ۲۱۷ ج ۲،

کے بھائی عاتق بن ماعض، حضرت زبیرؓ کے بھائی سائب بن عوامؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ کے صاحبزادے حضرت سائب بن عثمانؓ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں،

پھر مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اٹھارہ مہاجرین تھے، اور انصاریوں سے تقریباً بیس حضرات لیے تھے جو غزوہ بدر سے پہلے مسلمان ہوئے، اور ان کے علاوہ تقریباً اس لیے تھے جو غزوہ احد میں شریک تھے، اور یہ تفصیل صرف ان شہداء کی ہے، جن کے نام تاریخ میں محفوظ رہے ہیں، باقی سینکڑوں نامعلوم افراد میں سے کتنے حافظ قاری ہوں گے؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، لیکن فریڈرک شلے (Schwally) (جارج بیل اور منٹگمری واٹ) ہیں کہ انھیں اس فہرست میں نہ صرف یہ کہ کوئی قاری نظر نہیں آتا بلکہ وہ ان سب کو نو مسلم (Recently Converts)

قرار دے کر دنیا پر اپنی تحقیق کا رعب جما نا چاہتے ہیں، غور فرمائیے کہ جس جنگ میں مہاجرین و انصاریوں کی اتنی بڑی جماعت شہید ہو گئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں سب نو مسلم شہید ہوئے تھے لہذا صحیح بخاریؓ کی حجج قرآن والی روایت غلط ہو علم و تحقیق پر کتنا بڑا ظلم ہے، اور انصاف و دیانت کے ساتھ کتنا بڑا فریب ہے؟ پھر بات یہ نہیں ہے کہ جنگ یمامہ میں تمام حفاظ صحابہؓ شہید ہو گئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ جنگ یمامہ تو صرف ایک لڑائی تھی، یہ زمانہ وہ تھا جبکہ اس طرح کی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو رہا تھا، اور علماء صحابہؓ میں سے کتنے جانناز ایسے تھے جو یمامہ سے کہیں زیادہ خون ریز معرکوں میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے جہن تھے، اس ماحول میں اگر حضرت عمرؓ کے دل میں فترآن کریم جمع کرنے کا داعیہ پیدا ہو گیا تو اس میں کونسی ایسی غیر معقول بات ہو جس کی بنا پر صحیح بخاریؓ کی ایسی قوی روایت کو غلط فترار دیکھا جائے؟

منٹگمری واٹ نے اس روایت پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اگر حضرت ابو بکرؓ

نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار کیا ہوتا تو اسے ایک ”حجت“ کی حیثیت حاصل ہوتی، حالانکہ اس زمانے کی روایتوں میں اس بات کا کوئی نشان نہیں ملتا، کہ حضرت ابو بکرؓ کے اس سرکاری نسخے کے حوالے دیئے جاتے ہوں۔ لیکن اس اعتراض کی لغویت بھی محتاج بیان نہیں کیونکہ اس نسخے کو ”حجت“ قرار دینے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جب حضرت عثمانؓ نے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں قرآن کریم کے نسخے نقل کرا کر بھیجے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے حضرت حفصہؓ سے وہی نسخہ طلب فرمایا جو حضرت ابو بکرؓ نے تیار فرمایا تھا،

وآٹ نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ اگر یہ کوئی سرکاری نسخہ تھا تو حضرت عمرؓ کے بعد یہ نسخہ خلیفہ وقت کے بجائے حضرت حفصہؓ کے پاس کیوں رہا؟ اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت کوئی خلیفہ معین نہیں تھا، اس لئے حضرت عمرؓ کے دوسرے سامان کے ساتھ یہ نسخہ بھی حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہو گیا، کون ایسا صاحب عقل انسان ہو سکتا ہے جو محض اتنی سی بات کی وجہ سے ایسی مستند روایت ہی کو دریا بڑ کر ڈالے،

خلافت صدیقی تک پورا قرآن
لکھا نہیں گیا تھا؛ نوال اعتراض
چھپے بتایا جا چکا ہے کہ جب بھی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی آیت نازل ہوتی
تو آپ کا تبین وحی کو بلا کر اس کو لکھوادیتی

تھے، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک پورا قرآن لکھا تو جو چکا تھا، لیکن وہ کنابی شکل میں مرتب نہیں تھا، بلکہ مختلف آیتیں مختلف چیزوں پر لکھی ہوتی موجود تھیں، حضرت ابو بکرؓ نے ان مختلف اشیاء کو جمع کر کے آیات قرآنی کو یکجا صحیفوں کی شکل میں لکھوایا،

اس کے برخلاف مستشرقین میں سے نوڈلڈ کی اور آرتھر جیفے وغیرہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا، بلکہ اس کے صرف کچھ حصے لکھے گئے تھے، انھوں نے صحیح بخاری کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمرؓ نے جمع قرآن کا مشورہ

دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر حفاظ صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کریم کے بہت سے حصوں کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے، آرتھر جیفرے لکھتا ہے :-
 ”اس سے واضح ہے کہ اندیشے کی وجہ ان حفاظ کا قتل ہوجانا تھا جنہوں نے
 قرآن کریم یاد کر رکھا تھا، اگر قرآن کریم پورا کا پورا (عہد رسالت میں) بکھا
 جا چکا تھا تو اس اندیشے کے کوئی معنی نہ تھے“

لیکن اول تو یہ بات انتہائی حیرت انگیز اور افسوسناک ہے کہ بعض دوسرے مستشرقین کی طرح آرتھر جیفرے نے بھی صحیح بخاریؒ کی اس روایت کو درست ماننے سے انکار کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار فرمایا تھا، اب اس دو عملی کوائف اور دیانت کے کونسے خانے میں بٹ کیا جائے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت میں وہ ساری باتیں تو جیفرے صاحب کی نگاہ میں جھوٹی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں سرکاری سطح پر قرآن کریم کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن اسی روایت کا وہ حصہ ان کی نظر میں بالکل صحیح ہے جس میں حضرت عمرؓ کا وہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ ”اگر صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو خطرہ ہے کہ ہمیں قرآن کا بڑا حصہ ضائع نہ ہوجائے، ایک طرف تو وہ یہ پوری روایت نقل کر کے اسے من گھڑت (fictitious) بتا رہے ہیں اور دوسری طرف اسی روایت سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال بھی فرماتے ہیں، اس کے باوجود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ”مستشرقین کا انصاف، نیک نیتی، اور غیر جانبداری بالکل واضح ہے، ان کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سوا حقیقت کی نقاب کشائی کے کچھ اور نہیں چاہتے“

بہر کیف! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قرآن کریم کو جمع

کرنے کا جو طریق کار اختیار کیا گیا تھا، اور جسے ہم پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، اگر اُسے ذہن میں رکھا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس جملے سے جعفر کے کا یہ استدلال خود بخود باطل ہو جاتا ہے، ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحیح قرآن کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں یا درداشت اور کتابت دونوں ذرائع سے بیک وقت کام لیا جاتا تھا، اسی لئے کوئی آیت اُس وقت تک نہیں لکھی جاتی تھی جب تک تمام موجود ذرائع سے اس کا جزو قرآن ہونا ثابت نہ ہو جائے، یہ محتاط طریق کار اسی وقت ممکن ہوا جب آیات قرآنی کے مکتوب شکل میں محفوظ ہونے کے علاوہ حفاظ کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی، اس کے برخلاف اگر حفاظ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس وقت موجود نہ ہوتی تو صحیح قرآن کا یہ کارنامہ اس بمثل احتیاط کے ساتھ انجام نہیں پاسکتا تھا، جس کا وہ مستحق تھا،

اس کے علاوہ قرآن کریم کے ثبوت کے لئے تو اتر کی ضرورت تھی، اور محض دو چار نسخے اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے صحیح قرآن کے وقت صحفاً قرآن کی ایک بڑی جماعت ناگزیر تھی، لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندیشے کی وجہ یہی تھی کہ اگر حفاظ قرآن شہید ہوتے گئے اور صحیح قرآن کا کام مؤخر ہوتا رہتا تو ہمیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کریم کا تو اتر منقطع ہو جائے اور لکھے ہوئے مواد کی تصدیق صحابہؓ کے متواتر حافظوں سے نہ کی جاسکے، لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اندیشے سے یہ استدلال بالکل باطل ہے کہ اُس وقت تک پورا قرآن کہیں بھی لکھا ہوا موجود نہیں تھا،

مختلف قرأتیں کس طرح وجود میں آئیں؛ دستاویز مشابہ

معاہدے میں ایک دوسرا گراہ کن نظریہ پیش کیا ہے، نو لڈیکی، گولڈزیبر اور آرتھر جیفری وغیرہ نے لکھا ہے کہ قرأتوں کا اختلاف درحقیقت سماعتی نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو نسخے تیار کرائے تھے اُن پر لفظی اور حرکات نہیں تھے،

اس لئے اسے مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا تھا، چنانچہ جس شخص نے جس طرح چاہا اپنے اجتہاد سے پڑھ لیا، اور وہ اس کی قرارت بن گئی بلکہ مستشرقین کے اس دعوے کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو مختلف قرارتیں معروض ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بلکہ مصاحف عثمانیہ کو پڑھنے میں لوگوں کا جو اختلاف ہو، اس کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں، حالانکہ یہ دعویٰ صراحتاً بنیاً اور بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانیہ کا لفظوں اور حرکات سے خالی ہونا قرارتوں کے وجود میں آنے کا سبب نہیں بنا، بلکہ ان مصاحف عثمانیہ کو لفظوں اور حرکات سے جان بوجھ کر اسی لئے خالی رکھا گیا تھا کہ قرآن کریم کی جتنی قرارتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں وہ سب اس رسم الخط میں سما سکیں، ہم پچھے عرض کر چکے ہیں کہ ہر دور میں قرآن کریم کی کسی قرارت کو قبول کرنے کے لئے تین شرائط کو لازمی سمجھا گیا ہے، ایک یہ کہ مصاحف عثمانیہ رضی اللہ عنہم کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ وہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو، اور تیسرے یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، لہذا کوئی قرارت اس وقت تک صحیح تسلیم نہیں کی گئی، جب تک صحیح سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں مل گیا، اگر قرارتوں کے وجود میں آنے کا سبب محض عثمانیہ رسم الخط ہوتا تو ہر اس قرارت کو درست مان لیا جاتا جو رسم الخط میں سما جاتی، اور اسے قبول کرنے کے لئے یہ تیسری شرط عائد نہ کی جاتی، چنانچہ جو شخص بھی قرآن کریم کی مختلف قرارتوں پر غور کرے گا اسے کھلی آنکھوں نظر آجائے گا کہ عثمانیہ رسم الخط میں ایک لفظ کو محتلف طریقوں سے پڑھنے کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ وہ طریقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھے اس لئے انھیں اختیار نہیں کیا گیا، یہ بات دو مثالوں سے واضح ہوگی:-

۱۔ دیکھئے "مذہب تفسیر الاسلامی" گولڈ زیہر ترجمہ عربی ڈاکٹر عبد الحلیم نجار، ص ۸، مکتبۃ النجاشی قاہرہ
۲۔ اور مقدمہ کتاب المصاحف، آرتھر جفرے، ص ۷، المطبعة الرحمانیہ، مصر ۱۳۵۵ھ

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے: "وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شِقَاقَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ"۔ یہاں ایک قرأت میں لَا يُقْبَلُ (یا بکے ساتھ) ہے، اور ایک قرأت میں لَا تُقْبَلُ (رتا کے ساتھ) ہے، لیکن اسی قسم کی ایک آیت سورۃ بقرہ میں ایک دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے وَلَا تَنْفَعُهَا شِقَاقَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ، یہاں لَا تَنْفَعُهَا صرف تاء کے ساتھ آیا ہے، لَا يُنْفَعُهَا (یا بکے ساتھ) کوئی قرأت نہیں ہے، حالانکہ رسم عثمانی میں لَا يُنْفَعُهَا کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ عثمانی مصاحف میں یہ جملہ اس طرح لکھا ہوا تھا: "لا سفعها" اور عربی زبان کے قواعد میں بھی یاء اور تاء دونوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ یہ قرأت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھی، اس لئے اس کو کسی نے بھی ختم یا نہیں کیا، اسی طرح سورۃ یس میں ارشاد ہے: "إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ"۔ یہاں ایک قرأت میں فَيَكُونُ (نون پر پیش کے ساتھ) آیا ہے، اور دوسری قرأت میں فَيَكُونُ (نون پر زبر کے ساتھ)، لیکن اسی طرح کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں ہے: "إِذَا أَحْضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ"۔ یہاں صرف ایک ہی قرأت ہے (یعنی نون پر پیش) دوسری قرأت رسم الخط کی گنجائش کے باوجود کسی نے ختم یا نہیں کی؟

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں قرأت کے مجموعوں میں موجود ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ قرأتیں رسم الخط سے وجود میں نہیں آئیں، بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھیں، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ پوری اُمت میں صرف ایک صاحب (یعنی ابو بکر بن مقسمؓ) ایسے

لہ یہ دونوں مثالیں علامہ طاہر کردیؒ کی تاریخ القرآن، ص ۲۸ و ۱۲۹ سے ماخوذ ہیں،
 ۱۔ ان کا پورا نام محمد بن الحسن بن یعقوب بن مقسم ہے، ولادت ۱۶۵ھ اور وفات ۲۵۵ھ،

گزرے ہیں جنہوں نے یہ مسلک اختیار کیا تھا کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قرأتیں ایجاد کی جاسکتی ہیں، اور ان کا سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونا ضروری نہیں، لیکن جس وقت انہوں نے اپنا یہ گمراہانہ نظریہ پیش کیا، تو پورے عالم اسلام نے اُن پر شدید نکیر کی، خلیفہ وقت نے انہیں سزا اور فقہار کی ایک مجلس میں طلب کر کے اُن سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ انہوں نے توبہ کی، اور اپنے نظریے سے رجوع کا تحریری اعلان بکھکھ کر دیا،

اس واقعہ سے صاف واضح ہے کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قرأتیں مستنبط کرنے کو اہمیت مسلمہ میں ہمیشہ ایک گمراہی سمجھا گیا ہے، اور اس بات پر ہر دور میں مسلمانوں کا اجماع رہا ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہی قرأت معتبر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر قرأتوں کا وجود محض عثمانی رسم الخط کے پڑھنے میں اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ہوا ہوتا تو ابن مقسم پر اتنی شدید نکیر کیوں کی جاتی؟ لہذا مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے کہ قرأتیں عثمانی مصاحف میں نقطوں اور حرکات کی غیر موجودگی سے پیدا ہوئی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قرأتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقے پر ثابت ہیں، اور اُن کو محفوظ کرنے کے لئے ہی حضرت عثمانؓ نے اپنے مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا، تاکہ یہ تمام قرأتیں اُن کے رسم الخط میں سما سکیں،

قرآن کریم کی شاذ قرأتیں اور انکی حقیقت
گیارہواں شبہ
کا ایک قلعہ تعمیر کر لیا ہے، اور رانی کا

۱۵ تفصیلات کے لئے دیکھئے تاریخ بغداد، الخطیب، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸ ج ۲ طبع بیروت، خطیب بغدادی نے اُن کا یہ لطیفہ بھی نقل کیا ہے، کہ ان کی وفات کے بعد ابو اسحاق الفرضی نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھ رہے ہیں، فرضی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی یہ تعبیر لی کہ انہوں نے قرأت قرآن میں اہمہ کی مخالفت کی ہے،

پہاڑ اور سوئی کا بھالا بنانے کی کوشش کی ہے، خاص طور سے گولڈزہر اور آرتھر جیفری نے ان قرار توں کی بہت سی مثالیں پیش کر کے ان سے من مانے نتائج نکالے ہیں، یہاں ان تمام مثالوں کو پیش کر کے ان کی حقیقت واضح کرنا تو مشکل ہو، اس لئے کہ اس کام کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہوگی، اس کے علاوہ ہماری رائے میں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، لیکن ہم یہاں شاذ قرار توں کے بارے میں چند اصولی باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں، امید ہے کہ ان اصولی حقائق کو مد نظر رکھنے کے بعد مستشرقین کے ان تمام باطل نظریات کی تردید اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی جو انہوں نے شاذ قرار توں کی بنیاد پر قائم کئے ہیں،

جیسا کہ ہم چھپے عرض کر چکے ہیں پوری اُمت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہ قراءتیں معتبر ہیں جن میں تین شرائط پائی جائیں :-

(۱) وہ قراءت عثمانی مصاحف کے رسم الخط میں سما سکتی ہو،

(۲) عربی قواعد کے مطابق ہو،

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کا پڑھنا متواتر طریقے سے ثابت ہو، یا

کم از کم علماء قراءت میں مشہور و معروف ہو،

جس قراءت میں ان تین شرائط میں سے کوئی ایک مفقود ہو، وہ شاذ قراءت

کہلاتی ہے، اور پوری اُمت میں سے کسی نے اسے معتبر نہیں مانا، ان شاذ قراءتوں

پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی ایک

بات پائی جاتی ہے :-

۱۔ دیکھئے مذاہب التفسیر الاسلامی: گولڈزہر، ترجمہ سونی ڈاکٹر عبدالحلیم التجار، اور:-

Arthur Jeffery; Materials for the History of the text

of the Quran, Leiden 1937 P. 6

۲۔ گولڈزہر کے نظریات پر ڈاکٹر عبدالحلیم التجار نے بھی مذاہب التفسیر الاسلامی کے حاشیہ

پر مختصر مگر اچھا تبصرہ کیا ہے،

۱۔ بعض اوقات وہ قرارت بالکل موضوع ہوتی ہے، جیسے کہ ابو الفضل محمد بن حنفیہ خراسمی کی قرارتیں، جنکو انھوں نے امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کیا ہے، امام دارقطنیؒ اور تمام علماء نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ یہ تمام قرارتیں موضوع ہیں؛
 ۲۔ بعض اوقات اُن کی سند ضعیف ہوتی ہے، جیسے ابن التیمیغ اور ابوالسہیل کی قرارتیں؛ یا بہت سی وہ قرارتیں جو ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں مختلف صحابہؓ و تابعینؓ سے منسوب کی ہیں،

۳۔ بعض اوقات سند صحیح ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ قرآن کریم کی قرارت نہیں ہوتی، بلکہ کوئی صحابی یا تابعی عام گفتگو میں قرآن کریم کے کسی لفظ کی تشریح کے لئے اس کے ساتھ دو ایک لفظ بڑھا دیتے تھے، قرآن کریم چونکہ پورا کا پورا متواتر تھا، اور ہر ذر میں اس کے ہزاروں حقاظ موجود تھے، اس لئے ان الفاظ کے اضافہ سے قرآن کریم کے متن میں اضافے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، لہذا اس قسم کی تشریحات میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے وَلَهُ آخٌ أَوْ أَحْتُمِنْ آيَةٍ پڑھا، اس میں مِنْ آيَةٍ کا لفظ تفسیری اضافہ تھا، اسی طرح حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک آیت اس طرح پڑھی وَ لَمَّا كُنْتُمْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسْتَعِينُونَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا آصَابَهُمْ وَأَوْلَعَتْ لَهُمُ الْمُفْلِحُونَؑ اس میں وَيُسْتَعِينُونَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا آصَابَهُمْ، بلاشبہ تفسیری اضافہ ہے، کیونکہ اگر یہ جملہ حضرت عثمانؓ کی قرارت

۱۔ النثر فی القراءات العشر، لابن الجزریؒ، ص ۱۶ ج ۱ والاتقان، ص ۲۸، ۲۹ ج ۱
 ۲۔ النثر، ص ۱۶ ج ۱ ۳۔ النثر لابن الجزریؒ، ص ۳۱ و ۳۲ ج ۱، والاتقان، ص ۲۹ ج ۱
 نوع ۲۲ تا ۲۴ و شرح الموطأ، للزرقاتیؒ، ص ۲۵۵ ج ۱،
 ۴۔ کنز العمال لعلی المتقیؒ، ص ۲۸۶ ج ۱، بحوالہ عبد بن حمید و ابن جریرؒ وغیرہ،

میں واقعہ قرآن کا جزو ہوتا تو ان کے مرتب کردہ مصحف میں ضرور موجود ہوتا، حالانکہ ان کے مرتب فرمائے ہوئے سات مصاحف میں سے کسی میں یہ جملہ منقول نہیں، شاذ قراءتوں میں اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں،

۴۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن کریم کی بعض قراءتیں آخر میں منسوخ ہو گئیں، لیکن کسی صحابی کو ان کے منسوخ ہونے کا علم نہ ہو سکا، اس لئے وہ قدیم قراءت کے مطابق پڑھتے رہے، لیکن چونکہ دوسرے تمام صحابہ نہ جانتے تھے تھے کہ یہ قراءت منسوخ ہو چکی ہے اس لئے وہ نہ اُسے پڑھتے تھے، اور نہ قرآن کریم کی صحیح قراءتوں میں شمار کرتے تھے،

۵۔ بعض شاذ قراءتوں کو دیکھ کر ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی تابعی وغیرہ سے قرآن کریم کی تلاوت میں کوئی بھول چوک ہو گئی، جیسا کہ اکثر بڑے بڑے حافظوں سے ہو جاتی ہے، اُس وقت کسی سننے والے نے شکر اسے رزقاً کر دیا!

قرآن کریم کی جتنی شاذ قراءتیں منقول ہیں وہ زیادہ تر اہنی پانچ صورتوں میں دائر ہیں، ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں ان قراءتوں کو معتبر قرار دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ امت نے کسی بھی ذور میں انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، اولاً اسی لئے یہ قراءتیں متواتر تو کیا ہوتیں مشہور بھی نہ ہو سکیں، لہذا ان کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے جو یہ نتیجہ نکلانے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم کے متن میں کچھ اختلافات پائے جاتے تھے یہ ایسا بے بنیاد اور لغو خیال ہے جو علم و تحقیق کے اعتبار سے قابل غور بھی نہیں ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم ۛ

۱۔ مشکل الآثار، للطحاوی، ص ۱۹۶ تا ۲۰۲ ج ۴،

۲۔ النشر، لابن الجزری، ص ۱۶ ج ۱، والمبانی فی نظم المعانی: مقدمتان فی علوم القرآن ص ۱۰۰ مکتبۃ الخاجی، مصر، ۱۹۵۲ء،

حقانیت قرآن

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی حیرت انگیز تاثیر رکھی ہے کہ ہرٹ دھرمی اور عناد کی بات تو اور ہے، لیکن جو شخص بھی غیر جانبداری اور اخلاص کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ بیساختہ بیمار اٹھے گا کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن کریم بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کی صداقت و حقانیت دل میں اترتی چلی جاتی ہے، لہذا قرآن کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے سورج کے روشن ہونے پر دلائل قائم کرنا، لیکن ذیل میں ہم مختصراً چند وہ باتیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے ایک غیر مسلم کے لئے بھی قرآن کریم کی حقانیت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت | سب سے پہلے اُس بات کو ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے جو ہم نے وحی کی ضرورت کے عنوان کے تحت پیچھے رکھی ہے، اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ”وحی“ انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، جس کے بغیر انسان کے لئے دنیا میں ایک اچھی زندگی گزارنا ممکن نہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی

رسالت کے موضوع پر بات کرنا ہی فضول ہے، اُن سے پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے.....
 مسئلہ پر گفتگو کی ضرورت ہے، لیکن جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے وہ اس
 حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کہ ”وحی“ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کا
 ایسا ناگزیر تقاضا ہے جس پر ایمان لائے بغیر ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی، جس ذات
 نے انسان کو پیدا کیا اور اُس کے لئے یہ کائنات بنائی اس سے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ
 کہ وہ انسان کو شر و فساد کے تقاضوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں بے یار و مددگار
 چھوڑ دے اور اس کی رہنمائی کے لئے کوئی ہدایت نامہ نہ بھیجے،

ہدایت کے اسی سلسلے کا نام ”وحی“ اور ”رسالت“ ہے، اور یہ سلسلہ آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع نہیں ہوا، بلکہ آپ پر اس کی تکمیل ہوئی ہے، آپ سے پہلے
 ہزاروں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کا پیغامِ ہدایت لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے
 اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے یہ بشارت دی تھی کہ آخری دور میں ایک ایسے پیغمبر
 تشریف لائیں گے جن پر نبوت کے مقدس سلسلے کی تکمیل ہو جائے گی، بعض انبیاء علیہم السلام
 نے آپ کی متعدد علامتیں بھی پہلے سے بیان کر دی تھیں، بلکہ بعض نے تو صراحتاً
 آپ کا نام نامی بھی بتا دیا تھا، پچھلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں اگرچہ آج بہت کچھ
 تحریف و ترمیم ہو چکی ہے، لیکن آج بھی اُن میں آپ کی تشریف آوری کی بہت سی
 بشارتیں اور ہیبت نسی علامتیں محفوظ ہیں،

کتاب مقدس میں آپ کی بشارتیں | مثلاً بائبل کی کتابِ استثنا میں حضرت موسیٰ
 علیہ السلام سے خطاب ہے:-

”اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کے
 لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام
 اس کے مُنہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا،
 اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں ان کا
 حساب اُس سے لوں گا، لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے

کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے، اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اسے ہم کیوں کر پہچانیں؟ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور اس کے کہے کے مطابق کچھ واقعہ یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا۔

(استثنا، ۱۸: ۱۷ تا ۲۲)

اس عبارت میں بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے یہ صراحت کی گئی ہے کہ جس نبی کی بشارت دی گئی ہے، وہ ان میں سے نہیں بلکہ ان کے بھائیوں یعنی بنی اسمعیل میں مبعوث ہوگا، اور حضرت شعیب علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجودہ بائبل میں منقول ہے کہ :-

”دیکھو، میرا خادم جسکو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے، میں نے اپنی رُوح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا، وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی، وہ مسلے ہوئے سر کندھے کو نہ توڑے گا، اور ٹھٹھاتی بتی کو نہ بچھائے گا، وہ راستی سے عدالت کرے گا، اور ماندہ نہ ہوگا، اور ہمت نہ ہارے گا، جب تک عدالت کو زمین پر قائم نہ کر لے، ہمزیرہ اس کی شریعت کا انتظار کریں گے،.....“

میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور تیری حفاظت کروں گا، اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا، کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے، اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانے سے چھڑائے، یہود وہ میں ہی ہوں، یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دگر کے لئے اور اپنی حمد کھودی ہوئی صورتوں کے لئے روانہ رکھوں گا،.....

اے سمندر پر گزرنے والو! اور اس میں بسنے والو! اے جزیرہ داران کے باشندو! خداوند کے لئے نیا گیت گادو، زمین پر سر تا سر اس کی ستائش

کرد، بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد گادوں اپنی آوازیں بلند کریں،
 تسلح کے لئے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے لٹکاریں، وہ خداوند
 کا جلال ظاہر کریں، اور جسزیروں میں اس کی تبار خوانی کریں، خداوند مہادری
 مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا، جو سکھو دی ہوئی
 مورقوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھلے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے معبود
 ہو رہے سچھے آئیں گے، اور بہت شرمندہ ہوں گے، (یسعیاہ ۴۲: ۱۷ تا ۱۸)

اس عبارت میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جا رہی ہے وہ حضرت
 اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا، (کیونکہ قیدار اپنی کے صاحبزادے کا نام ہی)
 اور سلح (مدینہ طیبہ کے مشہور پہاڑ) کے لئے والے اس کی آمد پر خوشیاں منائیں گے،
 اس کا خاص مقابلہ بت پرستوں سے ہوگا، اور وہ اپنے حلقہ اثر میں بت پرستی کا خاتمہ
 کر دے گا، اُسے متعدد اقوام سے جنگیں بھی پیش آئیں گی، اور بالآخر وہ غالب آکر
 ان اقوام میں عدالت نافذ کرے گا،

لہٰذا اس بشارت کا ایک ایک لفظ صحت اور صحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے،
 اس کی پوری تفصیل تراقر نے "بائبل سے قرآن تک" ص ۲۸۱ ج ۳ کے مفصل حواشی میں بیان کی ہے
 یہاں مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ قیدار خود بائبل کی تصریح کے مطابق حضرت اسمعیل علیہ السلام کے
 صاحبزادے کا نام تھا، (۱- تواریخ ۱: ۳) اور ان کی اولاد عرب کے بیابان میں آباد تھی، جیسا کہ
 بائبل ہی کی کتاب یسعیاہ (۲۱: ۱۷ تا ۱۸) سے واضح ہے، لہٰذا اس عبارت میں قیدار کا نام لیکر
 صحت طور سے یہ کہا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جا رہی ہے وہ اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا،
 اور عرب میں مبعوث ہوگا، اس کے علاوہ اس عبارت میں "سلح" کے لئے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ
 گیت گائیں، تسلح مدینہ طیبہ کا مشہور پہاڑ ہے، اور اسی کے ایک حصہ میں "نتیات الوداع" واقع
 ہیں، جن پر کھڑے ہو کر مدینے کی بچیوں نے "طَلْعَ الْبَدْرِ عَلَيْنَا" کے گیت گاتے ہوئے آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا،

موجودہ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں اس قسم کی اور بھی بہت سی بشارتیں اب تک موجود ہیں، اور انہی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے وقت تک لوگوں میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور عظیم الشان نبی دنیا میں تشریف لانے والے ہیں، چنانچہ انجیل یوحنا میں مذکور ہے کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ وہی نبی ہیں جن کی بشارت پچھلے انبیاء علیہم السلام دیتے آ رہے ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اس کا انکار کیا، انجیل یوحنا کی عبارت یہ ہے:-

”اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور اس نے انکار نہ کیا، بلکہ یہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، الخ“

(دیکھئے انجیل یوحنا: ۱: ۱۹ تا ۲۶)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے، اور وہ نبی ان کے درمیان اس قدر مشہور و معروف تھے کہ ان کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ وہ نبی کہنا کافی ہوتا تھا،

پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح اسم گرامی لوگوں کو بتا کر آپ کی تشریف آوری کی بشارت دی، انجیل یوحنا میں مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:-

”میں تم سے بچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ (خارقلیط) تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے

لے انجیل کے یونانی نسخوں میں یہ لفظ ”پیر کلیطوس“ تھا، جو ”محمد“ کا ترجمہ ہے، یہاں ہم نے صرف نمونہ کے لئے چند بشارتیں ذکر کی ہیں، اس موضوع پر بمسوط مباحث کے لئے دیکھئے ”بائبل سے قرآن تک“ جلد سوم

تھارے پاس بھیجدوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور رستبازی اور عدالت

کے بارے میں تصور دار پھر اے گا» (یوحنا ۱۶: ۷)

ان بشارتوں کو ذہن میں رکھ کر اُس زمانے کا تصور کیجئے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، یہ وہ زمانہ تھا جب سینکڑوں سال سے یہ دنیا کسی نبی کے وجود سے محروم تھی، گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات مٹ رہی تھیں، تحریف و ترمیم کرنے والوں نے پھیلی شریعتوں کو برسی طرح مسخ کر ڈالا تھا، شرک کی وبا عالمگیر ہو چکی تھی، ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا، اور گزشتہ آسمانی کتابوں کا..... علم رکھنے والے نبی آخر الزماں کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، ان حالات میں آپؐ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوتے ہیں، اور چالیس سال تک اس چھوٹی ٹیپسی بستی میں اس طرح رہتے ہیں کہ اس کا پچھ پچھ آپؐ کی سچائی، آپؐ کی دیانتداری، آپؐ کے عدل و انصاف اور آپؐ کے حسن خلاق کامعترف ہے، مکہ مکرمہ آجکل کے شہروں کی طرح کوئی بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی بستی تھی جس میں ہر شخص کی زندگی دوسروں کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتی ہے، اس بستی میں آپؐ چالیس سال بسر کرتے ہیں، مکہ کے باشندے آپؐ کے بچپن اور آپؐ کی جوانی کا اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس یوں عرصہ میں کسی شخص کو آپؐ کے ذاتی کردار پر کوئی انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، کوئی تنفس ایسا نہیں پایا جاتا جو کبھی ساری عمر آپؐ کی کسی ادنیٰ غلط بیانی کی مثال پیش کرے اس کی بجائے پوری بستی میں آپؐ "صادق" اور "امین" کے لقب سے مشہور ہوتے ہیں ایسا بھی نہیں ہو کہ آپؐ نے یہ چالیس سالہ زندگی لوگوں سے الگ تھلگ ہرگز گزاری ہو، بلکہ آپؐ اُن کے تمام امور زندگی میں قوم کے ایک باشعور اور مدبر فرد کی طرح ذخیل رہتے ہیں، آپؐ اُن کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، اُجرت پر کام کرتے ہیں، اُن کے باہمی جھگڑے نپٹاتے ہیں، اُن کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ازدواجی زندگی گزارتے ہیں، غرض زندگی کے جتنے مراحل کا اُس دور میں تصور کیا جاسکتا ہے اُن سب سے گزرتے ہیں اور پوری قوم ان تمام مراحل میں آپؐ کے بلند کردار کا اعتراف کرتی ہو،

پھر چالیس سال کی اس طویل مدت میں آپ کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کرتے، اہل کتاب کے علاوہ آپ کا کوئی میل جول نہیں رہتا، کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھتے، عام اہل عرب کے برخلاف کبھی کوئی شعر نہیں کہتے، نہ مشاعروں سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے، کبھی کسی کا ہن، جادو گر یا نجومی کی صحبت میں نہیں بیٹھتے، اس کے بعد اچانک آپ کی زبان مبارک ایک ایسا کلام جاری ہوتا ہے جس کے آگے عرب کے بڑے بڑے ادباء و شعراء گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ایسے ایسے علوم و معارف بیان فرماتے ہیں، جس کے سامنے دنیا بھر کے حکماء کی گردنیں حشم ہو جاتی ہیں، ایسی ایسی بیگی خبریں سناتے ہیں جو کبھی کسی کا ہن یا نجومی کے تصور میں بھی نہیں آئیں، اور پھر یہ خبریں سو فی صد درست ثابت ہوتی ہیں، آپ کے دست مبارک پر بہت سے ایسے معجزات ظاہر ہوتے ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جادو گر عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں، اور پھر تیس سال کی مختصر مدت میں آپ پورے جزیرہ عرب میں ایسا محیر العقول انقلاب برپا کر دیتے ہیں کہ صحراے عرب کے جو وحشی علم و معرفت اور تہذیب و تمدن سے بالکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم و حکمت اور تہذیب و شائستگی کے چراغ روشن کرتے ہیں، جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں، جہاں ہر طرف قتل و غارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں امن و آشتی کے گلاب کھل اٹھتے ہیں، جہاں ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا، وہاں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے، اور بالآخر عرب کے یہ صحرا نشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل و خوار تھے، ایران اور روم کی عظیم سلطنتوں کے وارث بن جاتے ہیں، اور ساری دنیا ان کے عدل و انصاف، ان کی رحم دلی، اور ان کی شرافت نفس کے گن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے،

ان حقائق پر جو شخص بھی ٹھنڈے دل و دماغ اور قلب و غیر جانب داری سے غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے پتے رسول تھے، آپؐ ”وہی نبی“ تھے جن کی بشارت صدیوں پہلے سے دی جا رہی تھی اور جن کا انسانیت کو انتظار تھا، لہذا آپؐ کا یہ ارشاد کہ ”قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے“، سو فی صدر برحق اور بلا خوف تردید درست ہے،

اعجازِ قرآن

قرآن کریم کی حقانیت کی ایک اور واضح دلیل اس کا اعجاز ہے، یعنی ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، اسی وجہ سے اس کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے، یہاں ہم مختصراً قرآن کریم کی ان وجوہ اعجاز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، اور کسی بشری ذہن کا اس میں کوئی دخل نہیں،

آگے بڑھنے سے پہلے بنیادی طور پر دو باتیں سامنے رکھنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ فصاحت و بلاغت اور کلام کی سحرانگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے، اور پوری حقیقت و ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، آپ تلاش و جستجو اور استقراء کے ذریعہ فصاحت و بلاغت کے اصول و قواعد معسر فرما سکتے ہیں، لیکن درحقیقت ان اصول و قواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی، کسی کلام کے حسن و قبح کا آخری فیصلہ ذوق اور وجدان ہی کرتا ہے، جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی، جس طرح ایک خوش رنگ پھول کی رعنائیوں کو الفاظ میں محدود نہیں کیا جاسکتا، جس طرح ہمتی ہوئی مُشک کی پوری کیفیت بیان کرنا ممکن نہیں، جس طرح ایک خوش ذائقہ پھل کی لذت و حلاوت الفاظ میں نہیں سما سکتی، اسی طرح کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کو تمام دکمال بیان کر دینا بھی ممکن نہیں، لیکن جب کوئی صاحب ذوق انسان اسے سنے گا، تو اس کے محاسن و اوصاف کا خود بخود پتہ چل جائے گا،

دوسرے یہ کہ فصاحت و بلاغت کے معاملے میں ذوق بھی صرف اہل زبان کا معتبر ہے، کوئی شخص کسی غیر زبان میں خواہ کتنی جہارت حاصل کر لے، لیکن ذوقِ سلیم کے معاملے میں وہ اہل زبان کا کبھی ہمسر نہیں ہو سکتا،

اب ذرا زمانہ جاہلیت کے اہل عرب کا تصور کیجئے، خطابت اور شاعری اُن کے معاشرے کی رُوحِ رواں تھی، عربی شعر و ادب کا فطری ذوق اُن کے بچے بچے میں سما یا ہوا تھا، فصاحت و بلاغت اُن کی رگوں میں خونِ حیات بن کر دوڑتی تھی، ان کی مجلسوں کی رونق، اُن کے میلوں کی رنگینی، اُن کے فخر و ناز کا سرمایہ اور ان کی نشر و اشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعر و ادب تھا، اور انھیں اس پر اتنا غور تھا کہ وہ اپنے سوا تمام قوموں کو ”عجم“ یعنی گونگا کہا کرتے تھے،

ایسے ماحول میں ایک اُمّی (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کلام پیش کیا، اور اعلان فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کیونکہ :-

لَئِنْ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ اَنْ يَّاتُوا بِمِثْلِ هٰذَا
الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَكَوْذٰكَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظٰلِمِيْنَ (الاسراء: ۸۸)

”اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس قرآن جیسا (کلام) پیش کرنا چاہیں تو اس جیسا پیش نہیں کر سکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کی کتنی مدد کریں“

یہ اعلان کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ دعویٰ اُس ذات کی طرف سے تھا جس نے کبھی وقت کے مشہور اُدب اور شعراء سے کوئی علم حاصل نہ کیا تھا، کبھی مشاعرے کی محفلوں میں کوئی ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا، اور کبھی کاہنوں کی صحبت بھی نہ اٹھائی تھی، خود شعر کہنا تو درکنار آپ کو دوسرے شعراء کے اشعار تک یاد نہیں تھے، پھر یہی وہ ذات تھی جسے میدانِ فصاحت کے یہ سُورما ایک نئے دین کا بانی کہا کرتے تھے، اگر یہ اعلان سچا ثابت ہو جائے تو ان کے آبائی دین کی ساری عمارت مُنہ کے بل گر پڑتی، اور اُن کی صدیوں پرانی رسوم و روایات کا سارا پگندہ بیوندِ زمین ہو جاتا تھا، اس لئے یہ اعلان نہ فقط اُن کی ادبی صلاحیتوں کو ایک زبردست چیلنج تھا، یہ اُن کے دین و مذہب پر

ایک کاری دار تھا، یہ اُن کی قومی حیثیت کے نام مبارزت کا ایک پیغام تھا، یہ اُن کی غیرت کو ایک للکار تھی، جس کا جواب دینے بغیر کسی غمخوار عرب کے لئے چلین سے بیٹھنا ممکن نہیں تھا، لیکن ہوا کیا؟ — اس اعلان کے بعد اُن آتش بیان خطیبوں اور شعلہ لہا شاعروں کی محفل میں سستا ناچھا گیا، کوئی شخص اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے نہ بڑھا، کچھ عرصہ کے بعد قرآن کریم نے پھر اعلان فرمایا کہ :-

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ
وَأَذْعُوا شِهْمَهُمْ آءِ كَمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّخِذُوا النَّارَ آلِيًا
وَأَقْرَبَٰهَا النَّاسَ وَالْحُجْرَةَ أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۚ (البقرہ: ۲۳)

”اور اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں ذرا بھی شک و شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی ایک (ہی) سورت بنا لاؤ، اگر سچے ہو، اور اللہ کے سوا تمہارے جتنے حمایتی ہیں اُن سب کو بلاؤ، پھر بھی اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور یقین ہے کہ ہرگز نہ کر سکو گے، تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔“

اس پر بھی بدستور سکوت طاری رہا، اور کوئی شخص اس کلام کے مقابلے میں چند جملے بھی بنا کر نہ لاسکا، سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کی کیفیت بقول علامہ جبر جانیؒ یہ ہو کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کے آخری سرے پر کوئی شخص اپنی فصاحت و بلاغت پر بغیر معمولی گھنڈڑ رکھتا ہے، تو وہ اس پر تنقید کرنے اور اپنے اشعار میں اس پر چوٹیں کسنے سے باز نہ رہ سکتی تھی، اس بات کا کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن کے ان محکمہ رسکرا اعلانات کے بعد بھی مچسکی بیٹھی رہے، اور اُسے دم مارنے کی

جرات نہ ہو؟ اس بات کی کوئی تاویل اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ فصاحت و بلاغت کے سوا قرآن کریم کا مقابلہ کر نیسے عاجز آچکے تھے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زک پہنچانیکے لئے ظلم و ستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا، آپ کو ستایا، مجنون کہا، جادوگر کہا، شاعر اور کاہن کہا، لیکن ان سے اتنا نہیں ہو سکا کہ قرآن کے مقابلے میں چند جملے پیش کر دیتے، پھر صرت یہی نہیں کہ یہ شعلہ بیان خطیب اور آتش نوا شاعر قرآن کریم کا مقابلہ نہیں کر سکے، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کلام کی حیرت انگیز تاثیر کا کھل کر اعتراف کیا، امام حاکم اور بیہقی نے قرآن کریم کے بالے میں ولید بن مغیرہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

والله ان لقوله الذي يقول خلاوة وان عليه
طلاوة... وانه ليعلوا وما لعلی،

خدا کی قسم! جو یہ کلام بولتے ہیں اس میں بلا کی شیرینی اور رونق ہے
یہ کلام غالب ہی رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا ہے

یہ ولید بن مغیرہ ابو جہل کا بھتیجا تھا، ابو جہل کو جب یہ پتہ چلا کہ میرا بھتیجا اس کلام سے متاثر ہو رہا ہے تو وہ اسے تنبیہ کرنے کے لئے اس کے پاس آیا، اس پر ولید نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! تم میں کوئی شخص شعر کے حسن و قبح کو مجھ سے زیادہ جاننے والا نہیں، خدا کی قسم! محمدؐ جو کہتے ہیں شعر کو اس کے ساتھ کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے،

اسی ولید بن مغیرہ کا واقعہ حضرت ابن عباسؓ نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب موسم حج آیا تو اس نے قریش کو جمع کر کے کہا کہ موسم حج میں عرب کے مختلف قبائل یہاں آئیں گے، اس لئے محمدؐ کے بالے میں کوئی ایسی بات طے کر لو کہ پھر باہم کوئی اختلاف نہ ہو، قریش نے کہا کہ ہم لوگوں سے یہ کہیں گے کہ محمدؐ کاہن ہیں،

۱۵ الخصائص الكبرى، للسيوطي، ص ۱۱۳ ج ۱ والاتقان، ص ۱۱۲ ج ۲،

۱۶ اخرجها الحاکم والبيهقي عن ابن عباس عن الخصائص الكبرى (۱۳/۱)

ولید نے کہا، خدا کی قسم: ان کا کلام کا ہنوں جیسا نہیں ہے، قریش نے کہا کہ پھر ہم انھیں
 مجنون کہیں گے، ولید بولا کہ ان میں جنوں کا شائبہ تک نہیں، قریش کہنے لگے کہ پھر ہم کہیں گے
 کہ وہ شاعر ہیں، ولید نے کہا کہ شعر کی تمام اصناف سے میں واقف ہوں، یہ کلام شعر
 ہرگز نہیں ہے، قریش نے کہا کہ پھر ہم انھیں جادوگر کہیں؟ ولید نے پہلے اس کا بھی انکا
 کیا، مگر عاجز آکر اسی پر فیصلہ ہوا، کہ جادوگر کہا جائے، کیونکہ یہ ایسا جادو ہے جو باپ
 بیٹے اور بھائی بھائی میں تفریق کرا دیتا ہے،^{۱۵}

اسی طرح عقبہ بن ربیعہ قریش کے سربر آوردہ لوگوں میں سے تھا، وہ آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصالحت کی گفتگو کرنے آیا، آپ نے سورہ لجم السجدہ کی ابتدائی
 آیات اس کے سامنے تلاوت فرمائیں، وہ ہمہ تن گوش سنتا رہا، یہاں تک کہ آپ نے آیت
 سجدہ پر سجدہ کیا، تو وہ بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر سیدھا گھر چلا گیا، لوگ اس کے پاس
 گفتگو کا نتیجہ معلوم کرنے آئے، تو اس نے کہا: خدا کی قسم! محمد نے مجھ کو ایسا کلام سنایا
 کہ میرے کانوں نے تمام عمر ایسا کلام نہیں سنا، میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں کیا جواب
 دوں؟^{۱۶}

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا
 ہے کہ عرب کے بڑے بڑے فصیح و بلیغ اُدبیار و شعراء نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کا معارضہ
 نہیں کر سکے، بلکہ قرآن کریم کی اثر انگیزی کا قوی یا عملی طور سے اعتراف کرنے پر
 مجبور ہوئے،

بعض غیر مسلم مصنفین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کسی نے قرآن کریم کے
 مقابلے پر کوئی کلام پیش کیا ہو، لیکن ہم تک اس کا کلام نہ پہنچ سکا ہو، علامہ

^{۱۵} اخرجہ البیہقی، وابن اسحق (الخصائص الکبریٰ، ص ۱۱۳ ج ۱)

^{۱۶} اخرجہ البیہقی، وابن اسحق (الخصائص الکبریٰ، ص ۱۱۵ ج ۱) و

ابو یعلیٰ (عن جابر بن عبد الرحمن الفوائد، ص ۲۶ ج ۲)

ابوسلیمان خطابی (متوفی ۳۸۸ھ) نے جو بڑے پایہ کے محدث ہونے کے علاوہ لغت اور ادب کے بھی امام ہیں، اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ :-

”یہ خیال بالکل غلط ہے، اس لئے کہ ابتداء سے عام اور خاص لوگوں کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ وہ اہم واقعات کو ضرور نقل کر کے آئندہ نسلوں کے لئے بیان کر جاتے ہیں، بالخصوص وہ واقعات جن کی طرف لوگوں کی نظریں لگی ہوتی ہوں۔ یہ معاملہ قرآن کریم کا چیلنج تو اس وقت چار دانگ عالم میں شہرت پا چکا تھا، اگر اس کا کوئی مقابلہ کیا گیا ہوتا تو اس کا ہم تک نہ پہنچنا ممکن ہی نہ تھا، اگر یہ بات ممکن ہو سکتی ہے تو بجز یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں کوئی اور نبی یا بے شمار انبیاء مبعوث ہوتے ہوں، ان پر کتابیں اتری ہوں، اور ان میں شریعت محمدی کے علاوہ کوئی اور شریعت بیان کی گئی ہو، اور یہ واقعات ہم تک نہ پہنچے ہوں، — اگر یہ بات ناقابل تصور ہے تو قرآن کریم کے معارضہ کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا“

البتہ چند سخر دُن نے قرآن کریم کے مقابلے میں کچھ مضحکہ خیز جملے بنا کر تھے وہ تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں، اور اہل عرب ہمیشہ ان کی ہنسی اڑاتے آئے ہیں مثلاً کسی نے ”سورۃ القارعہ“ اور ”سورۃ الفیل“ کے انداز پر یہ جملے کہے تھے، کہ ”اَلْفَيْلُ مَا الْفَيْلُ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْفَيْلُ، لَهْ مَشْفَرٌ طَوِيلٌ وَذَنْبٌ اَفْيَلٌ، وَمَا اَذَاكَ مِنْ خَلْقٍ رَبُّنَا الْفَيْلُ“۔ یا کسی نے قرآن کے مقابلے پر یہ جملے بنا کر تھے :- ”اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ فَعَلَ بِالْجَبَلِ، اَخْرَجَ مِنْهَا نَسْمَةً تَسْعٰى، بَيْنَ شَرِّ سَيْفٍ وَحَشٰى“ — یا میلہ کذاب نے ان جملوں کو قرآن کے مقابلے میں اپنی وحی قرار دیا تھا کہ یا ضفدع نفی کہ تنقیح

لا الماء تكدرين ولا الوارد تنفريين“ پھر نزولِ قرآن کے کافی عرصے کے بعد عربی کے مشہور ادیب اور دانشور برداز عبداللہ بن المقفع مترجم کلیلہ و دمنہ (متوفی ۳۸۰ھ) نے قرآن کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن اسی دوران کسی بچے کو یہ آیت پڑھتے سنا کہ **وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَ لِحِ وَيَا سَمَاءُ أَفْلَعِي**“ تو پکار اٹھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا محار ناممکن ہے، اور یہ ہرگز انسانی کلام نہیں ہے!

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات

اب ہم مختصراً ان اہم خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن کی بنا پر قرآن کریم کا کلام مُعْجَز ہے، ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ تو بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عذومات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) الفاظ کا اعجاز (۲) ترکیب کا اعجاز (۳) اسلوب کا اعجاز (۴) اور نظم کا اعجاز،

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبے کو پہنچا ہوا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے کلام

میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا، کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن۔۔۔

پورے قرآن کریم میں اللہ سے لے کر وائے الناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے

ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ناممکن ہی نہیں ہے، عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں سے ایک ہے، چنانچہ اُس میں ایک مفہوم کے لئے معمولی

۱۔ بیان اعجاز القرآن، الخطابی، ۳، المطبوع فی ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن، ص ۵۰ و ۵۱،

۲۔ اعجاز القرآن، للباقلانی، ۳، ص ۵۰ ج ۱ حاشی اللعنان،

معمولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جلتے ہیں، قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی کے لئے وہی لفظ منتخب فرماتا ہے جو عبارت کے سیاق، معنی کی ادائیگی اور اسلوب کے بہاؤ کے لحاظ سے موزوں ترین ہو، یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکے گی،

(۱) زمانہ جاہلیت میں "موت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے، مثلاً موت، ہلاک، فنا، حقتہ، قحوت، جہام، منون، سام، قافیہ، یمن، یظ، فود، مقدار، جبار، قیام، حلاق، طلاطل، طلاطلہ، عول، زام، کفت، جدرع، حزرہ، خاج، لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہل عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت

کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتے ہیں، اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں، چونکہ وہ لوگ معاد و آخرت اور حساب و کتاب کے قائل نہیں تھے، اس لئے

انہوں نے موت کے لئے جتنے نام تجویز کئے ان سب میں اس نظریہ کی جھلک موجود ہے، اگر قرآن کریم اہل عرب کی اپنی قدیم تعبیرات پر اکتفا کرتا تو موت کے بارے میں ان کے باطل نظریہ سے کسی درجہ میں موافقت کا شبہ ہو سکتا تھا، چنانچہ جس جگہ موت کی حقیقت

بیان کرنی تھی، وہاں موت کے مفہوم کے لئے قرآن نے مذکورہ چوبیس الفاظ کو چھوڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا اور عربی زبان کو ایک ایسا خوب صورت، مختصر، جامع اور فصیح لفظ عطا کیا، جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جائے، اور وہ لفظ "تَوَاتِي"

جس کے لغوی معنی ہیں "کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا" اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ایسی فنا کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزاء کو بجا کر کے ان میں دوبارہ روح کو ٹوٹا سکتا ہے، "موت" کے لئے یہ لفظ قرآن کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا، چنانچہ ابن سیرہ نے "المختص" میں "موت" کے دوسرے الفاظ کے لئے قول اہل عرب

لہ ابن سیرہ اندلسی نے یہ تمام نام شمار کرائے ہیں، اور اہل عرب کے اشعار سے اس کی مثالیں

میں کی ہیں، (المختص، لابن سیرہ، ص ۱۱۵ ج ۶)

کے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں، لیکن "توتی" کے لئے قرآن کریم کے سوا کوئی استشہاد پیش نہیں کیا ہے۔

(۲) ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن چونکہ ان کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا، اس لئے اہل زبان انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن قرآن کریم ایسے مواقع پر ایسی خوب صورت تعبیر اختیار کرتا ہے کہ ذوقِ سلیم و جبرکراٹھتا ہے، مثلاً عربی میں تعمیر مکان کے لئے بچی ہوئی اینٹوں کے لئے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب ثقیل، مبتذل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً الْجُرْحَمَةُ اور مَطْوِيٌّ، اب قرآن کریم میں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک ادبچا محل تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں بچاؤ، اس واقعے کو ذکر کرنے کے لئے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر تھا، لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزانہ انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حسن کے ساتھ ادا ہو گیا، اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قباحت بھی پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ ارشاد فرمایا:-

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرِي
فَأَوْقِنِّي يَا هَامَانَ عَلَى الطِّينِ مَا جَعَلْتُ لِي صَرَحَاءَ (القصص: ۳۸)

اور فرعون نے کہا کہ سردارانِ قوم! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں، پس اے ہامان! گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لئے ایک محل تعمیر کرو۔

(۳) عربی میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو مفرد ہونے کی حالت میں تو سبک اور فصیح ہیں، لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً زمین کے معنی میں لفظ "أَرْضٌ" ایک سبک لفظ

۱۔ یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، للشیخ البتوری حفظہ اللہ، ص ۵۶، مجلس علمی دار البیروت
۲۔ ۳۵۴، لہذا ایضاً بحوالہ المشکلات لابن الاثیر، ص ۱۱،

ہے، اس کی دو جہیں عربی میں مستعمل ہیں، اَرْضُون اور اَرْضِي، یہ دونوں ثقیل سمجھی جاتی ہیں، اور اُن کی وجہ سے کلام کی سلاست میں فرق واقع ہو جاتا ہے، لیکن جہاں جمع کا مفہوم ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، وہاں ادبائے عرب انہی کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، اس کے برخلاف قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر سَمَاتٌ کو بصیغہ جمع اور اس کے ساتھ اَرْض کو مصدر استعمال کیا ہے، اور کہیں اَرْض کو بصیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا البتہ ایک جگہ سات زمینوں کا ذکر کرنا تھا، جس کے لئے جمع کا صیغہ لانا ضروری تھا، لیکن قرآن نے اس صیغہ جمع سے احتراز کر کے ایسی خوب صورت تعبیر اختیار کی کہ مفہوم بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہو گیا، اور نہ صرف یہ کہ کلام میں کوئی نقل پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کے حُسن میں چند در چند اضافہ ہو گیا، ارشاد ہے :-

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: ۱۲)

”اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور زمین میں سے بھی اتنی ہی“

دیکھئے: یہاں سَمَاتٌ (آسمان) کی جمع تولائی گئی، لیکن قرآن نے اَرْض کی جمع لانے کے بجائے اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ کی تعبیر اختیار فرمائی جس کے اسرار و نکات پر جس قدر غور کیجئے، معجزانہ بلاغت کا دریا موجزن نظر آتا ہے،

(۴) قرآن کریم کے بعض الفاظ پر بعض ملحدوں نے ثقیل ہونے کا اعتراض کیا ہے، مثلاً لفظ ”جَنِينِي“ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بعض الفاظ اپنی ذات میں ثقیل ہوتے ہیں لیکن ادیب ایسے سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ اس جگہ اس سے بہتر لفظ نہیں لایا جاسکتا، اردو میں اس کی مثال یہ ہے کہ ”دھول دھپا“ ایک مبتذل لفظ سمجھا جاتا ہے، جسے فصیح و بلیغ عبارتوں میں عموماً استعمال نہیں کیا جاتا، لیکن غالب کا یہ شعر دیکھئے

دھول دھپا اُس سر پایا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہر کی بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہاں یہ لفظ ایسے سلیقے کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے

توحش بیان پر پانی پھر جائے گا، عربی میں اس کی مثال یہ ہے کہ گردن کی ایک رگ کا نام
 "اخذع" ہے، عربی کے دو شاعروں نے اس لفظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے،
 لیکن دونوں میں حُسن و سلامت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، ابو تمام کہتا ہے:

ياد هس قوم عن اخذ عيك فعتد

اصحجت هذا الانام عن خرقك

یہاں یہ لفظ بڑا ثقیل اور بوجھل معلوم ہو رہا ہے، لیکن اس کے بعد حسانہ کے ایک شاعر
 عبداللہ بن الصمہ کا یہ شعر پڑھتے س

تلقنت نحوالحي حتى وحبداً ثني

ووجوت من الاصغاء ليتنا و اخدعا

اس میں وہی ثقیل لفظ اتنی روانی اور خوبصورتی سے آیا ہے کہ ذوقِ سلیم پر کوئی گرائی
 نہیں ہوتی، بلکہ شعر میں مجموعی طور پر جو سوز و گداز پایا جا رہا ہے یہ ثقیل لفظ اس میں بھی
 پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں لفظ "ضیضی" بھی ایسے حُسن کے ساتھ آیا
 ہے کہ اس کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا،

اَلَكُمُ الدَّكْرُ وَ اَلْاُنْثَى، تَلَقَّ اِذَا قَسَمَتْ ضَيْضَى

اگر انفرادی طور سے دیکھا جائے تو قِسْمَةٌ جَائِزَةٌ يَاقِسْمَةُ ظَالِمَةٌ کے الفاظ
 ضیضی کے مقالے میں بہتر معلوم ہوتے ہیں، لیکن جس سیاق میں لفظ ضیضی قرآن
 میں آیا ہے وہاں اگر جَائِزَةٌ یا "ظالمۃ" کے الفاظ رکھ دیتے جائیں تو کلام کی ساری
 روانی ختم ہو جائے گی؟

۱۔ یہ چاروں مثالیں بنیادی طور پر مولانا محمد یوسف صاحب پٹوری صاحب مدظلہم کی کتاب
 "یقیمۃ البیان" سے ماخوذ ہیں، جو حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب
 "مشکلات القرآن" کے مقدمہ کے طور پر شائع ہوئی ہے، موصوف نے یہ مثالیں حضرت شاہ صاحب
 اور علامہ ابن اثیرؒ کی "المثل السائر فی ادب الکاتب الشاعر" کے حوالے سے پیش کیں ہیں،

ترکیب کا اعجاز | الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اوج کمال پر ہے،

قرآن کریم کے جملوں کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں :-

قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی، اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لئے عربی میں کئی مقبولے مشہور تھے، مثلاً **الْقَتْلُ اِحْيَاءٌ لِلْجَمِيعِ** (قتل اجتماعی زندگی ہے) اور **اَنْفُسُ اَنْفُسٍ** (قتل قتل کی روک تھام ہوتی ہے) اور **اَكْثَرُ الْقَتْلِ لِيَقِلَّ الْقَتْلُ** (قتل زیادہ کرو تا کہ قتل کم ہو جائے)۔ ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد عام تھے، اور فصیح سمجھے جاتے تھے، قرآن کریم نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے :-

وَكُنْهِيَ الْقِصَاصُ حَمِيَّةً

”اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے“

اس جملے کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت، اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھے بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے، اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں،

اسلوب کا اعجاز | قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ کہیں

ناکس کر سکتا ہے، اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :-
(۱) قرآن کریم ایک ایسی نثر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد وضوابط ملحوظ نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا لذیذ اور شیریں آہنگ پایا جاتا ہے، جو شعر سے کہیں زیادہ خللاوت اور لطافت کا حامل ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جمالیاتی ذوق نظم اور شعر میں ایک ایسی لذت اور خللاوت محسوس کرتا ہے جو نثر میں محسوس نہیں ہوتی، اگر آپ اس

لذت اور سلاوت کے سبب پر غور فرمائیں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کا راز و حقیقت لفظوں کی اس ترتیب میں مضمر ہے جو ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، عربی، فارسی و لوزی کی قدیم شاعری میں اس آہنگ کی لذت شعر کے خاص اوزان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جب ایک ہی صوتی وزن کے الفاظ بار بار کانوں میں پڑتے ہیں تو اس سے ذوق سلیم کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے، اور پھر جب وزن کے ساتھ قافیہ بھی مل جاتا ہے تو اس کی لذت دو چند ہو جاتی ہے، اور جب اس کے ساتھ ردیف کی یکسانیت بھی شامل ہو جاتی ہے تو لذت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور اگر مصرعوں کے بیچ بیچ میں عروضی اوزان کے ساتھ صرفی اوزان اور قوافی کی یکسانیت بھی شامل ہو جائے (جیسا کہ مرثعہ اشعار میں ہوتا ہے) تو یہ لذت اور بڑھ جاتی ہے،

لیکن اوزان اور قوافی کے اصول ہر خطے اور ہر زبان میں یکساں نہیں ہوتے، ہر زبان کے لوگ اپنے اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے اس کے لئے مختلف قواعد مقرر کرتے ہیں، مثلاً اہل عرب نے اپنی شاعری کو وزن اور قافیہ کے ان ساخون تک محدود رکھا ہے، جو خلیل بن احمد وغیرہ نے وضع کئے ہیں، فارسی شاعری میں اوزان کا دائرہ کچھ اور وسیع کیا گیا، اور نئی نئی بحرین اختیار کی گئیں، لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی میں زیادہ کڑی شرائط عائد کر دی گئیں، چنانچہ عربی شاعری میں قبور اور کبیر کو ہم قافیہ سمجھا جاتا ہے، اور اگر ایک شعر میں قبور اور دوسرے میں کبیر آ رہا ہو تو اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، جبکہ فارسی میں یہ ممکن نہیں، اسی طرح عربی میں اگر ایک ہی کلمہ کا آدھا حصہ پہلے مصرعہ میں اور آدھا دوسرے میں ہو تو اسے محبوب نہیں سمجھتے جبکہ فارسی میں یہ زبردست عیب ہی، بلکہ ایسا شعر شعر ہی نہیں سمجھا جاتا، نیز عربی شاعری میں زحافات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ بسا اوقات اصلی بحر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، جبکہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا، اسی طرح عربی شاعری میں ردیف کا کوئی تصور نہیں جبکہ فارسی میں ردیف کے بغیر غزل پھیلکی سمجھی جاتی ہے، مزید یہ کہ اصل عربی شاعری میں فارسی کی طرح مثنوی، مستزاد، مخمس، مسلسل، رباعی اور قطعہ بند نظموں جیسی

اصناف کا وجود نہیں تھا، جبکہ فارسی ان اصناف سے مالا مال رہی ہے، اور پھر اسی کے اثر سے انڈس وغیرہ میں موسیحات اور ارجال وغیرہ کی اصناف رائج ہوئیں، عربی اور فارسی میں ان اختلافات کے باوجود اوزان میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے، لیکن تدریم ہندی شاعری کو دیکھتے تو اس میں معروف عروضی اوزان کے بجائے صرف حروف کی تعداد کا لحاظ ہوتا ہے، اور اگر دونوں لفظوں کے حروف کی تعداد ایک ہو تو انھیں ہم وزن سمجھا جاتا ہے، خواہ ان کی حرکات و سکنات میں بڑا فرق ہو، بلکہ بعض اوقات ہندی دو ہونے پر عروضی اوزان و قوافی قائم یا ردیف کے قواعد، بلکہ تعداد حروف تک میں بڑا فرق ہوتا ہے، اس کے باوجود انھیں بڑے لطف کے ساتھ پڑھا اور گایا جاتا ہے، اور ان کی تاثیر ناقابل انکار ہوتی ہے اور اس معاملے میں انگریزی شاعری کا مزاج شاید سہی سے زیادہ آزاد واقع ہوا، کہ اُس میں عروضی اوزان تو کچھ مصرعوں کے طول و عرض میں بھی بسا اوقات زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، اکثر قافیے کی بھی کوئی خاص رعایت نہیں ہوتی، بلکہ صرف تلفظ کے کھٹکوں (Syllables) سے ایک خاص آہنگ (rhythm) پیدا کیا جاتا ہے، اور وہی آہنگ اہل زبان کے لئے ایک خاص لذت و کیف کا سبب بن جاتا ہے،

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کی لذت و حلاوت میں اوزان و قوافی کے لگے بندھے قواعد کوئی عالمگیر حیثیت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ یہ قواعد مختلف زبانوں اور خطوں میں بدلتے رہتے ہیں، لیکن ایک چیز ہر جہاں سب زبانوں اور تمام قوموں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ ہے "ایک متوازن صوتی آہنگ" یعنی الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ اُن کے تلفظ سے اور انھیں سنکر انسان کا جمالیاتی ذوق حظ محسوس کرے، لیکن انسان چونکہ اس قدر مشترک کو اوزان و قوافی کے معروف سانچوں سے الگ کرنے پر قادر نہیں، اس لئے جب وہ شاعری کا لطف پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے لازماً اپنے ماحول کے

بنائے ہوتے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے، یہ صرف قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں مقرر کئے ہوئے شعری قواعد میں سے کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی، بلکہ صرف ”متوازن صوتی آہنگ“ کی اس قدر مشترک کو اختیار کر لیا کہ جو ان سارے قواعد کا اصل مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نثر ہونے کے باوجود شعر سے زیادہ لطافت اور حلاوت کا حامل ہے، اور صرف اہل عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے لوگ اُسے سن کر غیر معمولی لذت اور تاثیر محسوس کرتے ہیں،

یہیں سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بعض کفارِ عرب نے قرآن کریم کو کس بنا پر شعر قرار دیا تھا؟ ظاہر ہے کہ شعر کی معروف تعریف کسی بھی طرح قرآن کریم پر صادق نہیں آتی، اور کفارِ عرب اپنی ہزار گراہیوں کے باوجود اتنی جس ضرور رکھتے تھے کہ نثر اور نظم میں تمیز کر سکیں، وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ شعر کے لئے وزن اور قافیہ کی پابندی ضروری ہے، جو قرآن کریم میں مفقود ہے، اس کے باوجود انھوں نے قرآن کریم کو شعر اس بنا پر قرار دیا کہ اس کے اسلوب اور آہنگ میں انھوں نے شعر سے زیادہ حلاوت اور تاثیر محسوس کی تھی، اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وزن اور قافیہ کی پابندی کے بغیر اس کلام میں شعری ذوق اور وجدان کے لئے وہ جمالیاتی لذت بدرجہ اتم موجود ہے، جو اوزان و قوافی کی جکڑ بندیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی،

قرآن کریم نے ”متوازن صوتی آہنگ“ کی یہ تاثیر پیدا کرنے کے لئے کونسے نئے اصولوں کی رعایت رکھی ہے؟ اس بات کو بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، کیونکہ مرد و جنہ الفاظ و مصطلحات اُس کیفیت کو ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے جو قرآنی اسلوب میں رواں دواں نظر آتی ہے، ہاں جس شخص کو ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کا کچھ حصہ ملا ہو وہ ہمارے مذکورہ بالا بیان کی صداقت کو تلاوتِ قرآن کے دوران خود بخود محسوس کر سکتا ہے،

۱۵ یہ پوری بحث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الفوز الکبیر“ سے تشریحی اضافوں کے ساتھ ماخوذ ہے، اس کی مزید تفصیل کیلئے اس کے باب ۱۲ فصل ۱۲ کا مطالعہ کیا جا

(۲) علماء بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں تشریح کی ہیں، خطابی، ادبی، علمی، ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جدا اور مواقع مختلف ہیں، اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کر دینا ممکن نہیں ہے، آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے، اور جب کوئی ادبی نثر لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے، اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور اختیار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس میں خطابت کا زورِ ادب کی شگفتگی اور علم کی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے، اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی،

(۳) قرآن کریم کے مخاطب اھلِ ہر درجہ کے ہیں، پڑھے لکھے لوگ بھی اور اعلیٰ درجے کے علماء اور ماہرینِ فنون بھی، لیکن اس کا ایک اسلوب بیک وقت ان تینوں طبقوں کو متاثر کرتا ہے، ایک طرف ان پڑھ آدمی کو اس میں سادہ حقائق ملتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ قرآن میرے ہی لئے اتر ہے، لیکن دوسری طرف علماء اور محققین جب اُسے گہری نظر سے پڑھتے ہیں تو انھیں قرآن کریم میں علمی نکات نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب علم و فن کی ایسی باریکیوں پر مشتمل ہے کہ معمولی واقفیت کا آدمی انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا

ایک عام آدمی کے ذہن کے پیش نظر قرآن کریم کا طریق استدلال بہت سادہ اور زیادہ تر مشاہدہ کی دلیلوں پر مبنی ہے، توحید، رسالت، آخرت، آفرینش، حیات، اور بربادی جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس نے بالکل سامنے کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے، اور مظاہرِ فطرت کی طرف اشارہ کر کے وہ حقائق بیان فرمائے ہیں، جو آسان کے ساتھ ایک ادنیٰ ذہنی معیار کے آدمی کی سمجھ میں آسکیں، لیکن انہی سادہ حقائق کی تہ میں اتر کر دیکھئے تو اس میں خالص عقلی اور منطقی دلائل بھی ملیں گے، جو فلسفیانہ موشگافیوں کے مریض کو بھی شفا بخشتے ہیں، باتوں باتوں میں اس نے فلسفہ اور سائنس کے وہ دقیق مسائل بھی حل کر دیئے ہیں جن کی تحقیق کے لئے بڑے بڑے

فلسفی آخر تک پیچ و تاب کھاتے رہے،

(۴) اگر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے تو کمزور الادب و انشاء میں خواہ کتنا بلند پایہ مقام رکھتا ہو ایک مرحلے پر پہنچ کر سننے والے اکتا جاتے ہیں، کلام کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اور اس کی تاثیر کم ہو جاتی ہے، لیکن فخرآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض اوقات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے، ایک ہی واقعہ بار بار مذکور ہوا ہے، لیکن ہر مرتبہ نیا کیفیت، نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے،

(۵) کلام کی شوکت اور اس کی نزاکت و شیرینی دو متضاد صفتیں ہیں، دونوں کے لئے الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے، ان دونوں صفتوں کو ایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے، لیکن یہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ اس میں یہ دونوں اوصاف بدرجہ کمال یکجا پائے جاتے ہیں،

(۶) قرآن کریم نے بعض اُن مضامین میں بلاغت کو اوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کر سکتا، مثلاً قانون وراثت کو لیجئے، یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب و شاعر مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حُسن پیدا نہیں کر سکتے، لیکن اس کے بعد سورۃ نساء میں **يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ مِنْ رِزْقِهِ** اور **لَا يَكْفُرُ الْإِنْسَانُ بِرِزْقِهِ** کی تلاوت کیجئے، آپ بیساختہ پکارا اٹھیں گے کہ یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے، اس پورے رکوع میں قانون وراثت بیان کیا گیا ہے، لیکن اس حُسن و جمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوقِ سلیم دھدکرتا ہے،

(۷) ہر شاعر اور ادیب کی فصاحت و بلاغت کا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے جس سے ہٹ کر اس کا کلام بھیکا پڑ جاتا ہے، عربی میں امرؤ القیس نسیب و غزل کا امام ہے، نابغہ، خوف و ہیبت کے بیان میں، احنش، حُسن طلب اور وصف میں اور زہیر رغبت و امید میں بے نظیر ہے، یہی حال ہر زبان کا ہے، لیکن قرآن کریم میں اس قدر مختلف الانواع مضامین بیان کئے گئے ہیں کہ اُن کا احاطہ دشوار ہے،

لیکن ترغیب ہو یا ترہیب، وعدہ ہو یا وعید، وعظ و نصیحت ہو یا امثال و قصص عقائد کا بیان ہو یا احکام کا، ہر جگہ اس کا بیان بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار کو پہنچا ہوا ہے،

(۸) اختصار اور ایجازِ قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے اور اس وصف میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے، قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے ہرزمانے کی رہنمائی کے لئے آیا ہے، اس لئے اس نے مختصر جملوں میں وہ وسیع مضامین سمیٹ دیئے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اس سے ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں، چودہ سو سال گزر جانے پر بھی اس کے مضامین پڑنے نہیں ہوتے، اس عرصے میں انسانی زندگی نے کتنے پلے پھکائے، کیسے کیسے عظیم انقلابات رونما ہوئے، لیکن قرآن کریم سدا بہار رہا اور رہے گا، وہ تاریخ کی کتاب نہیں، مگر تاریخ کا مستند ترین ماخذ ہے، وہ سیاست و قانون کی کتاب نہیں، لیکن اس نے چند مختصر جملوں میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرمادیئے ہیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں، لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عقیدے کھول دیئے ہیں، وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں، لیکن دونوں موضوعات پر اس نے اختصار کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دیدی ہیں کہ دنیا کے علوم و فنون سینکڑوں ٹھوکریں کھلنے کے بعد آج ان کے قریب پہنچ رہے ہیں،

نظم کا اعجاز | قرآن کریم کا ایک دقیق اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط و تعلق، تلاوت فرمائیں تو بظاہر یہ محسوس ہوگا کہ اس کی ہر آیت جدا مضمون کی حامل ہے، اور ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے، اسی وجہ سے نظم قرآن کے بارے میں مفسرین کے دو گروہ ہو گئے ہیں، بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ تیسیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اس لئے اس میں کوئی ربط و ترتیب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، اس کی ہر آیت ایک مستقل مضمون کی حامل ہے، اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے، وہ شروع سے آخر

تک با ہم مربوط ہو، اور اسی نقطہ نظر سے اس کا مطالعہ ضروری ہے، اس دوسرے
 گروہ کی دلیل یہ ہے کہ کسی کتاب کا بے ربط ہونا اس کے نقص کی دلیل ہوتی ہے، اور اللہ
 تعالیٰ کا کلام لازماً اس نقص سے بری ہے، مگر پہلا گروہ اس کے جواب میں یہ کہتا ہے
 کہ جس طرح قدرتی مناظر میں کوئی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی بلکہ اُن کا حُسن ہی اس
 بے ترتیبی میں ہوتا ہے کہ کہیں بل کھاتا ہو اور یا ہے، کہیں ناہموار پہاڑ ہے، کہیں اونچی
 نیچی وادیاں ہیں، اسی طرح قرآن کریم کا حُسن بھی اس کی اس مستقل حیثیت میں ہے
 غزل کے ہر شعر کا موضوع جدا ہوتا ہے اور اس کو کوئی عیب نہیں سمجھتا، بس بلا تشبیہ
 اسی طرح قرآن کریم میں بھی بے ترتیبی کوئی عیب نہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات کے درمیان نہایت لطیف ربط پایا جاتا
 ہے، اور اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ورنہ اگر کوئی ترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو ترتیب نرد
 اور ترتیب کتابت میں فرق رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جس ترتیب سے قرآن کریم
 نازل ہوا تھا، اسی ترتیب سے لکھ لیا جاتا، یہ جو کتابت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 نے ایک الگ ترتیب قائم فرمائی وہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآنی آیات
 میں ربط موجود ہے، البتہ یہ ربط قدرے دقیق ہوتا ہے، اور اس تک پہنچنے کے لیے بڑے
 غور و فکر کی ضرورت ہے،

اس ربط کو اتنا دقیق اور غامض رکھنے کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم)
 کہ ہر آیت کی ایک مستقل حیثیت باقی رہے، اور اس کے الفاظ کا عموم ختم نہ ہونے پائے
 تاکہ العبرة بعموم اللفظ پر عمل کرنا آسان ہو، اس کے علاوہ اُس زمانے میں اہل عرب
 کے خطبات و قصائد کا اسلوب عموماً یہی ہوتا تھا کہ اُن کے مضامین مرتب اور مربوط ہو
 کے بجائے مستقل حیثیت رکھتے تھے، لہذا یہ طریقہ اُس دور کے ادبی ذوق کے عین
 مطابق تھا، چنانچہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے، قرآن کریم کی ہر آیت مستقل معلوم
 ہوگی، لیکن جب آپ ذرا غور کی نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ پورا کلام مسلسل
 اور مربوط ہے،

اس طرح قرآن کریم نے اپنے نظم میں جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ اس کا دقیق ترین اعجاز ہے، اور اس کی تقلید بشری طاقت سے بالکل باہر ہے، بہت سے علماء نے قرآن کریم کے نظم کی توضیح کے لئے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں کے ضمن میں اسے بیان کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے، اس معاملے میں امام فخر الدین ازگن کی تفسیر کبیر شاید سب سے زیادہ قابل تعریف کاوش ہے، انھیں اللہ نے نظم قرآن کی تشریح کا خاص سلیقہ اور خاص توفیق عطا فرمائی ہے، ان کے بعد قاضی ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نظم قرآن کی خصوصیات کو بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے بعد کے بیشتر مفسرین اس معاملے میں اپنی دو حضرات کے خوش چیں ہیں، نظم قرآن کی ایک ہلکی سی جھلک اس مثال میں دیکھی جاسکتی ہے، سورہ حجر میں ایک جگہ ارشاد ہے:-

يٰۤاَيُّهَا عِبَادِيَ اِنِيْ اَنَا الْعَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۗ وَاَنْ عَذَابِيْ
هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۗ (الحجر: ۴۹ و ۵۰)

”میرے بندوں کو بخبر دید کہ میں غفور اور رحیم ہوں، اور میرا عذاب
(بھی) بڑا دردناک ہے“

اس کے فوراً بعد ارشاد ہے:-

وَيَذُرُّهُمْ عَنْ صَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ (الحجر: ۵۱)

اور انھیں ابراہیم کے جہانوں کی خبر دے دو“

اور اس کے بعد فرشتوں کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے، بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پہلے جملے کی تائید ہے، اس لئے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے، انھوں نے دو کام کئے، ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحق علیہ السلام جیسے صالح بیٹے کی خوش خبری دی، دوسرے اپنی فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی پر

جا کر عذاب نازل کیا، پہلا کام ”أَنَا الْمُقْوَمُ الرَّحِيمُ“ کا مظاہرہ تھا اور دوسرا کام ”عَذَابِي هُوَ عَذَابُ ابْنِ الْكَافِرِ“ کا، اس طرح یہ دونوں جملے باہم نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں لیکن الگ الگ دیکھتے تو ان کی مستقل حیثیت بھی ہے!

قرآن کریم کی پیشگی خبریں

یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب وہ کسی کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے، اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے تو لوگوں پر اس کا کلام اللہ ہونا ثابت کرنے کے لئے اس میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی کچھ پیشگی خبریں دی جاتی ہیں، اگرچہ پیشینگوئیاں خبریوں کی طرف سے بھی کی جاتی ہیں، لیکن اول تو وہ یقینی نہیں ہوتیں، چنانچہ بڑے سے بڑا نجومی کبھی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ اس کی ہر پیشینگوئی درست نکلی ہے، اور کبھی کوئی غلطی نہیں ہوتی، دوسرے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹے دعویٰ نبوت کے ساتھ کوئی پیشینگوئی کرتا ہے تو اسے پورا نہیں ہونے دیا جاتا، قرآن کریم نے کلام اللہ ہونے کے ساتھ پیسوں پیشگی خبریں دی ہیں اور وہ سب کی سب بلا استثنا صحیح ثابت ہوئیں، جس کا انکار اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکا، یہاں ان تمام پیشگی خبروں کو با تفصیل بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن چند اہم خبریں مثال کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں :-

رومیوں کی فتح | جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد مکہ مکرمہ میں تشریف لایا تھے اور مشرکین مکہ کی طرف سے آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی تھیں، ٹھیک اسی وقت دنیا کی دو عظیم طاقتوں روم اور ایران کے درمیان شدید جنگ برپا تھی، اس جنگ میں ایرانی فوجیں مسلسل رومیوں پر غالب آتی جا رہی تھیں،

لہٰذا یہاں ہم نے اعجاز قرآن کی صرف چند اہم وجوہ بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے، مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے ”باتیں سے قرآن تک“ از حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مرتبہ، احقر ص ۳۵۷

ج ۲، نیز علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ ”اعجاز قرآن“

رومیوں کے پاؤں ہر جگہ سے اکٹھے رہے تھے، اور ایرانی لشکر شام کے بڑے بڑے شہروں کو تاخت و تاراج کرتا ہوا طوفانی رفتار سے بڑھ رہا تھا، رومی حکومت پلے درپلے ناکامیوں، متواتر شکست اور جان و مال کے بے پناہ نقصان کے باعث اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ اس کا کسی مقام پر قدم جمانا ہی مشکل تھا، یہ جانتے کہ وہ پلٹ کر کوئی حملہ کر سکے، یہ صورت حال کفار عرب کے لئے باعث مسرت تھی، کیونکہ وہ ایران کو آتش پرست ہونے کی بنا پر اپنے مشاہبہ اور روم کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مشاہبہ سمجھتے تھے، اور ایرانیوں کا غلبہ ان کے نزدیک اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا شگون تھا، ان حالات میں سورۃ روم کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں،

الْقَمَّةُ غَلَبَتْ الرُّومَ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَلَيْهِمْ
سَيَعْلَبُونَ فِي بَضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدِ
وَيَوْمَئِذٍ يَهْمُكَ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَ
هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وَعَدَّ اللَّهُ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ وَعَدَّهُ وَلَكِنَّ
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الروم: ۱-۶)

۳ الف، لام، میم، روم (ولے) قریب ترین زمین (یعنی اردن) میں مغلوب ہو گئے، اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں میں غالب آجائیں گے، اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے پہلے کام بھی اور بعد بھی، اور اس روز مسلمان اللہ کی مدد کی وجہ سے خوش ہوں گے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، اور وہ زبرد اور جبربان ہو، یہ اللہ کا وعدہ ہے، اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۛ

جو لوگ روم اور ایران کے جنگی حالات سے باخبر تھے ان کیلئے یہ پیشینگوئی قطعی طور پر ناقابل یقین تھی، چنانچہ قریش کے ایک ممتاز سردار ابی بن خلف نے حضرت ابو بکرؓ سے شرط لگائی کہ اگر تین سال کے دوران رومی غالب آ گئے تو میں تمہیں دس اونٹوں کا، اور اگر غالب نہ آسکے تو تم مجھے دس اونٹ دو گے، اُس وقت اس طرح کی

شرط جائز تھی، اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے اسے منظور فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع کی، آپؐ نے فرمایا کہ قرآن نے ”بضع سنین“ (چند سالوں میں) فرمایا ہے، اور عربی میں لفظ ”بضع“ (چند) کا اطلاق تین سے لے کر نو سال تک ہوتا ہے، لہذا تم اُبی بن خلف سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر شرط کی مدت نو سال تک مقرر کر لو، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اُبی بن خلف سے نو سال کی مدت مقرر کر کے تنواؤنٹوں کی شرط لگائی، اگرچہ اس پیشینگوئی کے وقت اسکے پورے ہونے کی کوئی آثار نہ تھی، بلکہ اسکے بعد بھی ایرانی فوج آگے ہی طرہتی چلی گئیں، یہاں تک کہ رومیوں کے دار الحکومت قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچیں، مشہور مؤرخ ایڈورڈ گتین اس پیشینگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اس وقت جبکہ یہ پیشینگوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از قیاس نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہر قتل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے ۱۱

(سقوطِ زوالِ سلطنتِ روم، ج ۵ ص ۴۳ و ۴۴)

لیکن اپنی پہلی شکست کے ٹھیک سات سال بعد قیصر روم بالکل خلاق توقع قسطنطنیہ سے جا بڑھ گیا اور اسکی فوجوں نے ایرانیوں پر پے در پے حملے کر کے انہیں متعدد مقامات پر شکست فاش دی اور اس کے بعد رومی لشکر ہر جگہ غالب ہی آتا چلا گیا،

اور اس عرصہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جا چکی تھی اور کفارِ مکہ کے ساتھ ان کی جنگیں شروع ہو گئی تھیں، اور جن وقت بدر کے میدان میں تین سو تیرہ بہتے مسلمان ایک ہزار مسلح سواروں کا منہ پھیر رہے تھے ٹھیک اسی وقت یہ خبر ملی کہ رومیوں نے اہل ایران کو شکست دیدی ہے، اس وقت یہ واضح ہوا کہ قرآن کریم نے رومیوں کی فتح کی خبر دینے کے ساتھ جو فرمایا تھا کہ **يَوْمَئِذٍ يَفِرُّ الْمُؤْمِنُونَ بِمَنْصُورٍ** اللہ (اس روز مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے) اس سے مسلمانوں کی دوسری خوشی کی طرف اشارہ تھا، ایک دہائیوں کی فتح کی اور دوسری بدر کے میدان میں خود اپنی فتح کی،

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ | **فتحِ مکہ کی خبر** آ کر ہجرت کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکلے، اور غارتوں میں تین روز قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے راستے پر حقیقہ کے قریب پہنچے تو وہاں سے مکہ مکرمہ جانے والی

سڑک نظر آئی، اور طبعی طور سے آپ کو وطن کی یاد آئی، اور اُسے مستیلاً چھوڑ دینے کے خیال سے افسوس ہوا، اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:-

إِنَّ الْغِزْيَ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَدَاكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ،

”بلاشبہ جس ذات نے قرآن کے احکام آپ پر فرض کئے ہیں وہ آپ کو دوبارہ لوٹائے گا“

اُس وقت آپ جس بے سرو سامانی کے عالم میں مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اُس کے پیش نظر ظاہری اعتبار سے اس پیشینگوئی کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہ تھی، لیکن چند ہی سال بعد آپ اسی شہر مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہ پیشینگوئی پوری ہو کر رہی یہودیوں کی تمنائے موت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودی کہا کرتے تھے کہ آخرت کی فلاح و کامیابی صرف یہودیوں کا مقدر ہے، اور ہم ضرور جنت میں جائیں گے، اس کے جواب میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:-

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَ كُنْ يَتَمَنَّوْا أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ آيِدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

”آپ فرمادیجئے کہ (اے یہودیو!) اگر اللہ کے پاس صرف تمہارے لئے خاص طور پر دارِ آخرت ہی، دو سکر لوگوں کے لئے نہیں تو تم موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو، اور یہ لوگ اپنے کرتوت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے“

یہ چیلنج اور یہ پیشینگوئی مدینہ طیبہ کے اس ماحول میں کی جا رہی ہے جہاں یہودیوں کی بستیاں کی بستیاں آباد ہیں، اور مسلمانوں کو دن رات ان سے بحث و مناظرہ کا اتفاق پیش آتا رہتا ہے، اگر یہ چیلنج بذریعہ وحی نہ دیا گیا ہوتا تو جو یہودی آپ کی تکذیب

کا کوئی موقع فردگذاشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ بڑی آسانی سے علی الاعلان موت کی تمنا کر کے دکھا سکتے تھے، اور اس طرح جو مناظرے شب و روز جاری تھے ان کا فیصلہ ایک ہی لمحے میں ہو سکتا تھا، لیکن اس آیت کے نزول کے بعد یہودیوں کو سانپ سونگھ گیا، اور کوئی ایک متنفس بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے بارے میں غیر مسلموں کا نظریہ خواہ کچھ ہو، لیکن اس بات سے آپ کے کسی دشمن نے بھی انکار نہیں کیا کہ آپ عقل و حکمت تدبیر اور فہم و فراست کے اعتبار سے بلند ترین مقام کے حامل تھے، اب یہ بات ایک معمولی سمجھ کے انسان سے بھی متوقع نہیں کہ وہ پورے یقین و اعتماد کے بغیر ایک ایسا چیلنج یا ایسی پیشینگونی کر گزرے جسے اس کے مخالفین ایک لمحے میں توڑ سکتے ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عاقل و حکیم اور مدبر کی طرف سے یہ چیلنج وحی الہی کی رہنمائی کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا،

قرآن کریم کی حفاظت | قرآن کریم سے پہلے جو آسمانی کتابیں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں ان کی حفاظت کا کوئی وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکیں، مسلمانوں کا تو خیر

عقیدہ ہے ہی کہ آج جن کتابوں کو تورات، زبور یا انجیل کے نام دیئے جاتے ہیں وہ ہرگز بعینہ وہ کتابیں نہیں ہیں جو آسمان سے اُتری تھیں، بلکہ ان میں بہت کچھ تحریف و ترمیم ہو چکی ہے، لیکن خود اہل کتاب بھی اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہیں، اور کوئی کڑے کڑے یہودی یا عیسائی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں میں ہر ہر لفظ الہامی ہے، ان میں کہیں کوئی غلطی یا تبدیلی نہیں ہوئی، اس کے برخلاف قرآن کریم نے اپنے بارے میں یہ پیشگی خبر دیدی تھی کہ:-

لہ اس کے مفصل اور ناقابل انکار دلائل کے لئے ملاحظہ ہو ”بائبل سے قرآن تک“
مصنف مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، درتیبہ احقر،

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا، اور ہم ہی اس کی حفاظت

کرنے والے ہیں۔

چنانچہ یہ وعدہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا، اور چودہ سو سال کے اس طویل عرصے میں قرآن کریم کا کوئی نلفظہ یا کوئی شوشہ تک نہ ضائع ہو سکا، اور نہ اس میں تحریف و ترمیم کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکی، اسلام ہمیشہ مخالفوں اور عداوتوں کے نرغہ میں رہا ہے، اور اس کے دشمنوں نے اسے مغلوب کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن کوئی دشمن قرآن کریم کو اُس دور میں بھی مٹانے، ضائع کرنے یا بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جبکہ قرآن کریم کے نسخے نہایت محدود تھے، اور نشر و اشاعت کے وسائل نایاب، تورات کو دیکھئے کہ کس طرح بابل کا بادشاہ بخت نصر اٹھتا ہے، اور بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق سوا حضرت عروہ بن علیہ السلام کے کسی شخص کو تورات یاد نہیں تھی، اس لئے تمام نسخے ضائع ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے حافظے سے اُسے دوبارہ لکھوایا، پھر روم کا بادشاہ اینتوکس ایسی فانیس (

اٹھتا ہے، اور خود بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تورات کا ایک ایک نسخہ بچاؤ کر جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ کوئی نسخہ باقی نہیں رہتا،

اسی طرح ارجیل کو دیکھئے کہ کس طرح طیبوس رومی، شاہ نیردن، ڈویمشین اور ڈیوٹیکشین کے حملوں میں اس کے اصل نسخے نابود ہو جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا حال یہ ہے کہ اس کا سینکڑوں حملہ آوروں سے سابقہ پڑتا ہے، بہت سے مواقع پر مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہے، اُن کے کتب خانے جلائے جاتے ہیں، قدیم کتابوں کے

لہ دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۵۰۱ ج ۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ: بابل، بحث عبد قدیم، فرسٹ سلسلہ، بحوالہ السیڈریس دوم ۱۲: ۱۹ تا ۲۸، لہ دیکھئے بابل، ناکس ورنن میکملن، لندن ۱۹۶۳ء، مکالموں کی پہلی کتاب ۱: ۵۹،

بڑے بڑے ذخیرے دریا میں بہا دیے جاتے ہیں، قرآن مطہ کا سیلاب عظیم پورے عالم اسلام پر ٹوٹتا ہے اور قرآن کریم کی تحریف کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، لیکن یہ کتاب مبین اللہ کے وعدے کے مطابق کسی ادنیٰ تغیر کے بغیر نہ صرف محفوظ رہتی ہے بلکہ مشرق و مغرب میں اس کی نشر و اشاعت کا رفتار بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، آج بھی اگر بالفرض (نہ انخراستہ) قرآن کریم کے تمام مکتوب نسخے ناپید ہو جائیں تو لاکھوں فرزندانِ توحید کے سینے اس کے سچے امانت دار ہیں، اور اگر کوئی شخص قرآن کریم کا ایک لفظ بھی تبدیل کرنا چاہے تو مسلمانوں کے کم سن بچے بھی آسے پھٹ سکتے ہیں،

پھر قرآن کریم کے صرف الفاظ ہی نہیں، بلکہ معانی کی حفاظت کا جو انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے وہ بجائے خود ایک مستقل تاریخ ہے، مثلاً مردِ ریاکار سے ہر زبان کے الفاظ میں معانی کے اعتبار سے فرق راقع ہوتا رہتا ہے، چنانچہ عبرانی، سریانی، اور گلدانی زبانیں جن میں کچھلی آسانی کتاب میں نازل ہوئی تھیں رفتہ رفتہ دنیا کا ناپید ہو گئیں، یا ان میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو گیا کہ وہ بالکل نئی زبانیں بن گئیں، لیکن قرآن کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے کہ وہ ہزار ہا تغیرات اور انقلابات کے باوجود پوری طرح محفوظ ہیں، اور اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ قرآن کریم کا فلاں لفظ اس دور میں کس معنی میں استعمال ہوتا تھا تو وہ نہایت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے،

عربی زبان کو کس غیر معمولی طریقے پر محفوظ رکھا گیا ہے؟ اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس واقعے سے ہوگا کہ یمن کے شہر زرائب کے اوپر عکا نامی دو پہاڑ تھے، ان پہاڑوں کے رہنے والوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی بستی کے باہر کسی بھی شخص سے نہ شادی بیاہ کا تعلق قائم کریں گے، نہ دوستی کا، اور نہ خود کہیں باہر جائیں گے، یہاں تک کہ باہر کا کوئی آدمی ان کے یہاں تین دن سے زیادہ قیام بھی نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر باہر کے لوگوں سے ہمارا میل بول بڑسا تو بھاری عربی زبان بگڑ جائے گی، یہ لوگ اپنے ان اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہے، اور مؤرخین نے لکھا ہے

کہ یہ وہ واحد گروہ ہے جس کی عربی زبان ٹھیکہ زمانہ جاہلیت کی زبان ہے، اور اس میں پڑھو
فرق نہیں آیا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ اللہ کی یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی،
اور خود اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا، اس کی صداقت روز بروز روشن ہوتی چلی
جاتی ہے، اور یہ پیشگی خبر سو فی صد درست ثابت ہوئی ہے،

یہاں قرآن کریم کی تمام پیشگی خبروں کا استیعاب کرنا نہیں، بلکہ صرف چند مثالیں
پیش کرنا مقصود تھا، اور ان چند مثالوں ہی سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے،
کہ قرآن کریم نے جو پیشگی خبریں دی تھیں وہ ایسے معجزانہ طریقے پر پوری ہوئی ہیں
جس میں کسی انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں،

قرآن کریم کے انکشافات

پیشگی خبروں کے علاوہ قرآن کریم نے بہت سے ایسے علمی اور تاریخی حقائق کی نشاندہی
فرمائی ہے جو اُس زمانے میں نہ صرف، یہ کہ نامعلوم تھے، بلکہ اُس وقت اُن کا تصور بھی
نہیں کیا جاسکتا تھا، قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کو جمع کر کے اگر ان کی مفصل تفسیر
بیان کی جائے تو بلاشبہ ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، یہاں اُن سب آیات کا
استیعاب تو ممکن نہیں، البتہ چند مختصر مثالیں درج ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہونے لگا، تو
اس نے جان بچانے کے لئے زبانی طور پر ایمان لانے کا اقرار کیا، جس کے جواب میں بار تعالیٰ
نے فرمایا:

الْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝

قَالِ يَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً، (یونس: ۹۱، ۹۲)

۱۰ معجم البلدان لیا قوت الحموی، ص ۱۴۳ ج ۴، جزو ۱۴، دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ

مادہ ”عقران“ و تاج العروس، للزبیدی، مادہ ”عقہ“۔

”اب (ایمان لانا ہے) حالانکہ پہلے ناسرمائی کرتا رہا اور فساد مچانے والوں سے
تھا؟ پس آج ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے، تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے
عزت بن جلتے“

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اس وقت اور اس کے بعد بھی صدیوں تک کسی کو معلوم
نہیں تھا کہ فرعون کی لاش اب تک صحیح سلامت موجود ہے، لیکن اب سے کچھ عرصہ پہلے
یہ لاش دریافت ہوئی، اور آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے،
(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُونَ ۝

”اور ہم نے ایک چیز کے دو جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم
نصیحت حاصل کرو،“

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اس وقت عالم تصور یہ تھا کہ نر اور مادہ کے جوڑے
صرف انسانوں یا جانوروں میں ہوتے ہیں، یا پھر چند نباتات میں، لیکن سائنس کی ترقی
کے ساتھ ساتھ یہ فسر آئی حقیقت واضح ہوئی جا رہی ہے کہ نر و مادہ ہر چیز میں موجود
ہیں، یہ اور بات ہو کہ کہیں ان جوڑوں کا نام نر اور مادہ رکھ لیا جائے، کہیں مثبت

(Positive) اور منفی (Negative) اور کہیں الیکٹرک
اور پروٹون اور کہیں نیوٹرون اور پوزیٹرون، بلکہ ایک آیت میں قرآن کریم نے صراحتاً یہ
یہ بھی واضح فرمادیا کہ بہت چیزوں میں جوڑوں کا پایا جانا ابھی لوگوں کو معلوم نہیں،

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَنثَىٰ وَاجْعَلْهَا مِنَّا نُثْقَاتٌ
الْأُنثَىٰ خَيْرٌ مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ۝

”پاک، ہر وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا، نباتات
زمین کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں سے اور ان چیزوں میں
بھی جنہیں یہ لوگ نہیں جانتے“

حَقَانِیَّتِ قُرْآنِ اَوْرِ مَغْرِبِ كِ غَیْمِ مُصَنِّفِیْنِ

ایک زمانہ تھا جب مغربی مصنفین عیسائیت کے شدید تعصب میں مبتلا ہو کر کھلم کھلا یہ کہا کرتے تھے کہ قرآن کریم (معاذ اللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانی بوجہی تصنیف ہے، اور (معاذ اللہ) آپ کا دعوائے نبوت خود ساختہ تھا، لیکن اب خود مغرب کے غیر مسلم مصنفین کا کہنا یہ ہے کہ پچھلے اہل مغرب کا یہ نظریہ محض ایک معاہدہ دعویٰ تھا جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس کی تکذیب کرتی ہے، عہد حاضر کے معروف مستشرق پروفیسر مننگری واٹ لکھتے ہیں:-

”قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں یہ تصورات کیا گیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک (معاذ اللہ) جھوٹے پیغمبر تھے، جو غلط طور پر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، لیکن قرونِ وسطیٰ کے یہ تصورات خود اصل جنگل پر پیگنڈے کی حیثیت رکھتے تھے، اب آہستہ آہستہ یورپ اور عیسائی دنیا کے ذہنوں سے اتر رہے ہیں۔“

پروفیسر واٹ نے بالکل درست کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تکذیب کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں تھی، بلکہ یہ اُس پر پیگنڈے کا ایک جزو تھا، جسے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ضروری سمجھا جا رہا تھا، انھوں نے خاصی تفصیل کے ساتھ اُن قدیم اہل یورپ کی تردید کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ) جھوٹے دعویٰ یا جنون یا کسی بیماری کا الزام عائد کرتے تھے، اور بتایا ہے کہ عہد حاضر کے مغربی اسکالر روشن دلائل کی وجہ سے ان الزامات کو تسلیم نہیں کرتے، آخر میں وہ لکھتے ہیں:-

”لہذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں قرونِ وسطیٰ کے اس تصور کو تو

اب خارج از بحث قرار دینا چاہئے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک ایسا انسان سمجھنا چاہئے جو پورے خلوص اور نیک نیتی سے وہ بیانات سناتے تھے جن کے بارے میں اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ اُنکے پاس خدا کی طرف سے آئے ہیں۔

اس اعتراف کے بعد انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ صاف الفاظ میں سرکارِ دعوٰی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت در رسالت کا اقرار کر لیا جاتا، لیکن صدیوں سے ذہنوں میں ججے ہوئی تصورات آسانی سے نہیں ملتے، چنانچہ منظم سہی واٹ اور ان کی طرح کے عہدِ حاضر کے دوسرے مصنفین ایک طرف تو یہ اعتراف کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوئے نبوت میں مجلس تھے، دوسری طرف اپنے مذہب کو علی الاعلان چھوڑ کر اسلام کو اختیار کر لینا اُن کے لئے مشکل ہے، لہذا انھوں نے ایک بیچ کی راہ تلاش کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت کی ایک عجیبے غریب توجیہ پیش کی ہے،

اُن کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی درحقیقت کوئی خارجی چیز نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) یہ ایک اندر دنی کیفیت تھی جو آپ کے طویل غور و فکر اور مشاہدات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی، اور جسے آپ نے پوری دیانتداری سے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھا، آپ اپنی عمر کے ابتدائی دور ہی سے اپنی قوم کے مذہب اور اُن کے طور طریقوں سے بیزار تھے، اسی لئے آپ اُن کے طرزِ عبادت کی تقلید کرنے کے بجائے تہنائی میں غور و فکر فرماتے تھے، آپ کا دل اپنی قوم کی گمراہیوں پر کڑھتا تھا اور آپ اُن کو اس گمراہی سے نکلانے کے طریقے سوچتے تھے، اسی مقصد کے لئے آپ نے غارِ حراء کی تہنائیوں میں کئی کئی دن گزارنے شروع کیے، وہیں پر طویل غور و فکر کے نتیجے میں عقیدہ توحید پر آپ کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا، اور ساتھ ہی یہ داعیہ بھی کہ اس قوم کو بت پرستی کی گمراہی سے نکال کر توحید کی طرف دعوت دینی چاہئے، غارِ حراء کی اُن تہنائیوں میں جہاں کوئی بات کرنے والا نہیں تھا، یہ تصور آپ کے دل و دماغ پر

اس ذر محیط ہو گیا کہ آپ کو اپنے دل کی یہ آواز ایک خارجی آواز محسوس ہونے لگی، اور اسے آپ نے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھ کر پورے خلوص و درانت سے نبوت کا دعویٰ کر دیا،

یہ ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی وہ توجیہ جسے آجکل ”دانشورانِ مغرب“ میں قبول عام حاصل ہے، مستشرقین میں سے ایک دو نہیں، بلکہ بیسیوں ”محققین“ اس کے قائل ہیں، یہاں تک کہ بعض مسلمان کہلانے والے افراد بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمائیے کہ اس توجیہ کے پیچھے اس کے سوا اور کیا ذہنیت کا فرما ہے کہ ان ”دانشوروں“ نے یہ بات پہلے ہی طے کر لی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق ان کے لئے ممکن نہیں، خواہ اس پر کتنے روشن دلائل قائم ہو جائیں، اور خواہ اس نبوت کی تردید کے لئے کتنی دو راز کار، ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین تاریخیات کو اختیار کرنا پڑے، واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر اور عنصر حاضر کے دوسرے مستشرقین آپ پر نازل ہونے والی وحی کی جو توجیہ کرتے ہیں اس کا کوئی جلی اور عقلی جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، تاہم مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمائیے۔

(۱) کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے باپے میں خود ان کا اعتراف یہ ہے کہ بہترین ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے مالا مال تینیس سال تک مسلسل اپنی ایک اندرونی کیفیت کو کسی فرشتے کی آواز سمجھتے ہیں اور آخر وقت تک یہ پتہ نہ لگا سکیں کہ اس غیر معمولی کیفیت کی حقیقت کیا ہے، وحی کا نزول آپ پر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ تینیس سال تک سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں مرتبہ ہوتا رہا ہے، کیا اس پورے عرصہ میں (معاذ اللہ) آپ اسی مغالطے میں مبتلا رہے؟

(۲) پھر اگر آپ پر یہ نام ہنما ”اندرونی کیفیت“ اپنی قوم کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی، تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کیفیت کے سب سے پہلے تجربے میں انکی گراہیوں

کی تردید اور عقیدہ توحید کا بیان ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں نہ کفر و شرک کی تردید ہو، نہ عقیدہ توحید کا ذکر ہے، اور نہ آپ کی بنیادی تعلیمات میں سے کسی تعلیم کا بیان ہے، اس کے بجائے اُس کے الفاظ یہ ہیں:-

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق : ۳ تا ۱)

پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے تمہیں پیدا کیا، انسان کو دم بستہ سے پیدا کیا، پڑھو! اور تمہارا پروردگار کریم ترین ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا»

۱۰۔ پھر یہ عجیب بات ہو کہ یہ کیفیت "ایک مرتبہ پیش آنے کے بعد فوراً ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اور تین سال تک آپ کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، اس عرصے میں آپ وحی کے انقطاع سے پریشان بھی رہتے ہیں، لیکن تین سال تک مکمل سکوت طاری رہتا ہے، اس کے بعد پھر وحی نازل ہوتی ہے تو اس میں بھی شرک کی واضح تردید نہیں کی جاتی اور نہ اصل عرب کی عملی گمراہیوں کا کوئی ذکر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت آپ پر اپنی قوم کی گمراہیوں پر سوچ بچار اور تصور توحید کے غلبے سے پیدا ہوئی تھی، تو وحی کے بالکل ابتدائی واقعات میں یہ تصورات کہاں گئے تھے؟ اور تین سال تک ان تصورات کے غلبے نے کوئی آواز کیوں نہیں سنائی؟

۱۱۔ اگر یہ کوئی "اندرونی کیفیت" تھی تو پوری طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے تھا، لیکن قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر آپ کے ذاتی خیالات کے خلاف ہدایتیں دی گئیں، بلکہ بعض مقامات پر آپ کی ذاتی رائے کی تردید اور اس پر ایک لطیف عتاب بھی موجود ہے، مثلاً لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ رَأَىٰ بَعْضُ النَّاسِ مَآلَ الْيَوْمِ الَّذِي كُنَّا يُوعَدُونَ (۱۱۸: آل عمران)

کہ اَسْمٰی حَتّٰی یُنْجِنَ فِی الْاَسْرٰضِ (الانفال : ۶۷) اور عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذْنَبْتَ
لَهُمْ حَتّٰی یَتَّبِعَ لَكَ الَّذِیْنَ صَدَّقُوْا وَاَعْلَمَ الْاَلٰمِیْنَ (التوبہ : ۴۷) وغیرہ

(۵) اگر بالفرض مان لیا جائے کہ کسی تصور کا شدید غلبہ انسان کو ایک خارجی
آواز کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہو کہ یہ خارجی آواز جو پیشینگوئی
کرتے وہ ہمیشہ سچ نکلتے، جو حکم دیدے وہ انجام کار درست ثابت ہو، جو الفاظ
بول دے وہ ایسے پتھر کی لکیر بن جائیں کہ دنیا بھر کے ادیب و خطیب اس کے مقابلہ

سے عاجز ہو کر بیٹھ جائیں، یہاں تک کہ اسی کلام کی بنیاد پر پورے جزیرہ عرب میں
ایسا انقلاب عظیم برپا ہو جائے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے،

(۶) اگر تسلیم کر لیا جائے کہ تصورات کے غلبے سے محسوس ہونے والی آواز کوئی
حقیقت رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی شخص کے علم و تصور کا ایک عکس ہو سکتی ہو جسے
وہ سنائی دے رہی ہے، اور جو بات پہلے سے اُس کے علم و تصور میں نہ ہو وہ اس آواز
سے معلوم نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم کی تلاوت کر کے دیکھئے اس میں کتنی بے شمار
باتیں ایسی ہیں جو وحی سے پہلے آپ کو معلوم نہیں تھیں، وحی کے اس کلام نے پہلی بار
آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً آیت ذیل پر غور فرمائیے :-

مَا كُنْتُمْ تَدْرُونَ مَا اَلِكُتٰبُ وَلَا اِلَیْمَانٌ وَلَا حِیْنَ
جَعَلْنٰهُ نُورًا مَّھْدِیْۙۤ اِیَّہِ مَنِ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا شُرَکَآءُۙ

”آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے؟ اور نہ ایمان سے واقف
تھے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو روشنی بنا یا جس کے ذریعے ہم اپنے

بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔“

(۷) بالخصوص پچھلی امتوں کے اکثر واقعات وہ ہیں جن کے بارے میں خود قرآن کریم
نے بھی تصریح کی ہے، اور تاریخی اعتبار سے بھی یہ امر ناقابل انکار ہے کہ آپ نزول وحی
سے قبل اُن سے واقف نہیں تھے، قرآن کریم نے پہلی بار آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً
سورہ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کا

ارشاد ہے :-

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا
أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا (ہود: ۳۹)

”یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف بذریعہ وحی نازل کرتے
ہیں، ان خبروں کو نہ آپ اس سے پہلے جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم“

اور سورۃ یوسف کے آخر میں ارشاد ہے :-

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ
تَدْرِيهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۝

(یوسف: ۱۰۲)

”یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم بذریعہ وحی آپ پر نازل کرتے ہیں اور
جس وقت یہ لوگ اپنے معاملے میں متفق ہو رہے تھے، اور تدبیریں
کر رہے تھے، اُس وقت آپ اُن کے پاس نہیں تھے“

منظلمی واقعات اور اُن کے دوسرے ہم لوگ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی جھوٹ
نہیں بولا اور :-

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دیانت و اخلاق پر کوئی اعتراض
نہیں کیا جاسکتا“

لہذا قرآن کریم کی کسی آیت میں اُن کے نزدیک بھی غلط بیانی ممکن نہیں، اب سوال
یہ ہے کہ اگر یہ ”وحی“ کوئی خارجی ذریعہ علم نہیں تھا تو اس کے ذریعے آپ کو کچھلے
انبیاء علیہم السلام کے وہ واقعات کیسے معلوم ہو گئے جو پہلے معلوم نہیں تھے ؟
(۸) اور پر ہم نے صرف وہ باتیں پیش کی ہیں جو ایک عام آدمی بھی معمولی غور
فکر سے سمجھ سکتا ہے اور جو قرآن کریم کی سرسری تلاوت سے بھی واضح ہو جاتی ہیں،

اور اگر حدیث کی ان روایات کو بھی ملین نظر رکھا جائے جن میں نزولِ وحی کی کیفیات اور اس کے ابتدائی واقعات بیان کئے گئے ہیں تو منگھری واٹ وغیرہ کی یہ خیالی تلو ملیات خود بخود بیاہر ہوا ہوجاتی ہیں، اُن میں سے کچھ روایات پچھے ”تایخِ نزولِ قرآن“ کے تحت بیان ہو چکی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اصل کتاب؛

بعض مغربی مصنفین نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپ پر نازل ہونے والی ”وحی“ درحقیقت آپ ہی کی ایک ”اندرونی کیفیت“ تھی، جو تصورات کے غلبے سے پیدا ہوئی تھی، یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ نزولِ وحی کے آغاز سے پہلے پچھلی اُمتوں کے واقعات سے واقف تھے، اور وہی واقعات اُس ”خاص کیفیت“ کے وقت آپ کی زبان پر آگئے،

اُن کا کہنا یہ ہے کہ آپ نے پچھلی اُمتوں کے یہ واقعات (معاذ اللہ) عرب کے یہود و نصاریٰ سے سُنے تھے، اس سلسلے میں خاص طور پر میجر اور نسطور اراہب کے نام لئے جاتے ہیں، جن سے سفرِ شام کے وقت آپ کی ملاقات کا قصہ سیرت و تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے، بعض مغربی مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ راہب آریوسی فریق سے تعلق رکھتے تھے، جو توحید کا قائل تھا، انہی راہبوں سے آپ نے (معاذ اللہ) توحید کا تصور اخذ کیا، انہی سے پچھلی کتابوں کا علم حاصل کیا، اور انہی سے پچھلی اُمتوں کے واقعات سیکھے،

لیکن اگر انصاف و دیانت دنیا سے بالکل اٹھ ہی نہیں گئی تو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ سفرِ شام کے دوران اس مختصر سی ملاقات

میں ان راہبوں نے اپنے سینے کی تمام معلومات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
اندھیل دی ہوں گی، اور آپ نے ان سب کو راتوں رات جذب کر کے ایک انقلاب آفرین
دین کی بنیاد ڈال دی ہوگی، ازل تو یہ دعویٰ ہی ہمارے سے بلا دلیل بلکہ بے بنیاد ہے کہ
بحیرا اور نسطور آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی
اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی، اور مل بھی کیسے سکتی ہے جبکہ آریوسی فرقے کو تو چوتھی صدی
عیسوی ہی میں بدعتی اور ملحد (Heretic) قرار دے دیا گیا تھا، اور اس کے
آریوسی کا نام لینا بھی قابلِ تعزیر جرم قرار پا گیا تھا، اتھاناسیوس (Athanasius)
اور اس کے ہم نواؤں نے اُس فرقے کا بیج مارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اس سبب
فرقے میں اتنی سخت کہاں تھی کہ وہ ساتویں صدی عیسوی تک سانس لے سکتا؟ اور اگر
کوئی بچا کچھ فرد باقی ہوتا بھی تو اس کو یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ بصری جیسے شہر
میں ایک خانقاہ کا سربراہ بن بیٹھتا؟

دوسرے جن روایتوں میں یہ مذکور ہے کہ سفر شام کے دوران آپ کی ملاقات
ان راہبوں سے ہوئی تھی، انہی روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ انتہائی مختصر
سرسری اور ضمنی ملاقات تھی، جس میں کسی تعلیم و تعلم کی گنجائش ممکن ہی نہیں، حیرت
ہے ان لوگوں کی عقلوں پر جو ایسی مضحکہ خیز باتوں پر ایمان لاسکتے ہیں، لیکن آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل ہے،
یہاں ہم پھر اراہب سے آپ کی ملاقات کی مفصل ترین روایت نقل کرتے ہیں
جس سے حقیقت حال واضح ہو سکے گی!

جامع ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ
ابوطالب قریش کے کچھ مشائخ کے ساتھ شام کے لئے روانہ ہوئے، شام میں جس جگہ
جا کر اترے وہاں ایک راہب ہوتا تھا، اس سے پہلے بھی اس راہب کے پاس سے گزر رہا ہوتا تھا
لیکن وہ کبھی ملتفت نہیں ہوتا تھا، اس مرتبہ جب یہ تجارتی قافلہ وہاں جا کر اترتا تو
راہب خلاف معمول اپنی خانقاہ سے نکل کر آیا، اور تجسساً نہ نظروں سے ایک ایک

دیکھتے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا:
 هَذَا سَيِّدُ الْعَالَمِينَ، هَذَا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ،
 يَبْعَثُهُ اللَّهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ،

”یہی ہے تمام جہانوں کا سردار، یہی ہے پروردگار عالم کا رسول“،

جس کو اللہ تمام کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گا۔

سرداران قریش نے اس راہب سے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ راہب نے کہا جس وقت
 آپ سب گھاٹی سے نکلے تو کوئی شجر و حجر ایسا نہیں تھا جس نے اس کو سجدہ نہ کیا ہو،
 اور شجر و حجر نبی ہی کے لئے سجدہ کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ میں آپ کو مہر نبوت سے بھی
 پہچانتا ہوں جو سب کے مشابہ آپ کے شانے کے نیچے واقع ہے،

راہب یہ کہہ کر واپس ہو گیا، اور پورے قافلے کے لئے کھانا تیار کر لیا، جب کھانے
 کے لئے سب حاضر ہوئے تو آپ موجود نہ تھے، راہب نے دریافت کیا کہ آپ کہاں ہیں؟
 معلوم ہوا کہ اونٹ چرانے گئے ہوتے ہیں، آدمی صحیح کر آپ کو بلایا، جس وقت آپ تشریف
 لائے تو ایک ابر آپ پر سایہ کئے ہوئے تھا، جب آپ اپنی قوم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ
 لوگ آپ سے پہلے درخت کے سائے میں جگہ لے چکے ہیں، اب کوئی جگہ سایہ کی باقی نہیں
 رہی، آپ ایک جانب کو بیٹھ گئے، بیٹھے ہی درخت کا سایہ آپ تک جھک گیا، راہب نے
 کہا کہ درخت کے سائے کو دیکھو، وہ کس طرح آپ کی طرف جھکا ہوا ہے، اور پھر کھڑے
 ہو کر قریش کے لوگوں سے کہا کہ آپ ان کو روم کی طرف نہ لے جائیں، رومی اگر ان کو
 دیکھ لیں گے تو آپ کی صفات اور علامات سے آپ کو پہچان کر قتل کر ڈالیں گے، اثناب کلام
 میں راہب کی نگاہ اٹھی تو دیکھا کہ روم کے سات آدمی کسی تلاش میں اسی طرف آرہے ہیں
 راہب نے پوچھا، تم کس لئے نکلے ہو؟ رومیوں نے کہا کہ ہم اُس نبی کی تلاش میں نکلے ہیں
 (جس کی توریت و انجیل میں بشارت مذکور ہے) جو اس مہینے میں سفر کے لئے نکلنے والا ہے
 ہم نے اپنے آدمی ہر طرف بھیجے ہیں..... راہب نے کہا اچھا یہ تو بتلاؤ کہ جس شے کا اللہ
 نے ارادہ فرمایا ہو، کیا اس کو کوئی تلا سکتا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں، اس کے بعد

ردمیوں نے بحیرا راہب سے عہد کیا کہ وہ اب اس نبی کے درپے نہیں ہوں گے، اور دین راہب کے پاس ٹھہر گئے، راہب نے پھر قریش سے قسم دے کر پوچھا کہ تم میں سے اُن کا ولی کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابوطالب ہیں، اس کے بعد راہب مسلسل ابوطالب کو قسین دیتا رہا، کہ تم ان کو ضرور واپس بھیج دو، یہاں تک کہ ابوطالب نے آپ کو واپس بھیج دیا، بعض علماء کو اس روایت کی صحت میں بھی کلام ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہو تب بھی اس میں خوردبین لگا کر بھی اس بات کی کوئی گنجائش نہیں نظر آتی کہ آپ نے بحیرا راہب سے کچھ واقعات سکھے ہوں گے، یہ ایک انتہائی مختصر ملاقات تھی، جو چند گھنٹوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھی، اور یہ ملاقات بھی اُس وقت ہوئی جبکہ آپ کی عمر کل بارہ تیرہ سال تھی، کیا یہ بات کوئی صحیح لعقل انسان باور کر سکتا ہے کہ اس کم سنی میں چند گھنٹوں کی اس مختصر ملاقات نے پچھلی امتوں کا ایسا گہرا علم آپ کو عطا کر دیا ہو کہ آپ اہل کتاب کو چیلنج کر کر کے اُن کی کتابوں میں تحریف کی وضاحت فرمائیں، اور اُن کی غلطیاں واضح کریں؟

اور نستور راہب سے ملاقات کا قصہ تو بحیرا کے قصہ سے بھی زیادہ مختصر ہے،

۱۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب باب ماجاء فی بدو نبوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۲۲۵ ج ۲، طبع قرآن محل کراچی، ۲۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے اسے ناقابل اعتماد قرار دیتے ہوئے لکھا: اظہر موضوعاً فبعضہ باطل (تلخیص المستدرک، کتاب التاریخ، دلائل النبوة، ص ۶۱۵ ج ۲ مطبوعہ مکتبۃ المدینہ)۔ لیکن حافظ ابن حجر وغیرہ نے اسے درست قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: "رجالہ ثقات" (بجوالہ زرقانی شرح المواہب ص ۱۹۶ ج ۱ طبع ازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ)۔ ۳۔ اس سفر کے بارے میں تین روایتیں ملتی ہیں، ایک میں آپ کی عمر کل نو سال بیان کی گئی ہے، اور علامہ حلبی نے اسی کو ترجیح دی ہے، (السیرۃ الحلبیۃ ص ۱۱۳ ج ۱ مصطفیٰ البانی ۱۳۱۵ھ) اور حافظ ابن عبد البر نے تیرہ سال کی روایت کو اختیار کیا ہے، لیکن علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اس وقت آپ کی عمر کل بارہ سال تھی (زرقانی ۲: شرح المواہب ص ۱۹۳ ج ۱)۔

اور اگر کوئی شخص اس کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے معلومات حاصل کی تھیں تو سوائے تعصب اور اسلام دشمنی کے اس کی کوئی توجیہ ممکن ہی نہیں،

پھر سوچنے کی بات ہو کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اہل کتاب سے یہ واقعات سن رکھے تھے، تو وہ کفار مکہ جو آپ کی تردید کے لئے ہر رانی کا ہار بنانے کے لئے تیار تھے، اس موقع پر کیوں خاموش رہے؟ انھوں نے یہ دعویٰ کیوں نہیں کیا کہ آپ کو یہ باتیں فلاں فلاں اہل کتاب نے سکھائی ہیں، انتہا یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی مکہ مکرمہ کے ایک لوہار کے پاس کھڑے ہو جایا کرتے تھے، محض اتنی سی بات سے کفار مکہ نے یہ شہرت دیدی کہ یہ لوہار آپ کا معلم ہے، جس کی تردید قرآن کریم نے اس طرح فرمائی کہ:-

وَلَقَدْ نَعَلْنَا أَنفُسَهُمْ يَاقُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ
لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجِبُونِ وَهَذَا لِسَانٌ
عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ۝ (النحل: ۱۰۳)

لیکن ان میں سے کسی نے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے یہ علم حیرانہ، نستورایا ورقہ بن نوفل سے حاصل کیا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ یہ ایسا بے نکاحا اعتراض تھا جسے آپ کے کٹر مخالف ہم عمروں نے بھی زبان سے نکالنا پسند نہیں کیا،

قرآن کریم پر چند اعتراضات

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کے بیان کے ہوئے بعض واقعات پر اعتراضات کئے ہیں، اور ان سے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعات اہل کتاب کے کسی عالم سے زبانی سنے تھے جنہیں بیان کرنے میں مغالطہ ہو گیا، مثلاً:-

حضرت مرثعہ کے والد کا نام | مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ایک اعتراض یہ کیا گیا

ہے کہ: مریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام بھی تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا بھی، اور اول اللہ کریم کی بیٹی تھیں، قرآن میں (معاذ اللہ) مغالطے کی بنا پر مؤخر الذکر کو بھی ”بنت عمران“ قرار دیا،

مقام افسوس ہے کہ یہ بے سرو پا اعتراض برطانیہ کا جلسی عالمی شہرت کی کتاب میں درج کرتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی گئی، اگر ”برطانیہ کا“ کا مقالہ نگار کسی یقینی دلیل سے یہ بھی ثابت کر دیتا کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام ”عمران“ نہیں تھا، تب تو یہ اعتراض کسی درجے میں قابل لحاظ ہو سکتا تھا، لیکن حالت یہ ہے کہ اگر خود اپنی سے پلٹ کر یہ پوچھ لیا جائے کہ پھر حضرت مریمؑ کے والد کا نام ”عمران“ کے سوا اور کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوگا، انتہا یہ ہے کہ بائبل میں بھی اُن کے والد کا کوئی نام مذکور نہیں، اور خود برطانیہ کے مقالہ ”مریم“ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ:-

”حضرت مریمؑ کے والدین کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کی کسی

تاریخی دستاویز میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے“

ایک طرف یہ لاعلمی اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام (معاذ اللہ) مغالطے پر مبنی ہے، کیا ”برطانیہ کا“ کے مقالہ نگار یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ کسی شخص کا نام ”عمران“ رکھا جا چکا ہو، تو اب دنیا میں کوئی شخص اس کا ہم نام پیدا نہیں ہو سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو قرآن کریم کی حقانیت کی واضح دلیل ہے کہ وہ اُن تاریخی حقائق کی علی الاعلان نقاب کشائی کر رہا ہے جو سات سو سال سے نامعلوم تھے، اور اس خود اعتمادی اور دھڑلے کے ساتھ کر رہا ہے کہ چودہ سو سال سے اس کے بدترین دشمن بھی اسے غلط قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے،

۱۔ انسائیکلو پیڈیا برطانیہ کا، ص ۸۳۳ ج ۱۳ مطبوعہ ۱۹۵۷ء مقالہ ”قرآن“

۲۔ برطانیہ کا، ص ۹۹۹ ج ۱۲ مقالہ ”مریم“

پھر یہ بات صرف حضرت مریمؑ کے والد کے نام ہی تک محدود نہیں، بلکہ حضرت مریمؑ کی پیدائش، اُن کی تربیت، اُن کے بچپن اور اُن کی ابتدائی زندگی کے تمام حالات کے بارے میں تمام "مستند" عیسائی مآخذ بالکل خاموش تھے، یہاں تک کہ چاروں معتبر اناجیل میں بھی ان حالات کا تذکرہ موجود نہیں ہی، یہ قرآن کریم ہی تھا جو پہلی بار ان واقعات کو منظر عام پر لایا، شروع شروع میں عیسائی دنیا ان "انکشافات" پر بھی اعتراضات کرتی رہی، مگر اب خود عیسائیت کی ایسی قدیم کتابیں دریافت ہو رہی ہیں، جن میں تصریحاً قرآن کریم کے بیان کردہ ہی واقعات بیان کئے گئے ہیں، حیرت ہے کہ قرآن کریم کے ان واضح معجزات کو دیکھ کر بھی ان "دانثوروں" کو قرآن کریم پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام کسی عیسائی مآخذ میں نہیں ملتا؟

فرعون کا وزیر ہامان | برطانیہ کا "مقالہ" قرآن" ہی میں ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ایک وزیر کا نام ہامان ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام بائبل کے عہد نامہ قدیم میں نہیں ملتا، مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان شاہ اسویرس کا وزیر تھا، جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ یہ واقعات زبانی سیکھے تھے، اس لئے آپؐ نے (معاذ اللہ) مغالطے سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انتہائی بے سرو پا بات ہے، اور اسی طفلانہ مفروضہ پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک نام کے دو انسان نہیں پائے جاسکتے، پھر واقعہ یہ ہے کہ اسویرس کے جس نام ہناد وزیر کا ذکر "برطانیہ کا" کے مقالہ نگار نے کیا ہے اس کا

۱۵ ملاحظہ ہو ڈکشنری آف دی بائبل از ہیٹنگز، ص ۲۸۸ ج ۳،

۱۶ برطانیہ کا، ص ۲۸۳ ج ۱۳ مقالہ "قرآن"۔

قصہ صرف بائبل کی ایک مشتبہ کتاب (Apocryphal book) آستر میں مذکور ہے، اس کتاب کو پرڈٹسٹنٹ فرقہ معتبر نہیں مانتا، چنانچہ مردوہ پرڈٹسٹنٹ انجیلوں میں یہ کتاب موجود نہیں ہے، البتہ کیتھولک فرقہ اسے مستند مانتا ہے، اس مشکوک کتاب میں جس ہامان یا آمان کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ شاہ اسویرس کا وزیر نہیں بلکہ صدر دربار تھا، اور اس کا جو قصہ اس کتاب میں مذکور ہے اسے ہامان کے فترآنی واقعے سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ فرعون نے ہامان کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کے لئے ایک اونچا محل تعمیر کرائے، تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسیٰ کے خدا کو جھانک سکے، نیز قرآن کریم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہامان آخر وقت تک فرعون کا منہ چڑھا وزیر رہا، اور بالآخر اسی کے ساتھ غرق ہوا، اس کے برعکس کتاب آستر میں ہامان (یا آمان) کی طرف اس نوعیت کا کوئی قصہ منسوب نہیں کیا گیا، کتاب آستر کا ہامان بخت نصر کے واقعے کے بعد کا ہے، اور اس کا قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک اتفاقی واقعہ کی بنا پر صرف مختصر عرصہ کے لئے بادشاہ اسویرس کا لقب حاصل کرتا ہے، لیکن اسی دوران وہ یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کروادیتا، جسے بادشاہ کی یہودی ملکہ آستر اس کی دشمن ہو جاتی ہے، اور انجام کار بادشاہ اُسے سولی پر لٹکا کر اس کی جگہ ایک یہودی مرد کے کو نامزد کر دیتا ہے،

جس شخص نے آستر کی کتاب کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ آستر کے اس قصے کو ہامان کے فترآنی واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہیں، اگر واقعہ ہامان کے تذکرے میں آستر والے ہامان سے اشتیاب لگا ہوتا تو دونوں قصوں میں کہیں تو کوئی اتفاق ہونا چاہئے تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں مطابقت کی کوئی ادنیٰ

یہ کتاب آستر کے بعض نسخوں میں اس کا نام ہامان اور بعض میں آمان یا ایمان (Aman) مذکور ہے۔
۵۲ دیکھئے آستر ۱۳، ۱، ۵۳ ملاحظہ ہو آستر ۳: ۸ اور ۶: ۷ اور ۱۰: ۸ اور ۲: ۸ (ناکس ٹرن

بھلک بھی نہیں پائی جاتی، ہامان کا جو واقعہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ آستر یا
بائبل کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے، اور آستر میں جو قصہ منقول ہے وہ نہ صرف
قرآن کریم میں بلکہ لاکھوں احادیث کے ذخیرے میں بھی کہیں نہیں ملتا، جس سے یہ اندازہ
ہو سکے کہ وہ کبھی آپ کے علم میں آیا تھا،

پھر عجیب بات یہ ہو کہ دو ہمنام شخصوں کو دیکھ کر اشتباہ لگنے کا یہ فلسفہ عہدِ حاضر
کے عیسائی اور یہودی مستشرقین کو ہمیشہ صرف قرآن اور اسلام ہی کے معاملات میں
یاد آتا ہے، بائبل میں جو سینکڑوں ہم نام انسانوں کا ذکر ہے ان کے بارے میں انھیں
کبھی اس قسم کے خیالات نہیں سستاتے؟

—————

۲۹۲

مضامین قرآن

قرآن کریم کے مضامین پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تمام مضامین چار بڑے عنوانات پر منقسم ہیں، اور قرآن کریم کی ہر آیت ان میں سے کسی ایک عنوان کے تحت ضرور آتی ہے۔

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) قصص (۴) امثال،

عقائد (ایجابی پہلو)

قرآن کریم میں بنیادی طور پر تین عقائد کو ثابت کیا گیا ہے، توحید، رسالت اور آخرت،

توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کائنات کے ذرے ذرے کو صرف ایک ذات کی

لے یہ مضمون احقر نے اس کتاب کی تالیف سے گیارہ سال پہلے ۱۳۳۳ھ میں لکھا تھا، اور اس وقت ماہنامہ "بینات" وغیرہ میں شائع بھی ہوا تھا، اب اسے معمولی حذف و اضافہ کے بعد اس کتاب کا جز بنارہا ہوں، م، ا، ع

مخلوق سمجھے، اسی کو بڑھے، اسی کو چلے، اسی سے ڈرے، اسی سے ملانگے، اور دل میں یہ یقین رکھے کہ اس سیکراں کائنات کا ہر ذرہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اور کوئی دوسرا اس کی توفیق کے بغیر اسے ادھر سے ادھر بلا بھی نہیں سکتا،

رسالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے تمام پیش رو پیغمبروں کو خدا کا سچا رسول سمجھے، جس بات کو وہ حق کہیں اسے حق سمجھے، اور جو بات اُن کے نزدیک باطل ہو اسے باطل ٹھہرائے،

آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی پر ایمان رکھے، جو ابدی ہوگی، اور اس میں ہر شخص کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اپنی دنیوی زندگی میں کئے ہیں، اگر اس نے اچھے کام کئے ہوں گے تو وہ جنت کی سرمدی نعمتوں کا حق دار ہوگا، اور اگر اس نے بُرے کام کر کے اپنی دنیوی عمر کو ضائع کیا ہے تو وہ دوزخ کے دائمی عذاب کا مستحق ہوگا،

ان تین بنیادی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم نے انواع و اقسام کے دلائل ذکر فرمائے ہیں، عقلی طور پر دلائل کی چار قسمیں ہیں، کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے یا تو انسان کسی ایسی اتھاریٹی کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے مخالف کے نزدیک بھی واجب التسلیم ہو، یہ دلیل نقلی ہوتی ہے، یا پھر وہ منطقی انداز سے اپنے دعوے پر دلیل لاتا ہے، یہ منطقی دلیل ہے، یا وہ اپنے مخالف کو ایسی چیزیں دکھاتا ہے جس سے ہر انسان اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے جہاں مدعی پہنچا ہے، یہ مشاہداتی دلیل ہوتی ہے، یا پھر وہ اپنے نقطہ نظر کو درست ٹھہرانے کے لئے دنیا کے سابقہ واقعات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو ماضی میں میرے نظریے کے مطابق عمل کیا گیا تھا تو دنیا نے فلاح پائی تھی، اور ظالم قوم نے اس نظریے کے خلاف عمل کیا تھا تو وہ تباہ ہو گئی تھی، ایسی دلیل کو تحسیر باقی یا استقرانی دلیل کہا جاتا ہے،

قرآن کریم میں ان میں سے ہر ایک قسم کی دلیل موجود ہے، اُن کی مثالیں

ملاحظہ فرمائیے :-

نقلی دلائل | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَلَا تَهَ كَيْفِي زُبْرٍ إِلَّا قَلِيلًا (شعر)

اور بلاشبہ اس کی خبر کھیلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہو!

اس آیت میں باری تعالیٰ نے کافروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہو، حالانکہ جو کتابیں تمہارے نزدیک محبت ہیں یعنی توراہ و انجیل، خود ان میں (تحریت ہو جانے کے باوجود) آج تک آپ کی رسالت کا ذکر موجود ہے،

یہ اُن پیشینگوئیوں اور خوش خبریوں کی طرف اشارہ ہے جو سابقہ آسمانی کتابوں میں آپ سے متعلق دی گئی تھیں، مثلاً توراہ کے سفر استثناء میں ہے:-

”خداوند سینا سے آیا اور شعیب سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتش شریعت

اُن کے لئے تھی“ (استثناء، ب ۳۳، درس ۲)

ظاہر ہے کہ فاران اور شعیب کے پہاڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ (حضرت رسیٰ کے بعد آنے والے پیغمبروں میں سے) کوئی اور پیغمبر جلوہ گر نہیں ہوا، اور دس ہزار قدسیوں سے صحابہ کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی اسی طرح انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:-

جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لئے کہ وہ اپنی نظر سے نہی گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا؛ (یوحنا ۱۵: ۱۴)

یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے، اور فاران مکہ معظمہ کا مشہور پہاڑ ہے، جس کے ایک حصہ پر فارحرا ہے، اور اب وہ جبل النور کے نام سے معروف ہے،

۱۵۰۰ء کے ایڈیشن میں بائبل کے ”ارباب حل و عقد“ نے ”دس ہزار“ کے لفظ کو ”لاکھوں“ سے تبدیل کر دیا ہے،

منطقی دلائل | منطقی دلائل کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اور تقریباً ہر قسم قرآن کریم میں موجود ہے، منطقی دلائل کی سیکنے پہلی اور سب سے کثیر الاستعمال

قسم وہ ہے جسے اصطلاح میں ”قیاس اقرانی“ کہا جاتا ہے، اس قیاس میں عام طور پر ایک کلیہ بیان کیا جاتا ہے، اور اپنے دعوے کو اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، سورہ ظہ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ کا جادو گروہ سے مقابلہ ہوا اور ان کی رستیاں اور لٹھیاں سانپ بن کر چلنے لگیں تو حضرت موسیٰ کو کچھ خون محسوس ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، آپ ہی سر بلند رہیں گے، یہ لوگ فلاح نہیں پاسکتے، اس لئے کہ:-

إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدًا سَاجِدًا وَلَا يُفْلِحُ السَّاجِدُ حَيْثُ

آتَىٰ (رطہ: ۶۹)

”جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ایک جادوگر کی ترکیب ہے، اور جادوگر خواہ کہیں چلا جائے اسے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی“

یہ قیاس اقرانی کی وہ مثال ہے، جس میں صغریٰ اور کبریٰ دونوں موجود ہیں، اور ایسی مثالیں تو بے شمار ہیں جن میں کوئی مقدمہ محذوف ہے، مثلاً، کفار کہا کرتے تھے کہ جب انسان کی ہڈیاں خاک بن کر ختم ہو جائیں گی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بروز حشر انھیں از سر نو زندہ کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عین ممکن ہے، کیونکہ:-

بَلَىٰ قَادِرِينَ أَن تُنْفِثُوا سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (قیامہ: ۴۱)

”کیوں نہیں، ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انسان کی انگلیوں کے

پوروں کو برابر کر دیں“

یہ صغریٰ ہے اور کبریٰ محذوف ہے، کہ جو ذات پوروں کو برابر کرنے پر قدرت رکھتی ہو وہ یقیناً ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگی، کیونکہ پوروں کا برابر کرنا ہڈیوں کو زندہ کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے) کیونکہ انگلیوں کے پوروں پر جو خطوط قدرت نے رکھے ہیں وہ اللہ جل شانہ کی قدرت کا مللہ اور حکمت بالغہ کا ایک عجیب غریب نمونہ ہے کہ کروڑوں

بلکہ اربوں اور پدموں انسان جو اس دنیا میں آئے ان میں سے کسی کے یہ خطوط دوسرے سے نہیں ملتے، اس آدھ ارج کی جگہ میں قدرت نے کیا معجزہ رکھا ہے کہ ہر انسان کے خطوط دوسرے سے الگ ہیں، کبھی ایک کے نشانات دوسرے سے نہیں ملتے، اسی لئے قدیم زمانے سے نشان انگشت کو دستخط کے قائم مقام اس کی خصوصیت کا مظہر مانا گیا ہے، اور آج بھی تمام حکومتوں، عدالتوں میں نشان انگشت کو دستخط کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے، اس کے امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے باقاعدہ محکمہ قائم ہے، اس لئے جو ہستی پوروں جیسی نازک اور دقیق چیزوں کے اعادہ پر قادر ہے وہ ہڈیوں کو زندہ کرنے پر بھی یقیناً قادر ہے، لہذا یوم آخرت کو جھٹلانے کے لئے دلیل بات ہے،

قیاس استثنائی منطقی دلائل میں سے دوسری اہم قسم "قیاس استثنائی" ہے، یہ دلیل عام طور پر کسی چیز کی نفی کرنے کے لئے لائی جاتی ہے اور اس کے ردِ جزئی ہوتے ہیں، پہلے جز، یعنی صغریٰ میں جس چیز کی نفی کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کسی دوسری چیز پر موقوف کر دیا جاتا ہے، اور دوسرے جز یعنی کبریٰ میں اُس چیز کی نفی کر دی جاتی ہے، جس پر پہلی چیز کو موقوف کیا گیا تھا، مثلاً مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ اس وقت دن نہیں ہے، تو میں کہوں گا کہ "اگر دن موجود ہوتا تو سورج موجود ہوتا لیکن سورج موجود نہیں ہے، لہذا معلوم ہوا کہ دن بھی نہیں ہے"۔ اس قسم کی دلیلیں بھی قرآن کریم میں بہت ہیں، مثلاً شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کرتے کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَعَسَّ تَأْتِيكُمُ الْغَيْبَاتُ مِنَ اللَّهِ لَمْ تُؤْمَرُوا بِهَا لَوْلَا إِذْ سَأَلْتَهُمْ لَظَنُّوا إِنَّ اللَّهَ مُخَالِفٌ لِذَمِّهِمْ لَوْلَا إِذْ سَأَلْتَهُمْ لَظَنُّوا إِنَّ اللَّهَ مُخَالِفٌ لِذَمِّهِمْ لَوْلَا إِذْ سَأَلْتَهُمْ لَظَنُّوا إِنَّ اللَّهَ مُخَالِفٌ لِذَمِّهِمْ

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ

دونوں چیزیں فاسد ہو جاتیں۔

یہ صغریٰ ہے اور کبریٰ محذوف ہو، کہ "لیکن زمین و آسمان فاسد نہیں ہوئے" لہذا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہے،

لہ اس لئے کہ ایک خدا ایک کام کو چاہتا اور دوسرا نہ چاہتا، لڑائی ہوتی اور فساد پھیل جاتا،

التقیر والتقسیم | منطقی دلائل میں سے ایک اہم دلیل ”التقیر والتقسیم“ بھی ہے، جس کے ذریعے مخالف کے دعوے کو رد کیا جاسکتا ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخالف سے یہ کہا جائے کہ تمہارے دعوے کے ثابت ہونے کے لئے اتنے احتمالات میں سے کوئی ایک احتمال پایا جانا ضروری ہے، اور کیونکہ یہاں اُن میں سے ایک بھی نہیں پایا جاتا رہا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ تمہارا دعویٰ غلط ہے، مثلاً آپ کے مخالف کا دعویٰ ہے کہ زید پاکستان کی اسمبلی کا ممبر ہے، آپ اس سے جواب میں کہیں کہ پاکستان اسمبلی کا ممبر کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ یا تو وہ نیشنل اسمبلی کا یا معزب پاکستان اسمبلی کا یا مشرقی پاکستان اسمبلی کا، اور چونکہ وہ ان میں سے کسی کا بھی ممبر نہیں ہے لہذا اسے پاکستان اسمبلی کا ممبر نہیں کہا جاسکتا، یہی ”التقیر والتقسیم“۔

قرآن کریم میں اس کی بڑی واضح مثال موجود ہے، کفار حلال جانوروں میں سے بعض اوقات نرجانورد کو اپنے اوپر حرام کر لیا کرتے تھے، اور بعض مرتبہ مادوں کو، اللہ تعالیٰ نے اُن کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے اس حرام قرار دینے کی علت کیا ہے؟ عقلاً صرف چار صورتیں ممکن ہیں جن کے سوا کوئی پانچویں بات نہیں ہو سکتی، یا تو انھیں اُن کے مذکر ہونے کی بنا پر قرار دیتے ہو، یا مؤنث ہونے کی بنا پر، یا اس لئے کہ وہ رحم جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اس میں کوئی ایسی بات ہے جو سبب حرمت بن سکتی ہے، یا پھر عقل کی رُو سے کوئی سبب حرمت سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ تم اسے اس لئے حرام سمجھتے ہو کہ خدا نے اسے حرام قرار دیدیا ہے، اور یہ چاروں باتیں ناممکن ہیں، نہ ہونے کو سبب حرمت اس لئے نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ تم صرف نرجانورد کو حرام قرار نہیں دیتے، بلکہ بعض اوقات مادہ جانور بھی حرام کر لیتے ہو، دوسری بات یعنی مادہ ہونے کو بھی اسی لئے سبب حرمت نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ تم نر اور مادہ دونوں قسم کے جانوروں کو حرام کرتے ہو، تیسری صورت یعنی اس رحم کا سبب حرمت ہونا اس لئے ممکن نہیں کہ پھر تو بیک وقت نر اور مادہ دونوں حرام ہونے چاہئیں، حالانکہ تم ایک وقت میں یا نر کو حرام سمجھتے ہو یا مادہ کو، بیک وقت دونوں کو حرام نہیں کرتے

چوتھی صورت یعنی محض اللہ کی اطاعت کی بناء پر حرام سمجھنا بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نازل نہیں فرمایا،

وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آلَّذِ كَرَيْنِ حَرَمٌ آمَرَ
الْمُشْرِكِينَ أَمْ مَا اسْتَمَلْتُمْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأَثْنَيْنِ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ
إِذَا وَصَاكُمُ اللَّهُ بِهَذَا، (انعام)

”اور اللہ نے بیدکے، اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو آپ کے پرچھے کہ دونوں
نحر حرام کئے ہیں یا دونوں ماہہ؟ یا ہر وہ بچہ جس پر دونوں مادہ کے رحم مشتمل ہیں یا تم
اُس وقت حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا تھا؟

یہاں باری تعالیٰ نے بڑے دلنشین انداز میں ”سب تو تقسیم“ کے ذریعے اُن کے مزاحمت کارڈ فرمایا۔
منطقی استدلال کا جو تھا اہم طریقہ ”تسلیم“ ہوتا ہے، یعنی مخالفت کی کسی بات یا
تسلیم اذعان کو تسلیم کر کے یہ کہنا کہ اس تسلیم کرنے کے بعد بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا،
کفار کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کسی انسان کی بجائے کسی فرشتے کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں
بھیجا گیا؟ اس کا جواب باری تعالیٰ نے کئی طریقوں سے دیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:-
وَتَوَجَّعَلْنَا لَهُ مَلَكَتًا جَعَلْنَاهُ رَجُلًا، (انعام)
”اور اگر ہم انھیں فرشتہ بناتے تو بھی اُسے مرد ہی کی شکل میں
مبعوث کرتے“

یعنی اول تو کسی پیغمبر کے لئے فرشتہ ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ انسان کو اس
مقصد کے لئے بھیجا جائے، لیکن اگر بغرض محال تمہاری بات تسلیم کر کے فرشتہ بھیج بھی
دیا جائے تو بھی تمہارا مقصود اس سے حاصل نہ ہوتا، اس لئے کہ ہم فرشتے کو اس کی اصلی
شکل و صورت میں تو بھیج نہیں سکتے، کیونکہ تم میں اس کی اصلی شکل دیکھنے کی تاب ہی نہیں
ہے، لامحالہ اُسے مرد کی صورت میں بھیجا جاتا، اس وقت پھر تم اس پر ایمان نہ لاتے،

انتقال | منطقی انداز کے مناظرہ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعی نے ایک
دلیل پیش کی، مخالفت نے کچ فہمی کی بناء پر اس پر کوئی اعتراض کر دیا،

مدعی ایسے موقع پر اس کا جواب دینے کے بجائے دوسری دلیل پیش کر دیتا ہے، جس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ میری پہلی دلیل غلط تھی، بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اعتراض حماقت پر مبنی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تم وہ دلیل سمجھ نہیں سکتے، میں دوسری دلیل دیتا ہوں اسے "انتقال" کہا جاتا ہے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ میں اس کی واضح مثال ہے، آپ کا جب مزود سے مناظرہ ہوا، آپ نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر ایک دلیل پیش کی کہ:-

رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ،

میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے؟

اس پر مزود نے ایک بے گناہ کو پتھر مار کر قتل کروا دیا، اور ایک ایسے شخص کو آزاد کر دیا جسے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا، اور کہا کہ:-

آتَا أَحْيِي وَ أُمِيتُ

میں بھی زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ احمق زندہ کرنے اور مارنے کا مطلب ہی نہیں سمجھتا اس لئے فوراً ایک اور لاجواب کر دینے والی دلیل پیش کی کہ:-

فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ

الْمَغْرِبِ ،

"اللہ تعالیٰ تو سورج مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر لا"۔

یہ "انتقال" تھا، جس پر مزود کی ساری چرب زبانی ختم ہو گئی،

فَبَيَّتَ اللَّيْلَ مَنِى كَعْبَرًا ، (بقرہ ۵)

"چنانچہ اللہ کا انکار کرنے والا مہربوت رہ گیا"

مشاہداتی دلائل | دلائل کی تیسری قسم وہ ہے جو "مشاہدہ" سے تعلق رکھتی ہے، قرآن کریم نے اس قسم کے دلائل زیادہ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ منطقی

اور فلسفیانہ موثکافیان انسان کو خاموش تو کر دیتی ہیں، مگر بسا اوقات اس سے بات

دل میں نہیں اُترتی، اور اُن سے شہادت کے مریض کا علاج نہیں ہو سکتا، اور قرآن حکیم کا مقصد کسی کو خاموش کرنا نہیں، حق باتوں کو دلوں میں اُتارنا ہے، دوسرے یہ کہ منطقی دلیلیں ایک خاص طبقہ کے لئے مفید ہوتی ہیں، ہر اُن پرٹھ اور جاہل کے لئے وہ کارگر نہیں ہو سکتیں، اور ”مشاہدہ“ وہ مُنحہ بولتی چیز ہے جس کی وجہ سے ایک اظہر دہیاتی بھی بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ :-

أَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبُعَيْرِ وَالْأَشْرُ عَلَى الْمَيْسِ فَهَمَاءُ
ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَأَرْضٌ ذَاتُ فُجَايِحٍ كَيْفَ لَا تَدُلُّ عَلَى
الطَّيْفِ الْخَبِيرِ

جب راستے میں بڑی ہوئی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے، اور نشان قدم مسافروں کا، تو یہ بڑجوں والا آسمان اور یہ غاروں والی زمین لطیف و خیر خالق کا پتہ کیسے نہیں دے گی؟

اس لئے اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر مشاہداتی دلیلیں ہر مرتبہ نئی شان اور نئی اداسے پیش فرمائی ہیں، ایک مثال سنئے، توحید کے دلائل دیتے ہوئے ارشاد ہے :-

أَمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ، مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ
تُنْبِتُوا شَجَرَهَا، أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَلِيمٍ الْغُيُوبِ
أَمْ مَنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا
رَوَاسِيًا وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَلِيمٍ الْغُيُوبِ
أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْيَوْمَ تُكْفَرُ بِهِ أَكْثَرُ هُمْ لَا يَعْلَمُونَ هَ أَمْ مَنْ يُجِيبُ الْمُنْظِرَ إِذَا دَعَاكَ وَ
يَكْتُمُ السُّوْءَ، وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَلِيمٍ الْغُيُوبِ
قَلِيلًا مَا تَدَّكَّرُونَ هَ أَمْ مَنْ يُعَدِّ يَوْمَ يُكْفَرُ فِي ظُلُمَاتٍ الْأَبْرَارِ وَالْبَحْرِ
وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ، أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَلِيمٍ الْغُيُوبِ
اللَّهُ، تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ هَ (نمل، ۶۳)

بلکہ وہ ذات بہتر جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے بارونق باغ اُگائے، تمہارے بس کی بات نہیں تھی کہ تم ان کے درخت اُگائے، کیا (اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو (حق بات سے) اعراض کرتے ہیں، بلکہ وہ ذات بہتر ہے جس نے زمین کو رہنے کی جگہ بنایا، اور اُس کے درمیان نہریں بنائیں، اور ان کے لئے جمانے والے پہاڑ بنائے، اور دو سمندروں کے درمیان ایک حائل بنا دیا، کیا (اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر (صحیح بات) نہیں جانتے، بلکہ وہ ذات بہتر ہے جو مضطر انسان کی دعا قبول فرماتی ہے، اور بُرائی کو دور کرتی ہے، اور تم کو زمین کا خلیفہ بناتی ہے، کیا (اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ وہ ذات بہتر ہے جو تمہیں خفگی اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتی ہے، اور جو اپنی رحمت سے خوش کر دینے والی ہوائیں بھیجتی ہے، کیا (اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ تعالیٰ اُن تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے، جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں ۱۱

یعنی جو ذات اتنے اہم کام سرانجام دیتی ہے اور اس کے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا، تو لامحالہ اسی کو عبارت کے لئے مخصوص کرنا چاہئے، اور دوسرے کو اس کا شریک بنانا بدترین حماقت ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جو ذات تہناتے عظیم کام انجام دیتی ہے اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت کیوں ہو؟ ایک اور جگہ یومِ آخرت کا اثبات کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا

لہ کفار عرب جانتے تھے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، زمین و آسمان اسی نے پیدا کئے ہیں، مگر وہ ذیوی بادشاہوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے تھے کہ اس نے ان کے انتظام کیلئے معاذ اللہ اپنی مددگار رکھے ہو

وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ وَالْأَرْضُ مِنْ مَدَدِنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا
 فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ تَبِيصًا وَذِكْرًا لِكُلِّ عَمْدٍ مُنِيبٍ وَنَزَّلْنَا مِنْ
 السَّمَاءِ مَاءً مَبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَبَّ وَحَبَّ الْعَصِيِّ وَالشَّجَلِ
 بِأَيْسَابٍ لَهَا طَعْمٌ كَرِيمٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَلِكَ
 الْخُرُوجُ (ق ۲۵ ۱۱)

”کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا، ہم نے اسے کیسے بنایا ہے، اور اسے
 زینت بخشی ہے، اور اس میں کوئی بھی تو شگن نہیں، اور ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے،
 اور اس میں نہ ٹٹنے والے پہاڑ بنائے ہیں اور اس میں ہر ایک بارونی جوڑا اگایا ہے تاکہ
 ہر جوڑے کرنے والا بندہ اُن سے بعیرت اور نصیحت حاصل کرے، اور ہم نے آسمان سے
 برکت والی پانی اُتارا، پھر اُس کے ذریعے بندوں کو رزق دینے کے لئے باغات اور
 کھیتوں کے بیج اُگائے، اور اس کے ذریعے مُردہ (تھپڑدہ) شہر کو زندہ کیا (بس) اسی
 طرح حشر ہو گا۔“

قرآن کریم میں انسانی جسم و نفس، کائناتی حقائق، فلکیات، نباتات اور ارضیات سے
 متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم کے دلائل کے ضمن میں آئی ہیں، اور جہاں
 جہاں آفاق و کائنات پر غور کرنے کی تاکید کی گئی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اُس
 کائنات کے اسرار و عجائبات پر غور کر کے اس کے بننے والے کی قدرت کاملہ کا استحصال پیرا
 کرے، اور بالآخر اُس کے آگے سجدہ ریز ہو جائے، اس ضمن میں سترآن کریم نے بہت سے سائنٹفک
 حقائق کی نقاب کشائی بھی فرمادی ہے، لیکن اس قسم کی تمام باتوں کو قرآن کے پورے سیاق
 (Context) میں دیکھنا چاہئے، اُسے ایک مستقل سائنس کی کتاب سمجھنے سے بہت سی
 غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں،

تجرباتی دلائل | قرآن کریم نے اقوام سابقہ کے تجربات کی طرف توجہ دلائی ہے، چنانچہ
 وہ جگہ جگہ ارشاد فرماتا ہے:-

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ

قَلِيلٌ مِّنْهُمْ قُوَّةٌ ۗ وَالْقَارُ وَالْأَرْضُ حَقٌّ وَعَمْرُوهُمَا أَكْثَرُ
وَمَا عَمْرُوهُمَا وَجَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ
يُظِلَّهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ (روم: ۹)

”کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا رہا جو ان سے پہلے گذرے ہیں، وہ ان سے قوت کے اعتبار سے زیادہ تھے، اور انھوں نے زمین کو ان کے بسانے سے زیادہ بسایا، اور بویا جو تا تھا، اور ان کے پاس ہمارے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے تھے، تو اللہ تو ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے“

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا فِتْلِكَ مَسَاكِينٌ لَّمْ تَسْكُنْ
مِنْ بَعْدِ هُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۚ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝ (قصص: ۵۸)

”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تکبر اختیار کیا، پھر دیکھ لو، وہ ان کی بستیاں ہیں جو ان کے بعد آباد نہ ہو سکیں، مگر بہت کم اور ہم ان کے وارث ہیں“
ان تجربات کو ذکر کر کے قرآن حکیم یہ بتلانا چاہتا ہے کہ جس جس قوم نے اپنی زندگی کو غلط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے، اور جس جس نے ہماری ہدایات کی روشنی سے منٹھ موڑا، ہم نے ہمیشہ اُسے تباہی کے اُن گہرے غاروں میں ڈھکیل دیا ہے جہاں سے وہ پھر کبھی نہیں نکل سکے،

عقائد (سلیبی پہلو)

مندرجہ بالا عقائد کو ثابت کرنے کے علاوہ قرآن کریم نے انسانوں کے عقائد و اعمال کی بہت سی گراہیوں کو زد کیا ہے، اور اُس گراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کے مختلف شبہات کا تشفی بخش جواب دیا ہے، اس مضمون کی آیتوں کو اصول تفسیر کی اصطلاح میں ”آیاتِ خاصہ“ کہتے ہیں،

اس قسم کی آیتوں میں چار قسم کے گمراہ انسانوں کا رد کیا گیا ہے :-

(۱) بت پرست مشرکین (۲) فصرانی (۳) یہودی (۴) منافقین،

بت پرست مشرکین | بت پرست مشرکین کی گمراہیاں پانچ اقسام کی تھیں :-
(۱) "شُرک" وہ باری تعالیٰ کی مخصوص صفات میں بتوں

کو شریک بٹھرانے تھے، اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے، مگر جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنی حکومت کے مختلف انتظامات مختلف آدمیوں کو سونپ دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حیثیت بھی (معاذ اللہ) ایک ایسے بادشاہ کی سی ہے جو کائنات پر کنٹرول کرتا ہے، مگر رزق وغیرہ جس زوی شعبے اس نے بتوں کے سپرد کر رکھے ہیں، اور اب ان میں اس کا کوئی دخل نہیں، لہذا ان شعبوں سے متعلق سوال بھی بتوں ہی سے کرنا چاہئے، اور ان کی عبادت کر کے انھیں خوش رکھنا چاہئے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سفارش کرتے رہیں، قرآن کریم نے ان کا یہ عقیدہ اس طرح بیان فرمایا ہے :-

وَمَا تَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (زمر: ۳)

ہم ان کی صرف اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب

کر دیں

بت پرستی کی یہ گمراہی ان لوگوں میں سب سے پہلے عمر دین لہجی نامی ایک شخص نے پھیلائی تھی اور اس میں شبانہ روز ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش کرتے تھے،

قرآن کریم نے ان کی اس گمراہی کا مختلف طریقوں سے رد فرمایا ہے، کہیں ان کو دلیل کا مطالبہ کیا کہ آخر کس نے تمہارے کان میں آ کر تم سے یہ باتیں کہہ دی ہیں کہ جن پر بے سوچے سمجھے عمل کئے جاتے ہو، اور انھیں چھوڑنے کا نام نہیں لیتے، کہیں یہ ثابت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کا ارادہ ہی بڑی سے بڑی چیز کو عدم کے پردوں سے نکال کر وجود کے اسٹیج پر لا کھڑا کر دیتا ہے، پھر اسے اپنی سلطنت

کے انتظام میں دوسروں کی مدد کی کیا حاجت ہے؟ (سورہ نمل کی جو آیت اور پریشانی گئی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے)، ہمیں انھیں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ جو پتھر کل تک لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا تھا وہ آج تھوڑے کی ضرب کھا کر خدا کیسے بن گیا؟ صرف ”لات“ یا ”ہیل“ نام رکھ لینے سے اس میں رزق دینے اور مصیبتیں دور کرنے کی صلاحیت کہاں سے آگئی؟

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ مِّمَّنْ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَإِنَّا لَا نَعْلَمُ مَا
أَنْزَلِ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ، (النجم: ۲۳)

”بس یہ چند نام ہیں جو تم لوگوں نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ دئے ہیں، اللہ نے تو ان میں کوئی قوت و قدرت نہیں اتاری“

(۲) بُت پرستوں کی دوسری گمراہی ”تشبیہ“ تھی، یعنی وہ خدا تعالیٰ کو اپنے اور قبیلہ کے مجسم اور (معاذ اللہ) بیوی بچوں والا سمجھتے تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، و سترآن کریم نے ان کی اس گمراہی کا رد و طرح فرمایا، ایک تو کلیۃ اللہ سے اولاد کی نفی کر کے:-

لَمَّا يَلِدُنَّ وَاكْمُرُ يُؤْكَلُنَّ ۗ (اخلاص: ۳)
”اُس نے کسی کو جنم ہونہ وہ کسی کو جنمایا“

دوسرے خاص طور سے لڑکیوں کی نفی کر کے، کہ ذرا اپنی عقل مندی تو ملاحظہ کرو کہ تم بیٹیوں کا وجود اپنے لئے تو باعث ننگ و عار سمجھتے ہو، اور پھر جس ذات کو پوری کائنات کا پروردگار مانتے ہو اس کے لئے بیٹیوں کے وجود کے قائل ہو:-

أَلَمْ يَلِدْكَ وَاللَّيْلَةُ وَكَأَنَّكَ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۗ
”کیا اس کیلئے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لئے بیٹے؟ تمہیں کیا ہو گیا؟“

کیسے کیسے فیصلے کر لیتے ہو؟ (الطور: ۳۹ / القلم: ۳۶)

(۳) اُن کی تیسری گمراہی ”تحریف“ تھی، یعنی وہ اپنے آپ کو دین ابراہیم علیہ السلام کا پیر و سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم ٹھیک اُن کے طریقے پر ہیں، مگر بہت سے جزوی

احکام و قوانین بھی انھوں نے اپنی طرف سے گھڑ لئے تھے، ننگے ہو کر طواف کرنا، نماز کی بجائے سیٹیاں اور تالیاں بجانا، جہینوں کو آگے سچھے کر لینا، کہ جنگ کرتے کرتے کوئی ”شہر حرام“ آجاتا تو وہ کہتے کہ اب کے یہ مہینہ دو مہینے تک چلے گا، باری تعالیٰ نے جا بجا ان کی لغو بیویوں کو ظاہر کیا ہے، اور مسلمانوں کو ایسی داہمیاں باتوں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے؛

يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ خُذْ زِينَتَكَ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

”اے ایمان والو! ہر مسجد کے پاس اپنا لباس ضرور پہن کر دو“
 وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ الْاَمْكَأُ اَوْ تَصَدِيْقَةً
 ”اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے
 سوا کچھ نہ تھی“
 (الانفال: ۳۵)

اِنَّمَا النَّسِيْءُ زِيَادَةٌ فِى الْكُفْرِ، (التوبة: ۳۷)

”بلاشبہ مہینوں کو آگے سچھے کرنا کفر میں اور زیادتی ہی“

(۴) ان کی جو تھی مگر ابھی یہ تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ خدا تسلیم نہیں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہمارا جیسا چلنے پھرنے اور کھلنے پینے والا انسان پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے جا بجا ان کی اس گمراہی کا رد فرمایا، اور سمجھایا کہ بشریتِ نبوت کے منافی نہیں، اور ہمیشہ سے انبیاء انسانوں ہی میں سے آئے ہیں:-

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ،

”اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مرد ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی

نازل کر دیتے تھے“
 (یوسف: ۱۰۹)

(۵) ان کی پانچویں گمراہی ”انکارِ آخرت“ تھی کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے تھے، قرآن کریم نے اس کا مختلف دلنشین اسالیب سے رد فرمایا:-

اَوَلَمْ يَسِرُّوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، وَ

لَمْ يَكُنْ لِحُجُوْبِهِمْ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يَّجِئَ الْمَوْتٰى (الحقاف: ۳۳)

”کیا وہ خدات جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور ان کے پیدا
فرمانے سے بالکل محفل بھی نہیں، وہ اس بات پر قادر نہیں کہ اس جیسی
اور چیزیں پیدا فرمادے“

قرآن کریم نے یہودیوں کا رد بھی فرمایا ہے، یہ لوگ اپنی گمراہیوں میں حد سے
یہودی بڑھے ہوئے تھے، بت پرست مشرکین میں جو گمراہیاں تھیں وہ (سورہ
انبار آخرت کے) سب ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، کہنے کو تو یہ لوگ اپنے آپ کو ”تورات“
کا پیرو کہتے تھے، مگر وہ حقیقت یہ اس کے پیرو نہ تھے، تورات تو خود ہی ان کے رحم و کرم
پر تھی، یہ اس میں جس طرح ان کا دل چاہتا تھا تصدق کرتے تھے، تورات میں ان کا تصرف
تین قسم کا تھا،

(۱) تحریف لفظی؛ یعنی یہ لوگ تورات کی آیتوں کا غلط ترجمہ کر کے لوگوں کے سامنے
پیش کرتے تھے،

(۲) تحریف معنوی؛ یعنی تورات کی آیتوں کا اپنی طرف سے گھڑ کر مطلب بیان
کرتے اور اسی پر دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے، اس کی ایک مثال
ملاحظہ فرمائیے؛

ہر نبی کی امت میں یہ بات معروف و مشہور رہی ہے کہ کافر اور فاسق ایک چیز
نہیں، بلکہ دونوں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی جدا ہیں اور دونوں کا انجام
بھی مختلف ہے، کافر وہ ہے جو دینِ فطرت کے بنیادی حقائق مثلاً توحید، آخرت اور
رسالت پر ایمان نہ رکھتا ہو، ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذابِ جہنم کا مستحق ہوتا ہے،
اور فاسق وہ ہے جو ان بنیادی چیزوں پر ایمان رکھنے کے باوجود عمل اور کردار کے
اعتبار سے اپنے آپ کو دینِ فطرت کے مطابق نہ بنا سکا ہو، اور ان چیزوں کا ارتکاب
کرتا رہتا ہو جو دینِ فطرت نے شہادت کے ساتھ ممنوع قرار دی ہیں، ایسا شخص دائمی
عذاب کا مستحق نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جلاسا لے گا۔
تورات میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا تھا کہ جو شخص حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا ہے

وہ جنت کا مستحق نہ رہے اور اگر درخ میں جائے گا بھی تو عارضی طور پر، اس کا مطلب یہی تھا کہ جو شخص دینِ فطرت کے بنیادی تصورات سے متفق ہوتے ہوئے اپنے زمانے کے رسول پر ایمان لے آئے گا وہ اس مرتبے کا مستحق ہوگا۔۔۔۔۔ یہودیوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ ہماری نجات کے لئے بھی بس حضرت موسیٰ پر ایمان لانا کافی ہے اور اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو کوئی حرج نہیں،

وَقَالُوا لَنْ نَمُوتَ النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ط (آل عمران: ۳۷)

”اور انھوں نے کہا کہ ہمیں آگ نہیں چھو سکے گی مگر کچھ دن“

قرآن کریم نے اس پر واضح انداز میں رد کرنے ہوئے فرمایا۔

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ

أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ه (البقرة: ۸۱)

”کیوں نہیں جس شخص نے کوئی برا کام کیا اور اس کی بُرائی اُس پر چھائی

تو ایسے لوگ آگ کے مستحق ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،“

(۳) یہودیوں کی تیسری گراہی یہ تھی کہ وہ تورات کی بہت سی آیتوں کو چھپاتے تھے، تاکہ دنیا والوں میں اُن کا بلند مرتبہ برقرار رہے، انھیں خطرہ تھا کہ اگر اس قسم کے احکام لوگوں کو معلوم ہو گئے اور انھوں نے یہ دیکھا کہ ہمارے علماء اُن پر عمل نہیں کرتے تو وہ اُن سے بداعتقاد ہو جائیں گے، اور عزت و شرف کا جو مقام انھیں حاصل ہے، وہ جاتا رہے گا،

چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت والی آیتیں وہ آیتیں چھپائی کہ سنسگارا کرنے کا حکم تھا چھپا رکھی تھیں اور آپس میں یہ تاکید کرتے رہتے تھے کہ دیکھو یہ باتیں کسی مسلمان کو نہ بتا دینا، قرآن کریم نے ان کی اس چھالت کا جگہ جگہ پردہ چاک کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں کہ:

أَحْبَبَ نَوْهُمْ بِمَا قَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيَحَابِقُوا كَمَا بِهِ عِنْدَ

رَبِّكُمْ، (بقرہ: ۷۶)

”کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں نبلا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کر دی ہیں، نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ تم کو مغایب کر دیں گے تمہارے پروردگار کے پاس“

نصاری یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا متبع کہتے تھے، ان کی سب سے پہلی گمراہی ان کا ”عقیدہ تثلیث“ تھا، یعنی یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) تین اجزاء (واقانیم) ہیں، جو بعض اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں، اور بعض اعتبار سے مختلف، پہلا جزء ”باپ“ ہے، دوسرا جزء ”بیٹا“ اور تیسرا جزء ”روح القدس“ ہے، اور بیٹے کا جزء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روپ دھار کر دنیا میں آیا تھا،

اللہ تعالیٰ نے جہالت کے اس مضحکہ خیز نظریہ کو علم کی روشنی سے رد فرمایا، اور جا بجا یہ جتلا دیا کہ یہ تو ایسی بے سرو پا بات ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے پناہ مانگتے ہیں،

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوا مِنِّي وَآرْحَى
الْهَيْئِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ
مَا لَيْسَ لِي بِعَيْشٍ أَنْ كُنْتُ قُلْتَهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعَلَّمَ مَا فِي نَفْسِي
وَلَا أَعْتَمُرُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ... إِنَّ تَعْدِيهِمْ
فِي آيَاتِهِمْ عِبَادِكَ وَإِنَّ تَغْفِرَ لَهُمْ فَمَا تَأْتِي أَنْتَ الْغُفُورَ الرَّحِيمَ (المائدہ: ۱۱۸)

”اور جب کہ اللہ نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے بجائے معبود بنا لو؟ انھوں نے کہا کہ پروردگار! آپ پاک ہیں میرے لئے یہ شایان نہیں کہ وہ باتیں کہوں جن کا مجھے حق نہیں پہنچتا، اگر میں نے ان سے کہا ہوتا تو آپ ضرور جلتے، آپ وہ تمام باتیں سنا جاتی ہیں جو میرے دل میں ہیں، اور میں وہ باتیں نہیں جانتا جو آپ کے دل میں ہیں بلاشبہ آپ مجھے ہرے بھیدوں کے جلنے والے ہیں... اگر آپ انھیں

غذاب دین تو وہ آپ کے بندے ہیں ہی، اور اگر آپ اُن کو بخش دیں تو بھی کوئی
تجربہ کی بات نہیں کیونکہ آپ بڑے بخشنے والے اور مہربان ہیں۔
بہت پرست مشرکین کی طرح یہ بھی انکار رسالت، تشبیہ اور تحریف کے مرتکب تھے،
جن پر بار بار تنبیہ فرمائی ہے،

منافقین | یہ اُن شریر بد طینت، بزدل اور کم حوصلہ انسانوں کا گردہ تھا، جن کا
دل تو کفر و شرک کے اہنی ٹپوں سے آباد تھا، جنہیں دوسرے کفار
کھلم کھلا پوجا کرتے تھے، مگر یہ بیجا بے اتنا حوصلہ نہ رکھتے تھے کہ علی الاعلان اپنے
عقائد کا اعلان کر سکیں، اس لئے زبان سے توحید رسالت، اور یوم آخرت کا اقرار
کرتے تھے، اور در پردہ مسلمانوں کے خلاف سازش کے جال تیار کرتے رہتے تھے،
ان میں سے بعض تو وہ تھے جو صرف سازش اور دغا بازی کے ارادہ سے کلمہ توحید
پڑھتے تھے، مگر اُن کا دل کفر و شرک کی تمام شقاوتوں سے پُر تھا، اور بعض وہ تھے جو
اپنے بڑے بڑوں کو اسلام لاتا دیکھ کر خود بھی زبان سے اسلام لانے کا اقرار
کرتے تھے، گویا اُن کے نزدیک اصل مسئلہ اپنے بڑوں کی اتباع تھا، اگر وہ کافر ہیں
تو یہ بھی کافر رہتے تھے اور اگر وہ مسلمان ہیں تو یہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگتے تھے،
چونکہ ان منافقوں کے کوئی مستقل عقائد نہیں تھے، بلکہ یہ زبان سے اپنے
آپ کو اسلامی عقائد ہی کے پیرو کہتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ اُن کے عقائد پر رد
کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ قرآن کریم نے اُن کی بد طینتی اور
سازشی خصلت کو جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے، اور اُن کی خباثتوں کے پول کھولے
ہیں، اس کے نمونے دیکھنے ہوں تو سورۃ توبہ اور سورۃ انفال پڑھ جائیے، ان دونوں
سورتوں میں باری تعالیٰ نے اُن کی گندگیوں کو ایک ایک کر کے بیان فرمایا ہے،

احکام

قرآن کریم کا دوسرا مضمون "احکام" ہے، اس میں جن احکام کا ذکر کیا گیا ہے

انہیں ہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:-

(۱) وہ احکام و قوانین جو خالص اللہ کے حقوق سے متعلق ہیں جنہیں مختصر الفاظ میں خالص "عبادات" کہا جاسکتا ہے، اس میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، شربانی اور حج کے احکام داخل ہیں، اور قرآن کریم نے ان چیزوں سے متعلق بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں،

(۲) وہ احکام و قوانین جو خالص بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں جنہیں ہم "معاملات" سے تعبیر کر سکتے ہیں، مثلاً تجارت، قضا، شہادت، امانت، اگر دی رکھنے، ذبیحہ جانوروں کو کھانے، مختلف مشروبات کے استعمال، وصیت اور میراث وغیرہ ان کے احکام خود قرآن کریم میں موجود ہیں،

(۳) وہ احکام و قوانین جو بعض حیثیت سے عبادت میں اور بعض حیثیت سے معاملت اس نوع میں سے نکاح و طلاق، حدود و تعزیرات (Criminal Laws) دیا، قصاص (Torts)، چھادا، ایمان، قسمیں اور شرکت کے احکام قرآن کریم نے ذکر فرمائے ہیں،

قرآن کریم چونکہ دنیا کو ایک ایسا پاکیزہ نظام حیات دینا چاہتا ہے جس پر برزخ میں عمل کر کے انسان امن و سکون پاسکیں، اس لئے اس نے اپنے احکام نافذ کرتے وقت "تدریجی انداز" اختیار کیا، یعنی کوئی غیر متوقع حکم یکایک نہیں دیدیا، بلکہ پہلے اپنے اس حکم کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا، اور بعد میں اُسے نافذ فرمایا، اس کی ایک مثال شراب کی حرمت ہے، اہل عرب شراب کے ایسے متوالے تھے کہ ان کی زبان میں اس کے ڈھائی سو نام ہیں، ان سے اس خبیث عادت کو چھڑانا قرآن کریم ہی کا معجزہ ہے، جب شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی حلت و حرمت کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھا گیا، تو قرآن نے فوراً یہ نہیں فرمادیا کہ اسے چھوڑ دو بلکہ ارشاد ہوا:-

قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَ مَنَافِعٌ لِلنَّاسِ وَ اَمَّا هُمَا

اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا، (البقرة: ۲۱۹)

”آپ کہہ دیجئے کہ ان (شراب اور جوئے) میں بڑا نقصان ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان کا نقصان اُن کے نفع سے زیادہ بڑا ہے؛
 سلیم الفطرت انسان اسی سے سمجھ گئے کہ اس چیز کو چھوڑ دینا، ہی بہتر ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد حکم نازل ہوا۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ (النساء: ۴۲)

نتیجے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ؛

اب عام طور پر ذہنوں میں شراب کی ناپسندیدگی بیٹھ چکی تھی، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد واضح حکم نازل ہو گیا کہ:

إِذَا مَا الْأَحْمَرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْسَابُ وَالْأَنَّا لَا مَرْحَبٍ

مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ قَابِجْتَيْنِوَا، (المائدہ: ۹۰)

”بلاشبہ شراب، جوا، بت اور لالٹری کے تیراگندگی کی چیزیں اور

شیطان کا عمل ہیں، لہذا تم ان سے پرہیز کرو۔“

قرآن کریم میں جس قدر احکام مذکور ہیں وہ دوطریقے سے نازل ہوئے:-
شان نزول (۱) مسلمانوں یا کافروں میں کوئی غلط رواج تھا اس کو بدلنے کی

اللہ تعالیٰ نے خود ہی ضرورت محسوس فرمائی، اور اس کے لئے آیت نازل ہو گئی
 اس طرح بعض اوقات ایک ہی آیت نے کسی کئی غلط رسموں کو ختم کر دیا، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اہل عرب کا ایک معمول یہ تھا کہ اپنے زیر سر پرستی یتیم عورتوں کے مال و دولت اور حُسن و جمال کی وجہ سے اُن سے شادی کر لیا کرتے تھے، پھر اُن کو نان و نفقہ اور ہر اس معیار کا نہیں دیتے تھے جس معیار کا وہ دوسری عورتوں سے نکاح کرنے پر دیتے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہل عرب دس دس عورتوں سے بیکنے وقت شادی کر لیتے تھے اور جب اُن کے مصارف ادا کرنے پر قادر نہ ہوتے تو اپنے زیر سر پرستی یتیموں کے مال میں خُرد بُرد کرتے تھے،

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل عرب دس دس بیویاں رکھتے تھے، مگر ان کے

درمیان عدل و انصاف کا معاملہ نہیں کرتے تھے، اہل عرب کے یہ تمام طرز ہائے عمل غلط تھے، اور اسلامی معاشرہ میں انھیں بدلنے کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک جامع آیت نازل فرمادی جس نے ان تمام خرابیوں کا قلع قمع کر دیا،

وَلَا تَحْفَظْنَهُنَّ إِلَّا بِمَوْظِعِ عِلَّتِكُمْ بَعْدَ عِلْتِكُمْ وَلَا يُبْرَأُ لَكُمْ مِنْهُنَّ شَيْءٌ وَلَا تَحْفَظْنَهُنَّ مَتْنُ وَثَلَاثَ وَرُبَاعًا، قَانَ حِفْظُهُنَّ إِلَّا تَعْدِلُوا
قَوَائِدُهَا، (نساء: ۳)

”اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تمہیں کے باہر میں انصاف نہیں کر سکو گے تو دوسری عورتوں میں سے جو تمہارے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کرو، دو دو سے تین تین سے، چار چار سے، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے، تو ایک ہی سے نکاح کرو“

جو لوگ اپنی زیر پرورش یتیم عورتوں سے شادی کر کے انھیں بولے حقوق نہیں دیتے تھے، اس آیت نے انھیں یہ حکم دیدیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ تم اپنی یتیم عورتوں سے شادی کرو، اور انہیں تمہارے لئے دوسری عورتوں میں سے چار تک نکاح کرنا جائز قرار دیا ہے، ان سے نکاح کرو، جو لوگ دس دس عورتوں سے نکاح کر ڈالتے تھے اور ان کے مصارف سے کنگال ہو جانے پر یتیموں کے مال میں خرد بُرد کرتے تھے، انھیں شادی کی ایک معقول حد بتلا دی کہ چار سے آگے نہ بڑھو، تاکہ مصارف اتنے زیادہ ہی نہ ہوں کہ یتیموں کے مال میں گرا بڑ تک نوبت پہنچے، اور جو لوگ دس دس بیویوں سے نکاح کر کے ان کے درمیان بے انصافی کے مجرم تھے، انھیں بھی یہ فرمادیا گیا کہ چار سے زیادہ شادیاں نہ کر دو تاکہ عدل و انصاف پر قائم رہنا آسان ہو، اور اگر ان میں بھی بے انصافی کا خوف ہے تو بس ایک بیوی پر اکتفا کرو،

اس طرح اس ایک آیت نے بیک وقت کئی خرابیوں کا انسداد کر دیا،
(۲) احکام کے نازل ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوتا تھا کہ کسی خاص واقعہ کے

پیش نظر صحابہؓ نے کوئی مسئلہ پوچھا تو اس پر آیت نازل ہو گئی، اس کی مثالیں "اسباب نزول" کے عنوان کے تحت پیچھے گزر چکی ہیں،

قِصَص

قرآن کریم کا تیسرا اور اہم مضمون "قصص اور واقعات" ہیں، قرآن کریم میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں انھیں دو قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ واقعات جو ماضی سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو مستقبل سے متعلق ہیں،

ماضی کے واقعات | ماضی کے واقعات میں باری تعالیٰ نے زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے ہیں، اور ان کے علاوہ بعض نیک یا نافرمان افراد و اقوام کے واقعات بھی مختلف جگہوں پر ذکر ہوئے ہیں، قرآن کریم میں کُل ستائیس انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر فرمائے گئے ہیں جن کے اسمائے گرامی تاریخی ترتیب سے حسب ذیل ہیں :-

حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ،
حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یعقوبؑ،
حضرت یوسفؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت یوشعؑ،
حضرت حزقیلؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ایساؑ، حضرت الیسعؑ، حضرت شموئیلؑ،
حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ذوالکفلؑ، حضرت عزیرؑ، حضرت زکریاؑ،
حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام،

ان حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد و اقوام کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے :-

اصحاب الجنۃ، اصحاب القرۃ، حضرت لقمانؑ، اصحاب السبت، اصحاب البرس،
حضرت ذوالقرنینؑ، اصحاب الکہف والرقیم، قوم سبا، اصحاب الاغود، اصحاب البعل،
ان قصوں کو بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود تاریخ نگاری نہیں ہے، بلکہ

وہ ان قصوں کو یاد دلا کر ایک طرف تو تذکیر و موعظت کا سامان جیتا فرماتا ہے، اور مسلمانوں کو انبیاء کرام کی دعوت و عنایت سے سبق لینے پر مجبور کرتا ہے اور دوسری طرف یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ سابقہ قوموں اور امتوں نے یہ بصیرت افرز سچے واقعات اس ذات گرامی کی زبان پر جاری ہو رہے ہیں جو بالکل اُمتی ہے، اور اس نے آج تک کسی کے پاس رہ کر اس قسم کا کوئی علم حاصل نہیں کیا، اس لئے یقیناً اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بانبر کیا جاتا ہے، اور جو کلام وہ تلاوت فرماتے ہیں وہ کوئی انسانی کلام نہیں خدا کا کلام ہے،

پھر ان قصوں کے درمیان علم و حکمت کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں اور ان کی ہر آیت انسان کو زندگی کے ان گنت مسائل پر صحیح اور بہترین رہنمائی عطا کرتی ہے،

واقعات میں تکرار کیوں؟ | قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان سے متعلق عام طور پر ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے، کہ قرآن کریم میں

ایک ہی قصے کو بعض اوقات کسی کسی بار دہرایا گیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ کا واقعہ قرآن کریم میں بہتر مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اگر ایک قصہ ایک ہی جگہ بیان کر دیا جائے اور بقیہ مقامات پر احکام بیان ہو جاتے تو امت کے لئے شاید زیادہ آسانی کا موجب ہوتا اور بہت سے اختلاف ختم ہو جاتے،

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دراصل قصوں کو بار بار ذکر کرنے میں کئی حکمتیں ہیں،

(۱) قرآن کریم دفعۃً ایک مرتبہ نازل نہیں ہوا، بلکہ تدریجاً اُتر لے، اور اس امت کیلئے

اُتر لے جسے اپنے ابتدائی دور میں قدم قدم پر نئی نئی آزمائشوں اور بے شمار تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہو گا کہ اُس امت کی پوری زندگی ہی اپنی ترقی کے دور میں جہاد و قتال، حرب و ضرب، سرفروشی و جان بازی اور محنتوں میں گزری ہے، ایسی صورت میں اگر انھیں بار بار تسلی ندادی جاتی تو وہ دل شکستہ ہو بیٹھتے، چنانچہ قرآن کریم نے ہر اُس موقع پر پچھلے انبیاء کے واقعات سناے جہاں مسلمانوں کو دشواریاں پیش آئیں، اور بار بار انھیں یہ بتلایا کہ ان آزمائشوں میں تم تنہا نہیں ہو، بلکہ دعوتِ حق کا ہر قافلہ اُن کٹھن دادیوں سے گزر رہے اور انجام کار ہمیشہ کامیابی و کامرانی نے اس کے

قدم پڑھے ہیں،

بہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک نبی کا واقعہ بھی قرآن حکیم میں یک جا نہیں ہوتا بلکہ اس کے متفرق حصے مختلف مقامات پر مذکور ہیں، جس موقع پر جس پیغمبر کے جس واقعے کی ضرورت ہوتی اس موقع پر اسی کو نازل فرمایا گیا،

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ قصوں کے اس تکرار سے یہ بات واضح انداز میں معلوم ہوتی ہے کہ قرآن حکیم جزئیات، احکام بیان کرنے کے لئے نازل نہیں ہوا، وہ احکام کے صرف اصول بیان فرماتا ہے، اور اس کا بنیادی مقصد عقائد کی اصلاح، تذکرہ اور خوش کردار پر ابھارنا ہے، ہر قانونی جزئیات، سودہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تشریح پر چھوڑ دیتے ہیں، اور انھیں وہ وحی غیر متلوئے ذریعے دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے، قرآن کریم کا یہ طریقہ عمل نجاتِ حدیث پر ایک بڑی واضح دلیل ہے، کیونکہ اگر فقہ و قانون میں صرف قرآن حجت ہوتا اور احادیث حجت نہ ہوتیں، تو قرآن کریم میں بار بار قصے بیان کرنے کی بجائے احکام بیان فرمائے جاتے، اور قصوں کو وحی غیر متلوئے ذریعے بیان فرمادیا جاتا، ظاہر ہے کہ قصے بیان کرنے سے جو مقصد سیرہ اس طرح بھی بدرجہ اتم پورا ہو جاتا، مگر یا رب تعالیٰ نے اکتے برعکس ترتیب رکھ کر گویا اس بات پر تنبیہ فرمادی ہے کہ قرآن عقائد و اخلاق کی تربیت کے لئے آیا ہے، اور صرف اصول احکام بیان فرماتا ہے، اور جزئیات کے بارے میں اس کا ارشاد یہ ہے :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَآئِمَاتِنَا شِجْرَ بَيْنِهِمْ
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا (النساء: ۶۵)

”پس نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم، وہ ایمان نہیں لاسکتے تا وقتیکہ وہ آپ کو اپنے مختلف فیہ معاملات میں فیصلہ نہ بنالیں، اور پھر آپ کے فیصلے سے دل میں اپنے کوئی تنگی محسوس نہ کریں (بلکہ) اسے خوب اچھی طرح تسلیم کر لیں۔“

(۳) قصوں کے مکرر ہونے میں ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اس سے اعجاز قرآن کا

مظاہرہ ہوتا ہے، انسان کی نفیات کا تقاضا ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار سنتے رہنے سے اکتا جاتی ہے، اور چند مرتبہ کے بعد ایک اچھے خاصے واقعے میں بھی اُسے کوئی حظ یا لطف محسوس نہیں ہوتا، مگر قرآن کریم اگرچہ ایک ہی واقعے کو بار بار ذکر فرماتا ہے، مگر اس میں ہر بار نئی لذت اور ہر مرتبہ نیا کیفیت محسوس ہوتا ہے، یہ بات انسان کو بیساختہ اس نتیجے تک پہنچے پر مجبور کر دیتی ہے کہ یہ کلام یقیناً کسی بشری دماغ کا جنم دیا ہوا نہیں ہے،

مستقبل کے واقعات | قرآن کریم نے پیش گوئی کے طور پر مستقبل کے واقعات میں بھی ذکر فرمائے ہیں، اس قسم کے واقعات میں قیامت کی نشانیاں، قیامت کے احوال، حشر و نشر کا منظر، دوزخ کی ہولناکیاں اور جنت کی دل فریبیاں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ قیامت سے پہلے زمین سے ایک بولتے ہوئے جانور کا نمودار ہونا، یا جوج و ماجوج کا خروج، صورِ اسرافیل، سوال و جواب اور جنمیوں کے باہمی مکالمے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر موجود ہیں،

امثال

قرآن کریم میں جو امثال مذکور ہوئیں ہیں ان کی ذکر ہمیں پس، ایک تو وہ امثال جو کسی بات کو سمجھانے کے لئے تمثیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں، مثلاً:

مَثَلُ الَّذِي يَنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ
اَبْتَلَّتْ سَبْعَ سَبَاطِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةَ حَبَّةٍ، (البقرہ: ۲۶۱)

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی حالت اُس بیج کی سی ہے جس نے سات خوشے اُگانے ہوں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہوں؛

بتلانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے مال کا بدلہ آخرت میں سات سوگنا بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ملے گا، انسانی عقل اس کو ذرا بعید سمجھ سکتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا دیا، کہ جس طرح زمین میں ڈالنا ایک بیج درخت پر سات سو نئے بیج لے کر نمودار ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں خرچ

کیا ہوا مالِ آخرت میں سات سو گنا بڑھ کر انسان کو ملے گا،
 اس قسم کی تمثیلات بات کو پوری طرح واضح کرنے اور موثر بنانے کے لئے لاکھا
 گئی ہیں، آمثال کی دوسری قسم وہ ہے جسے اردو میں "کہادت" کہتے ہیں، اس قسم کی
 امثالِ قرآن کریم میں دو طرح مذکور ہوئی ہیں، بعض تو وہ ہیں جو نزولِ قرآن کے
 بعد ہی کہادت بنیں، گویا اُن کا موجد ہی قرآن ہے، مثلاً:-
 هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانِ (رحمن: ۶۰)
 اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں ۵

اور :-

وَأَنْ تَعْقُوا ۖ أَذْهَبَ اللَّشْقُورَىٰ (البقرہ: ۲۳۷)
 اور معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ۵

کہادتوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں صراحت کوئی کہادت تو مذکور نہیں، مگر
 آیت کے مفہوم سے نکلتی ہے، گویا یہ تو عوامی سبب الامثال کا سرچشمہ ہیں، یا اُن کی نظر
 دلالت کرتی ہے، ایسی امثال کو "امثالِ کامنہ" کہا جاسکتا ہے، اس کی قرآن کریم میں
 بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً ایک عربی کہادت مشہور ہے کہ :-

كَيْسَ الْعَبْرُكَ كَالْأَعْيَانِ
 فتنبدہ کے بودمانند دیدن

یہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں موجود ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام
 نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ "آپ مجھے دکھلائیے کہ آپ مُردے کو زندہ کس طرح
 کرتے ہیں؟ اس پر باری تعالیٰ نے پوچھا: "کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟ تب
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:-

بَلَىٰ ۚ لَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم

"کیوں نہیں؛ میں ایمان رکھتا ہوں، مگر
 میں نے یہ درخواست اس کی ہو کہ میرا دل مطمئن ہو جائے"

اسی طرح مثل مشہور ہے :-
 لَا يُلَدَّغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ مَحْرَمَاتِهِ
 ”مسلمان کو ایک سوراخ سے دوسرے
 نہیں ڈسا جاسکتا“

یہ سورۃ یوسف کی آیت میں موجود ہے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے
 ماں شریک بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد
 حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ بنیامین کو بھی بھیج دیجئے
 تو انھوں نے فرمایا :-

هَلْ اٰمَنْتُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَا اٰمَنْتُكُمْ

عَلَىٰ اَخِيهِ (یوسف : ۶۴)

”کیا میں تمہیں اس کے بارے میں ایسا ہی امانت دار
 سمجھوں جیسا کہ اس کے باپے میں سمجھا تھا؟“

علم تفسیر

• — تعارف

• — اصول

• — تاریخ

۲۲۲

علم تفسیر اور اس کے مآخذ

تعارف؛

لفظ ”تفسیر“ دراصل ”فسر“ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں ”کھولنا“ اور اس علم میں چونکہ قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے، اس لئے اسے ”علم تفسیر“ کہتے ہیں چنانچہ قدیم زمانے میں تفسیر کا اطلاق قرآن کریم کی تشریح ہی پر ہوتا تھا، اور عہد رسالت سے قرب اور علوم کے اختصار کی بنا پر اس علم میں زیادہ شاخیں نہیں تھیں، لیکن جب اس نے ایک مدون علم کی صورت اختیار کی اور مختلف پہلوؤں سے اس کی خدمت کی گئی تو یہ ایک انتہائی وسیع اور پہلو دار علم بن گیا، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں تفصیلاً کا اضافہ ہوتا چلا گیا، اب ”علم تفسیر“ جن تفصیلات کو شامل ہے اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے :-

۱۔ چنانچہ علامہ زرکشی نے علم تفسیر کی مختصر تعریف یہ کی ہے: ”علم یعرف بہ فہم کتاب اللہ المنزل علی نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم و بیان معانیہ واستخراج احکامہ وحکمہ“ یعنی ”وہ علم جس سے قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جاسکے“، (البرهان، ص ۱۳ ج ۱)

عِلْمٌ يَبْعَثُ فِيهِ عَنِ كَيْفِيَّةِ التَّلْقِي بِأَفْظِ الْقُرْآنِ وَمَنْ لَوْلَا
وَأَحْكَامُهَا الْإِفْرَادِيَّةُ وَالتَّرْكِيبِيَّةُ وَمَعَانِيهَا الَّتِي تُحْمِلُ عَلَيْهَا
حَالَةَ التَّرْكِيبِ وَتَتَمَّاسَتْ لِذَلِكَ ۛ

”علم تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے، اُن کے مفہوم، اُن کے
افزادی اور ترکیبی احکام اور اُن معانی سے بحث کی جاتی ہے جو اُن الفاظ سے ترکیبی
حالت میں مراد لئے جاتے ہیں، نیز اُن معانی کا تحمل، ناسخ و منسوخ، شان نزول اور
مہم قصوں کی توضیح کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے ۛ

اس تعریف کی روشنی میں علم تفسیر مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:-

۱۔ الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے ”یعنی الفاظِ قرآن کو کس کس طریقے سے

پڑھا جاسکتا ہے؟ اسی کی توضیح کے لئے قدیم عربی مفسرین اپنی تفسیروں میں ہر آیت
کے ساتھ اس کی تفسیر میں بھی تفصیل سے واضح کرتے تھے، اور اس مقصد کے لئے
ایک مستقل علم ”قرآت“ کے نام سے بھی موجود ہے، جس کا مختصر تعارف پچھلے صفحات
میں آچکا ہے،

۲۔ ”الفاظِ قرآنی کے مفہوم“ یعنی اُن کے لغوی معنی، اس کام کے لئے علم لغت

سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے، اور اسی بنا پر تفسیر کی کتابوں میں علماء لغت
کے حوالے اور عربی ادب کے شواہد بکثرت ملتے ہیں،

۳۔ ”الفاظ کے افرادی احکام“ یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا

مادہ کیا ہے؟ یہ موجودہ صورت میں کس طرح آیا ہے؟ اس کا وزن کیا ہے؟ اور اس
وزن کے معانی و خواص کیا ہیں؟ ان باتوں کے لئے ”علم صرف“ کی ضرورت پڑتی ہے،

۴۔ ”الفاظ کے ترکیبی احکام“ یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ کس

الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنی دے رہا ہے؟ اس کی نحوی ترکیب (Grammatical

Analysis) کیا ہے؟ اس پر موجودہ حرکات کیوں آئی ہیں؟ اور

کن معانی پر دلالت کر رہی ہیں؟ اس کام کے لئے علم نحو اور علم معانی سے مدد لی جاتی ہے،
 ۵۔ ”ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی“ یعنی پوری آیت اپنے سیاق و سباق
 میں کیا معنی دے رہی ہے؟ اس مقصد کے لئے آیت کے مضامین کے لحاظ سے مختلف علما
 سے مدد لی جاتی ہے، مذکورہ علوم کے علاوہ بعض اوقات علم ادب اور علم بلاغت سے کام
 لیا جاتا ہے، بعض اوقات علم حدیث سے اور بعض اوقات علم اصول فقہ سے،

۶۔ معانی کے مکملے ”یعنی آیات قرآنی کا پس منظر اور جو بات قرآن کریم میں محل ہے
 اس کی تفصیل، اس غرض کے لئے زیادہ تر علم حدیث سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس کے
 علاوہ بھی یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیا کے ہر علم و فن کی معلومات کھپ سکتی ہیں
 کیونکہ بسا اوقات قرآن کریم ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرماتا ہے مگر اس میں حقائق و
 اسرار کی ایک غیر متناہی کائنات پوشیدہ ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-
 وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (ذاریات)

”اور تم اپنی جانوں میں غور کرو، کیا تم نہیں دیکھتے؟“
 Physiology اور ہم اپنی جانوں میں غور کرو، کیا تم نہیں دیکھتے؟“
 غور فرمائیے کہ اس مختصر سے جملے کی تشریح و تفصیل میں پورا علم الابدال ()
 اور پورا علم نفسیات (Psychology) سما جاتا ہے، اس کے باوجود یہ
 نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی تخلیقی حکمت بالغہ کے جن اسرار کی نظر
 اشارہ فرمایا ہے وہ سب پورے ہو گئے، میں، چنانچہ تفسیر کے اس ذیلی جسٹ میں عقل و تدبیر
 تجربات و مشاہدات کے ذریعے انتہائی متنوع مضامین شامل ہو جاتے ہیں،

تفسیر اور تاویل؛

قدیم زمانے میں ”تفسیر“ کے لئے ایک اور لفظ ”تاویل“ بھی بکثرت استعمال ہوتا
 تھا اور خود قرآن کریم نے بھی اپنی تفسیر کے لئے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، ”وَمَا يَحْكُمُ
 تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ اس لئے بعد کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا یہ دونوں لفظ بالکل
 ہم معنی ہیں، یا ان میں کچھ فرق ہے؟

امام ابو عبیدہ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ بالکل مراد ہیں اور دوسرے

حضرات نے ان دونوں میں فرق بیان کرنے کی کوشش کی، لیکن دونوں میں فرق بتانے کے لئے اتنی مختلف آراء ظاہر کی گئی ہیں کہ ان سب کو نقل کرنا بھی مشکل ہے، مثلاً چند اقوال یہ ہیں:-

- ۱- "تفسیر" ایک لفظ کی انفرادی تشریح کا نام ہے، اور "تاویل" جملے کی مجموعی تشریح کا،
- ۲- "تفسیر" الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور "تاویل" اصل مراد کی توضیح کو،
- ۳- "تفسیر" اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال نہ ہو، اور "تاویل" کا مطلب یہ ہے کہ آیت کی جو مختلف تشریحات ممکن ہیں ان میں سے کسی ایک کو دلیل کے ساتھ اختیار کر لیا جائے،

۴- "تفسیر" یقین کے ساتھ تشریح کرنے کو کہا جاتا ہے، اور "تاویل" تردد کے ساتھ تشریح کرنے کو،

۵- "تفسیر" الفاظ کا مفہوم بیان کر دینے کا نام ہے، اور "تاویل" اس مفہوم سے نکلنے والے سبق اور نتائج کی توضیح کا، وغیرہ وغیرہ،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابو عبیدہ ہی کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، کہ ان دونوں لفظوں میں استعمال کے لحاظ سے کوئی حقیقی فرق نہیں، جن حضرات نے فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے شدید اختلاف آراء پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی معین اور اتفاقی اصطلاح نہیں بن سکی، اگر ان میں حقیقہً فترق ہوتا تو ایسے شدید اختلاف کے کوئی معنی نہیں تھے واقعہً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل علم نے "تفسیر" اور "تاویل" کو الگ الگ اصطلاحات قرار دینے کی کوشش کی ہوگی، لیکن اس میں ایسا اختلاف رونما ہوا کہ کوئی بھی اصطلاح عالمگیر قبولیت حاصل نہ کر سکی، یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے مفسرین ان الفاظ کے ساتھ عموماً ہم معنی الفاظ کا سا معاملہ کرتے آئے ہیں، اور ایک کو دوسرے کی جگہ بلا تکلف استعمال کیا جاتا رہا ہے، لہذا اس بحث میں وقت کھپانے کی ضرورت نہیں ہے،

تفسیر کے مآخذ

”علم تفسیر“ کے اس مختصر تعارف کے بعد سب سے ضروری بحث یہ ہوگی کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا ہیں؟ یعنی وہ کیا ذرائع ہیں جن سے ہم کسی آیت کی تفسیر معلوم کر سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہے، سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ آیات قرآنی دو قسم کی ہیں، بعض آیات تو اتنی صاف، واضح اور آسان ہیں کہ جو زبان جاننے والا انھیں پڑھے گا، اُن کا مطلب فوراً سمجھ میں آجائے گا، اسی لئے ایسی آیتوں کی تفسیر میں کسی اختلاف رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسی آیات کی تفسیر کا مآخذ تو صرف لغت عرب ہے، عربی زبان پر ماہرانہ نظر اور عقل سلیم کے سوا اُن کا مطلب سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن دو قسمی قسم اُن آیات کی ہے جن میں کوئی اجمال، ابہام، یا تشریحی دشواری پائی جاتی ہے، یا اُن کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اُن کے پورے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یا اُن سے دقیق قانونی مسائل یا گہرے اسرار و معارف مستنبط ہوتے ہیں، ایسی آیات کی تشریح کے لئے محض زبان دانی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے بہت سی معلومات کی ضرورت ہے، آگے اسی قسم کی آیات کی تفسیر کے مآخذ بیان کئے جا رہے ہیں :-

اس لحاظ سے تفسیر قرآن کے کل کچھ مآخذ ہیں: خود قرآن کریم، احادیث نبویہ، صحابہ کرام کے اقوال، تابعین کے اقوال، لغت عرب اور عقل سلیم، ذیل میں ان تمام مآخذ کی تھوڑی سی تفصیل اور علم تفسیر میں اُن کے مقام کے بارے میں چند مباحث پیش خدمت ہیں :-

لہ والحق ان علم تفسیر منہ ما یوقف علی النقل... ومنہ ما لا یوقف علیہ (البرہان للزرکشی)؛
ص ۱، ج ۲، فرع ۲، فصل، بعد کلام الصوفیہ فی القرآن، والاتقان، ص ۸۳، ج ۲، فرع ۲،
آخر کلام علی تفسیر بالرأی

پہلا ماخذ، خود قرآن کریم

تفسیر قرآن کا پہلا ماخذ خود قرآن کریم ہے، یعنی اُس کی آیات بعض اوقات ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتی ہیں، ایک جگہ کوئی بات مبہم انداز میں کہی جاتی ہے، اور دوسری جگہ اس ابہام کو رفع کر دیا جاتا ہے، مثلاً سورۃ فاتحہ میں ارشاد ہے :-

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ
أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، (الفاتحہ)

”ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کیجئے، اُن لوگوں کے راستے کی جن پر

آپ نے انعام فرمایا“

یہاں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے، اُن سے کون لوگ مراد ہیں؟ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے :-

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ
وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۝ (نساء: ۶۹)
”یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین،
شہداء اور نیک لوگ“

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے :-

فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۝ (البقرہ: ۱۳)
”بس آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ نے اُن کی توبہ
قبول کر لی“

لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کلمات کیا تھے؟ دوسری جگہ ان کلمات کی وضاحت فرمادی گئی، ارشاد ہے :-

فَاذْرَبْنَا ظِلْمَنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ وَكُنْ حَمِيًّا
فَلَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (اعراف: ۲۳)

”انہوں نے (آدم وحوئے) کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ کی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے“

نیز ایک مقام پر ارشاد ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝ (التوبہ: ۱۱۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ“

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ ”سچے لوگوں“ سے کون مراد ہیں؟ لیکن ایک دوسری آیت میں

اس کی تشریح فرمادی گئی ہے، ارشاد ہے :-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآلَمَلَ سَكَّةً
وَأَلْيَحْتَبِ وَالنَّيِّتِينَ ۝ وَالَّذِي الْمَالِ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۝ وَالسَّاعِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۝ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا
عَاهَدُوا ۝ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالصَّرَآءِ وَحِينَ الْبَأْسِ
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۝ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝

(البقرہ: ۱۷۷)

”کچھ ساری نیکی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو، لیکن (اصلی) نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے، اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں یا غلاموں کی) گردن چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی کرتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں، اور صبر کرنے والے ہوں، تنگدستی میں اور بیماری میں اور جنگ کے وقت، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور یہی لوگ جو تقی ہیں۔“

اس آیت نے یہ بات واضح فرمادی کہ ”صادقین“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں، یہ صرف تین مثالیں تھیں، قرآن کریم میں اس قسم کی بہت سی آیات موجود ہیں،

۱۔ ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کی دوسری شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی بات اس کی ایک قرارت میں مبہم ہوتی ہے اور دوسری قرارت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، مثلاً ایک قرارت میں وضو کا طریقہ بیان فرماتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَاغْسِلُوا وُجُوْهُكُمْ وَايْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ
اَمْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ط (المائدہ: ۶)

عربی گرامر کی رُو سے اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:-

”تم اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لو، اور اپنے سروں کا

مسح کر لو، اور پاؤں دھو لو،

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:-

”اپنے سروں کا اور پاؤں کا مسح کرو“

لیکن دوسری قرارت میں ”وَاَرْجُلَكُمْ“ کے بجائے ”وَاَرْجُلِكُمْ“ آیا ہے، اس قرارت میں اس کے سوا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا کہ ”اپنے پاؤں دھو لو“ لہذا اس قرارت نے یہ واضح کر دیا کہ پہلی قرارت میں بھی پاؤں دھونے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور اس میں مسح کرنے کا جو ترجمہ ہو سکتا ہے وہ مراد نہیں ہے،

اس طرح متواتر قرارتوں کی روشنی میں فترآن کریم کی جو تفسیر کی جائے وہ یقینی اور قطعی ہوتی ہے، مشہور فتراتوں سے اگرچہ علم یقینی تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن تفسیر میں اُن کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن شاذ فتراتوں کے بارے میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، بعض حضرات انھیں تفسیر میں کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور بعض حضرات انھیں ”خبر واحد“ کے درجے میں قبول کرتے ہیں، اس مسئلے کی پوری تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے،

۳۔ ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کی تیسری صورت یہ ہو کہ جس آیت کی تفسیر مطلوب ہے خود اسی کے سیاق و سباق (Context) پر غور کیا جائے، اس طرح بسا اوقات آیت کے کسی حل طلب مسئلے کی تشریح واضح ہو جاتی ہے، مثلاً سورۃ احزاب میں آیتوں کے مواضع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ
الْأُولَىٰ، (الاحزاب: ۳۳)

”اور تم اپنے گھروں میں فترار سے رہو، اور قدیم زمانہ جاہلیت کے

دستور کے مطابق بے پردہ مت بھرد“

بعض اصول شرعیہ سے ناواقف لوگوں نے یہ دیکھ کر یہاں خطاب ازواجِ مطہرات کو ہو رہا ہے، یہ دعویٰ کر دیا کہ پردے کا یہ حکم صرف ازواجِ مطہرات ہی کے ساتھ مخصوص تھا عام عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لیکن قرآن کریم کا سیاق و سباق اس دعویٰ کی تردید کر رہا ہے، اسی آیت کے آگے اور پیچھے ازواجِ مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی کئی احکام مذکور ہیں، اور وہ یہ کہ:- بولنے میں نزاکت سے کام نہ لو، نیک بات کہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، ان احکام میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی معقول آدمی یہ کہہ سکے کہ یہ صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسری عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لہذا ان بہت سے احکام کے بیچ میں سے صرف ایک جملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ عام عورتوں کے لئے نہیں ہے، دوسری آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ وغیرہ کے علاوہ قرآن کریم کے سیاق و سباق کے بھی بالکل خلاف ہی حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے احکام تمام مسلمان عورتوں کے لئے ہیں، اور یہاں خاص طور سے ازواجِ مطہرات کو خطاب صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ ان پر احکام شرعیہ کی ذمہ داری زیادہ ہے، انھیں ان احکام کا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے، اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَإِذَا سَأَلَكَ الْمُؤْمِنُونَ مَتَاعًا فَسَلِّهِمْ مِنْ ذُرِّ عِلْمِكَ وَالْأَنْزَابِ: ۵۳

”اور (اے مسلمانو!) جب تم ان (ازواجِ مطہرات) سے کوئی سامان

مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے طلب کرو“

اس آیت کے بارے میں بعض ناواقف لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے، حالانکہ اسی آیت کا اگلا جملہ وضاحت کر رہا ہے کہ اس حکم کا اطلاق تمام عورتوں پر ہوتا ہے، ارشاد ہے:-

ذُكْمُ أَطْفَرٍ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ط (الاحزاب: ۵۳)

”یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لئے بھی اور ان کے دلوں

کے لئے بھی زیادہ پاکیزگی کا سبب ہے“

اب ظاہر ہے کہ دلوں کی پاکیزگی صرف ازواجِ مطہرات ہی کے لئے مطلوب نہیں، بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے مطلوب ہے، اس لئے آیت کے حکم کو کچھ خاص عورتوں میں منحصر کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

اسی طرح سورۃ احزاب ہی میں ارشاد ہے:-

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ

الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ط (الاحزاب: ۳۳)

”اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے گندگی کو دور کر دے

اور تم کو خوب اچھی طرح پاک کر دے“

بعض لوگوں نے اس آیت کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ ”اہل بیت“ سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد وغیرہ ہیں، ازواجِ مطہرات اس میں داخل نہیں لیکن قرآن کریم کا سیاق و سباق اس نظریہ کی واضح تردید کرتا ہے، کیونکہ اس آیت کے آگے اور پیچھے تمام تر خطاب ازواجِ مطہرات کو ہو رہا ہے، اس لئے یہ کیسے

لہ پردے کے حکم کے عام ہونے پر اور بھی بہت سے واضح دلائل ہیں، یہاں بطور مثال

صرف سیاق و سباق کو پیش کیا گیا ہے،

ممكن ہے کہ وہ "اہل بیت" کے مفہوم میں داخل نہ ہوں! خاص طور سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:-

وَاذْكُرْنَ مَا يُكَلِّمُنِي فِي بُيُوتِكُنَّ، (الاحزاب: ۳۴)

اور راتے از راجہ نجی، تھامے گھروں میں جو تلاوت ہوتی ہے اُسے یاد کرو!

اس میں لفظ "بیوت" نے واضح کر دیا کہ پچھلی آیت میں "أَهْلَ الْبَيْتِ" کے مفہوم میں ازواجِ مطہرات تو سب سے پہلے داخل ہیں، انھیں اس آیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا یہ صرف چند مثالیں تھیں، ورنہ قرآن کریم پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر کے بہت سے حل طلب مسائل سیاق و سباق کو دیکھ کر حل ہو جاتے ہیں، البتہ کبھی سیاق و سباق سے آیت کی تفسیر اتنی واضح ہو جاتی ہے کہ اُسے کوئی بھی معقولیت پسند آدمی رد نہیں کر سکتا، ایسی تفسیر قطعی اور یقینی ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ سیاق و سباق کی مدد سے جو تفسیر کی جاتی ہے وہ اتنی واضح نہیں ہوتی، چنانچہ اُسے قبول کرنے یا رد کرنے میں مجتہد علماء کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں،

یہ "تفسیر القرآن بالقرآن" کا اجلی تعارف تھا، بعض حضرات نے ایسی پوری تفسیر بھی لکھی ہے جن میں ہر آیت کی تفسیر کسی دوسری آیت سے کرنے کا التزام کیا گیا ہے، اس قسم کی ایک تفسیر علامہ ابن جوزی نے لکھی ہے، اور علامہ سیوطی نے الاتقان میں اس کا ذکر کیا ہے،

اسی نوعیت کی ایک گرانقدر کتاب مدینہ طیبہ کے ایک عالم شیخ محمد امین بن محمد حنفی شفیعی (رحمۃ اللہ علیہ) نے چند سال پہلے تالیف کی ہے، جو "أضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے تفسیر القرآن بالقرآن کی مختلف صورتیں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہیں،

۱۵ الاتقان، ص ۱۰۵، ج ۲، فورع ۲۷،

۱۶ أضواء البیان، ص ۲۷ تا ۳۰، ج ۱، مطبوعہ دارالاصغفانی، جده ۱۳۷۸ھ،

دوسرا ماخذ، احادیث نبویؐ

تفسیر قرآن کا دوسرا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ واضح فرمایا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد یہی تھا کہ آپ اپنے قول و فعل سے آیاتِ قرآنی کی تفسیر فرمائیں چنانچہ سورۃ نحل میں ارشاد ہے:-

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ
إِلَيْهِمْ، (النحل: ۱۰۴)

اُدھر ہم نے قرآن آپ پر اسی لئے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ آپ کا مقصدِ بعثت یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی توضیح فرمائیں، نیز ارشاد ہے:-

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (آل عمران: ۱۶۴)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا، جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک و صاف بنائے، اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت کی تعلیم دے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔“

نیز سورۃ نسا میں ارشاد ہے:-

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ
بِمَا أَرَادَ اللَّهُ، (نسا: ۱۰۵)

”بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ آپ، لوگوں کو

درمیان ان رہنمائیوں کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہیں اور سورۃ نحل میں ارشاد ہے :-

وَمَا آتَيْنَاكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي
اخْتَلَفُوا فِيهِ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں اتاری مگر اس لئے کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کھول کر بتادیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور تاکہ یہ کتاب ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت کا سبب ہو۔

ان آیات میں خود قرآن کریم نے یہ واضح فرمادیا ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بعوث فرمانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ دنیا کو قرآن کریم کی ہدایات اور اس کے اسرار و معارف سے آگاہ کریں، اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقے سکھلائیں، اس لئے خود قرآن کریم ہی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات تفسیر قرآن کا اہم ترین ماخذ ہیں،

یوں بھی اس بات کے لئے بسی چوڑی منطق کی ضرورت نہیں کہ کسی آسمانی کتاب کی صحیح تشریح اس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے جس پر وہ کتاب نازل ہوئی، اس دنیا میں اس سے بڑا الحق کوئی نہیں ہو سکتا، جو یہ کہے کہ قرآن کریم نازل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا، لیکن اس کی تفسیر میں زیادہ جانتا ہوں،

بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت تو مسلم ہے، مگر چونکہ وہ ارشادات ہم تک قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچے، اس لئے ہم ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے،

لیکن اس مغالطہ کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معلم بنا کر بھیجا اور بار بار یہ واضح فرمایا کہ آپ کو کتاب اللہ کی تشریح و توضیح کے لئے بھیجا جا رہا ہے، اس لئے قیامت تک تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ آپ کی تعلیمات کی پیروی کریں، اور دوسری آپ کی تعلیمات و تشریحات کو قیامت

تک باقی رکھنے کا کوئی محفوظ انتظام نہیں فرمایا، کیلئے بات کوئی ایسا شخص کہہ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ پر ایمان رکھتا ہو؟ اور جس نے قرآن کریم میں یہ آیت پڑھی ہو کہ:-

لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وِشْعَهَا،

اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے باہر کام

کا مکلف نہیں کرتا۔

بعض لوگ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے لئے تو معلمِ قرآن تھے، لیکن ہمارے زمانے میں دعا اللہ آپ کی تعلیمات کی ضرورت نہیں رہی، لیکن اس بے محلی بات کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ صحابہؓ کرامؓ جن کی مادری زبان عربی تھی جو اس کے ایک ایک لفظ کا لغوی اور محاوراتی معنی جانتے تھے، جو نزولِ قرآن کے پورے ماحول سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ اس سے عملاً گزر رہے تھے، اور جو ایک ایک آیت کے پورے پس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، انھیں تو کسی پیغمبر کی تعلیم کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا تھا اور ان کے مقابلہ میں اس زمانے کے لوگ جن کی نہ مادری زبان عربی ہے، نہ نزولِ قرآن کا ماحول سامنے ہے اور نہ اس کے پس منظر سے آگاہ ہیں ان کو قرآن کریم کی تفسیر جاننے کے لئے کسی پیغمبر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں؟ اگر ذہن میں عقل و خرد اور دل میں عدل و انصاف کی ادنیٰ ترین باقی ہو تو اس بے سرو پا بات کو کون باور کر سکتا ہے؟

یہ ایک بڑا مفصل موضوع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں وہ کتنے قابلِ اعتماد ہیں؟ اس موضوع کی تحقیق کے لئے علمِ حدیث اور اسماہ الرجال کے پورے کتب خانے موجود ہیں، اور اپنی نفسانی خواہشات کے لئے زبردستی شرعی جواز ڈھونڈنے کی بات تو الگ ہی، لیکن اگر تجھے دل ان علوم کا مطالعہ کیا جائے تو انسان اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو یوں ہی رہتی دنیا تک واجبِ الاتباع قرار نہیں دیا بلکہ انکی

حفاظت کا انتظام فرمایا ہے کہ اس کی تفصیلات دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے، حدیث کے دوسرے شاخ در شاخ علوم کو چھوڑ کر صرف ایک اسماء الرجال کے علم ہی کو دیکھ لیجئے تو وہ اس امت کا ایسا قابل فخر اور محیر العقول کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمارے زمانے تک جو کسی شخص نے کوئی حدیث کہیں بیان کی ہے، اس علم کی کتابوں میں اس کا پورا کچھ چٹھا وضاحت کے ساتھ موجود ہے، کہ وہ کہاں پیدا ہوا؟ کس کس سے احادیث کا علم حاصل کیا؟ کن کن راویوں سے اس کی ملاقات ہوئی؟ اس کا عام کردار کیسا تھا؟ قوتِ حافظہ کس درجہ کی تھی؟ روایت بیان کرتے ہوئے احتیاط کو کس حد تک مد نظر رکھتا تھا؟ اُس کے ہم عصر اور بعد کے علماء نے اس کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی ہے؟ آج بھی حدیث کی کسی کتاب میں جس حدیث کے جس راوی کا نام چاہئے نکال لیجئے، اسماء الرجال کی کتابوں میں اُس کے متعلق مذکورہ بالا سوالات کا جواب مل جائے گا،

یہاں حدیث کی حفاظت کے موضوع پر کوئی مفصل بحث پیش نظر نہیں، اس کے لئے تدریس حدیث پر لکھی ہوئی بہت سی مبسوط کتابیں موجود ہیں، لیکن یہاں ضرورتاً اشارہ کرنا مقصود تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے انکار و اعراض ایک ایسا طرز عمل ہے جس پر قرآن کریم، عقل عام اور واقعات تاریخ کسی بھی اعتبار سے غور کیے نتیجہ ہمیشہ یہی نکلے گا، کہ اس کی بنیاد میں عقولیت کا کوئی چھینٹا بھی نہیں پڑا،

البتہ یہ درست ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات ملتی ہیں، لہذا جو روایت جہاں مل جائے اُسے پڑھ کر کوئی فیصلہ کر لینا درست نہیں، بلکہ اصول حدیث کے مطابق اُسے اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے، کہ وہ ان اصولوں پر پوری اُترتی ہے یا نہیں، خاص طور سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں اُن کی چھان بھٹک اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ بیشتر مفسرین نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں صرف جمع کر دی ہیں، محدثانہ طریقے پر اُن کی تحقیق و تفتیش کی بحث کو نہیں

چھیڑا، لہذا ان روایات سے ٹھیک ٹھیک استفادہ وہی شخص کر سکتا ہے جو علم حدیث اور اس کے تعلقات پر ماہرانہ نگاہ رکھتا ہو، اور جسے صحیح و سقیم روایات کو پرکھنے کے اصول معلوم ہو،

تیسرا ماخذ، اقوال صحابہ رضی

جن حضرات نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی وہ صحابہ کرامؓ ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اپنی پوری زندگیوں اسی کام کے لئے وقف کی ہوئی تھیں کہ قرآن کریم، اُس کی تفسیر، اور تعلقات کو براہ راست آپ کے اقوال و افعال سے حاصل کریں، یہ حضرات اہل زبان بھی تھے، اور نزول قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپ سے پڑھا، امام ابو عبد الرحمن سلمیٰ مشہور تابعی عالم ہیں وہ فرماتے ہیں:-

حَدَّثَنَا الدِّينُ كَاوُالْبِقْرَاءُ وَوَدَّ النُّقْرَانُ كَعُمَّانَ بْنِ عَفَّانٍ وَ
عَبْدَ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَعَنْهُمْ أَهْمُ كَاوُالْبِقْرَاءُ إِذَا تَعَلَّمُوا مِنَ
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ آيَاتٍ لَمْ يَنْجَاوِرُوا حَاشِي
يَعْلَمُوا مَا فِيهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ ۝

(صحابہ کرامؓ میں سے) جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپ سے دس آیتیں سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، جب تک کہ ان آیتوں کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم حاصل نہ کر لیں،

اسی لئے مسند احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں:-

كَانَ الرَّجُلُ إِذَا قَرَأَ الْبَقْرَةَ وَالْإِنشِرَاءَ حَبْدًا فِي رَأْسِهِ ۝

جب کوئی شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہ بہت قابل احترام ہو جاتا تھا۔

اور موطا امام مالک میں روایت ہے کہ :-

أَقَامَ ابْنُ عُمَرَ عَلَى حِفْظِ الْبَقَرَةِ شَتَانَ سِنِينَ،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ آٹھ سال تک صرف سورہ بقرہ یاد کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ایسے ضعیف الحافظہ نہیں تھے کہ سورہ بقرہ کے محض الفاظ یاد کرنے میں اُن کے آٹھ سال خرچ ہو جائیں، یقیناً یہ مدت اسی لئے صرف ہوئی کہ وہ الفاظِ قرآنی کو یاد کرنے کے ساتھ اس کی تفسیر اور جملہ متعلقات کا علم حاصل کر رہے؛ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں :-

وَالَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ مَا نَزَلَتْ آيَةٌ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ إِلَّا وَآتَا
أَعْلَمَهُ فِيمَنْ نَزَلَتْ وَآيُنَ نَزَلَتْ، وَلَوْ أَعْلَمُوا أَحَدًا أَعْلَمَ
بِكِتَابِ اللَّهِ مِنِّي تَنَالَهُ النَّطَايَا لَا تَيْتُهُ يَلَهُ

”اُس ذات کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی جس کے بائے میں مجھ سے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بائے میں اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھ سے کسی ایسے شخص کا پتہ چلے جو کتاب اللہ کے بائے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہو اور ساریاں اُس کے پاس پہنچا سکتی ہوں تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا“

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احایث کے بعد تفسیر قرآن کا تیسرا اہم ماخذ اُن صحابہ کرام کے اقوال ہیں جنہوں نے اس محنت و جانفشانی سے قرآن کریم کی تفسیر سیکھی تھی، لیکن یہاں بھی چند امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے :-

۱۔ صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال میں بھی صحیح و سقیم طرح کی روایتیں ملتی ہیں

ہذا ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اصول حدیث کے مطابق ان کی جانچ پڑتال ضروری ہے،

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اُس وقت حجت ہوں گے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کی کوئی صریح تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو، اگر آپ کی بیان فرمودہ کوئی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی حیثیت محض تائیدی ہوگی، اور اگر کوئی قول آپ کی بیان فرمودہ تفسیر کے معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا،

۳۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفسیر مستند روایات میں منقول نہ ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کی ہوئی تفسیروں میں کوئی اختلاف نہ ہو وہاں انہی کے اقوال کو اختیار کیا جائے گا،

۴۔ جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ تفسیروں میں کوئی اختلاف ہو وہاں اول تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان مختلف اقوال میں کوئی ہم آہنگی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم آہنگی ہو سکتی ہے تو اسی پر عمل کیا جائے گا، اور اگر اختلاف ناقابل تطبیق ہو تو ایک مجتہد جس قول کو دلائل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط پایا اُسے اختیار کر سکتا ہے،

چوتھا مأخذ، تابعین کے اقوال

تابعین سے مراد وہ حضرات ہیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا، اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ تفسیر میں تابعین کے اقوال حجت ہیں یا نہیں؟ حافظ ابن کثیر نے اس سلسلے میں بہترین محاکمہ کیا ہے، اُن کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ تابعی اگر کوئی تفسیر کسی صحابی سے نقل کر رہا ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر کا ہے، اور اگر خود اپنا قول بیان کرے تو یہ دیکھا جائے گا کہ در سکر کسی تابعی کا قول اس کے خلاف

یا نہیں؟ اگر کوئی قول اس کے خلاف موجود ہو تو اس وقت تابعی کا قول حجت نہیں ہوگا بلکہ اس آیت کی تفسیر کے لئے قرآن کریم، لغت عرب، احادیث نبویہ، آثار صحابہؓ اور دوسرے شرعی دلائل پر غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے گا، اور اگر تابعین کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو تو اس صورت میں بلاشبہ اُن کی تفسیر حجت اور واجب التبع ہوگی۔

پانچواں مأخذ، لغت عرب

پہچھے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کا مفہوم بدیہی طور پر واضح ہو، اور جس کے مفہوم میں کوئی الجھن، اشتباہ یا ابہام و اجمال نہ ہو، اور نہ اُسے سمجھنے کے لئے کسی تاریخی پس منظر کو جاننے کی ضرورت ہو، وہاں تو عربی لغت ہی تفسیر کا داسد مأخذ ہے، لیکن جہاں کوئی ابہام و اجمال پایا جا رہا ہو، یا جو آیت کسی واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہو یا اس سے فقہی احکام مستنبط کئے جا رہے ہوں، وہاں محض لغت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں تفسیر کی اصل بنیاد تو خود قرآن کریم، سنت نبویہؐ اور آثار صحابہؓ و تابعینؒ پر ہوگی، لیکن ان مأخذ کے بعد لغت عرب کو بھی سنا رکھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے، اور اس میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور ایک ایک جملے کے متعدد معنی ہو سکتے ہیں، لہذا صرف لغت کی بنیاد پر ان میں سے کوئی مفہوم معین کرنا مغالطوں کا سبب بن جاتا ہے، اسی بنا پر بعض حضرات نے "مطلق لغت" کو مستقیل مأخذ بنانے سے ہی انکار کیا ہے، بلکہ امام محمدؒ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ لغت کے ذریعے قرآن کریم کی تفسیر کو مکر وہ قرار دیتے تھے، لیکن علامہ زکریاؒ فرماتے ہیں کہ اُن کا مقصد تفسیر میں لغت کو بالکل نظر انداز کرنا نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ کسی آیت کے ظاہر اور متبادر معنی کو چھوڑ کر ایسے معانی بیان کرنا ممنوع ہے، جو قلیل الاستعمال اور درواز کار لغوی

تحقیقات پر مبنی ہوں، ظاہر ہے کہ قرآن کریم عرب کے عام محاورات کے مطابق نازل ہوا ہے، لہذا جس جگہ قرآن و سنت یا آثارِ صحابہؓ میں کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو، وہاں آیت کی وہ تفسیر کی جائے گی جو اہل عرب کے عمومی محاورات میں متبادر طور پر سمجھی جاتی ہو، ایسے مواقع پر اشعار عربیہ استدلال کر کے کوئی ایسے قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا بالکل غلط ہے جو لغت کی کتابوں میں تو لکھے ہوئے ہیں، لیکن عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے، اس کو ایک واضح مثال سے سمجھئے، قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے پانی کی فرمائش کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ:-

وَاصْرِبْ يَ تَعْصَاكُ اِنَّحَجْرًا ،

”اور اپنی لاشی کو پتھر پر مارو،“

یہ جملہ کسی زبان جاننے والے کے سامنے..... بولا جائے گا وہ صراحتاً اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ لاشی کو پتھر پر مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے، چنانچہ اس جملے کی یہی تفسیر صحیح اور معتبر ہے، لیکن سرسید احمد خان صاحب نے لغت کے دوران کارحوالوں کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ اس جملے کا مطلب یہ ہو کہ ”لا لاشی کے بہارے اس چٹان پر چلو“ اس میں اصْرِبْ کے معنی ”مارو“ کے بجائے ”چلو“ اور العَجْر کے معنی (پتھر) کے بجائے ”چٹان“ بیان کرنا ایک ایسی بُر دستی ہے جس کی تائید میں اگر لغت کی کتابوں کا کوئی ایک آدھا حوالہ مل بھی جائے تو عام محاورات عرب اس کی بالکل تردید کرتے ہیں،

لہ البرہان، ص ۱۶۰ ج ۲، نور ۴، اہمات ماخذ لتفسیر،

لہ تفسیر القرآن، از سرسید احمد خان صاحب، ص ۹۱ ج ۱، مطبوعہ لاہور،

لہ یہاں ہم نے سرسید صاحب کے بیان کئے ہوئے اس معنی کو بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ درحقیقت انکی بیان کی ہوئی اس تشریح کی کسی لغت سے بھی تائید نہیں ہوتی، اور لغت کے اعتبار سے بھی اس میں چند حوالہ غلطیاں ہیں، مثلاً ”صْرِبْ“ جب چلنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے ساتھ ”فِي“ ضرور ہوتا ہے جیسے

وَاصْرِبْ فِي الْمَاءِ حِينَ ”اور یہاں ”فِي“ نہیں ہے،

امام احمد نے لغت کے ذریعے اسی قسم کی تفسیریں بیان کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ لغت سے اس طرح کا کام لینے کو کوئی بھی عقل و انصاف رکھنے والا شخص درست نہیں کہہ سکتا،

چھٹا ماخذ، عقلِ سلیم

عقلِ سلیم کی ضرورت یوں تو دنیا کے ہر کام کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ پچھلے چار ماخذ سے استفادہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں، لیکن یہاں اس کو ایک مستقل ماخذ کے طور پر ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فترانِ کریم کے اسرار و معارف ایک ناپیدا کنار سمندر کی حیثیت رکھتے ہیں، مذکورہ بالا پانچ ماخذ کے ذریعے اس کے مضامین کو بقدر ضرورت تو سمجھا جا چکے ہیں، لیکن جہاں تک اس کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف کا تعلق ہے اُن کے بارے میں کسی بھی دور میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب اُن کی انتہا ہو گئی ہے، اور اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے بجائے واقعہ یہ ہے کہ فترانِ کریم کے ان حقائق و اسرار پر غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے اور جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم و عقل اور خشیت اور انابت کی دولت سے نوازا ہو وہ تدریج کے ذریعے نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، چنانچہ ہر دور کے مفسرین اپنی اپنی فہم کے مطابق اس باب میں اضافہ کرتے آئے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کی دعاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے فرمائی تھی :-

اللَّهُمَّ عَلِّمْنَا التَّأْوِيلَ وَفَقِّهْنَا فِي السِّيَرِ ۝

یا اللہ اس کو تفسیر کا علم اور دین میں سمجھ عطا فرما ۝

لیکن اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس طرح عقل و فہم سے مستنبط کئے ہوئے وہی حقائق و اسرار معتبر ہیں جو دوسرے شرعی اصول اور مذکورہ بالا پانچ ماخذ سے متصادم نہ ہوں اور اگر اصول شرعیہ کو توڑ کر کوئی نکتہ بیان کیا جاتا تو اس کی دین میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے،

۲۲۲

تفسیر کے ناقابل اعتبار مآخذ

تفسیر قرآن کے معتبر اور مستند مآخذ معلوم کرنے کے بعد ان ناقابل اعتبار مآخذ کی نشاں دہی بھی ضروری ہے جنہیں بعض لوگ تفسیر کی بنیاد قرار دے کر غلط فہمیوں، بلکہ بعض اوقات گمراہیوں کا شکار ہو جاتے ہیں:-

۱۔ اسرائیلی روایات

”اسرائیلیات“ یا ”اسرائیلی روایات“ ان روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں، یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے بعض براہ راست بائبل یا تلمود سے لی گئی ہیں، بعض مشنا اور ان کی تشریح سے، اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں، اور عرب کے یہود و نصاریٰ میں معروف و مشہور تھیں، تفسیر کی مراد جمہور کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، ان روایات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحب تفسیر حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم علیحدہ ہے؛

۱۔ پہلی قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہو چکی ہے

مثلاً فرعون کا غرق ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادو گروں سے مقابلہ، آپ کا کوہ طور پر جانا وغیرہ، ایسی روایات اس لئے قابل اعتبار ہیں کہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے ان کی تصدیق کر دی ہے،

(۲) دوسری قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، مثلاً یہ کہانی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذ اللہ) بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے، یہ روایت اس لئے قطعاً باطل ہے کہ قرآن کریم نے صراحتاً اس کی تردید فرمائی ہے، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ من گھڑت کہانی کہ آپ (معاذ اللہ) اپنے سپہ سالار اور یا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے،

۳۔ تیسری قسم ان اسرائیلیات کی ہے جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹی ہیں، مثلاً تورات کے احکام وغیرہ، ایسی اسرائیلیات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے:-

لَا تُصَدِّقُوا هَؤُلَاءِ وَلَا تُنْكِرُوا بُرْهَانَهُمْ،

”نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب“

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے، لیکن نہ ان پر کسی دینی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، اور نہ ان کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے، اور اس قسم کی روایا بیان کرنا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ خود... قرآن کریم نے سورہ کہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟ ارشاد ہے:-

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَأَيْتُمْ كَلْبَهُمْ، وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ

۱۔ بائبل، کتاب سلاطین اول ۱۱: ۲ تا ۱۳: ۱۳ ایضاً ۲۔ سوتیل ۱۳: ۱۱،

۳۔ تفسیر ابن کثیر، مقدمہ ص ۲۷ ج ۱ و اصول التفسیر لابن تیمیہ ص ۳۳،

سَادِ سُهُمْ كَلْبَهُمْ رَجَمًا بِالْعَيْبِ، وَيَقُولُونَ سَبَّحَهُ وَقَاتَلَهُمْ
 كَلْبَهُمْ، قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعِبَابِهِمْ مِمَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۝
 فَلَا تُنَارِفْ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءَ ظَاهِرٍ أَوْ لَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

صحابی کہتے ہیں کہ بعض اہل کتاب کہیں گے کہ وہ تین ہیں اور
 چوتھا ان کا کتابہ، اور بعض کہیں گے کہ پانچ ہیں، چھٹا ان کا کتابہ، یہ لوگ
 اٹھل پھول ہاتھ ہے ہیں، اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا
 کتابہ، آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے، ان کو بہت کم لوگ
 جانتے ہیں، سو آپ ان کے بارے میں مجسز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے، اور
 آپ ان کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی نہ پوچھئے ۝

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں اہل کتاب کی محنت و
 اسرائیلی روایات بیان فرمائی ہیں، اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کی طرت اشارہ
 فرما دیا ہے:-

۱۔ اسرائیلی روایات اور ان کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ

نے بیان فرمایا،

۲۔ ان میں سے جو روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں ان کے غلط ہونے پر تنبیہ بھی
 کر دینی چاہئے، جیسا کہ پہلے دو اقوال کو اللہ تعالیٰ نے ”رَجَمًا بِالْعَيْبِ“ کہہ کر رد فرمایا ہے۔
 ۳۔ جس روایت کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو، اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا
 چاہئے، جیسے کہ اللہ نے تیسری روایت پر سکوت اختیار فرمایا،

۴۔ ان روایات کے صدق و کذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہئے کہ حقیقی علم

اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،

۵۔ ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث و مباحثہ سے پرہیز کرنا چاہئے،

۶۔ ایسی روایات کی زیادہ تحقیق و تفتیش میں پڑنا بھی درست نہیں، کیونکہ ان سے

دنیا و آخرت کا کوئی قابل ذکر فائدہ متعلق نہیں،

پھر بعض روایات میں تو صراحت ہوتی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے، اور بعض روایات میں ایسی صراحت نہیں ہوتی، لیکن دو سکر دلائل کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے، کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے، تفسیر کی کتابوں میں جو روایات کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے مروی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے ان دونوں کا مختصر حال معلوم کر لینا بھی ضروری ہے،

کعب الاحبار کون تھے | کعب الاحبار کا پورا نام کعب بن ماتح حیمری ہے، اور وہ کعب الاحبار یا کعب الجمر کے لقب سے مشہور ہیں،

یہ یمن کے باشندے تھے، اور انھیں علمائے یہود میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، انھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مشرف باسلام نہ ہو سکے، ۳۳ھ میں حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے دوران یہ مدینہ طیبہ آئے اور مسلمان ہو گئے، طبقات ابن سعدؒ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے اُن سے پوچھا کہ ”تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیوں اسلام نہیں لائے؟“ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے تورات کا ایک نسخہ لکھ کر دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس پر عمل کرتے رہو، اور تورات کے علاوہ جتنی کتابیں تھیں انھیں بند کر کے اس پر ہرگز لگا دیں، تاکہ میں اُن کا مطالعہ نہ کروں، اور ساتھ ہی مجھ سے اپنے رشتہ ابوت کا واسطہ لے کر یہ عہد لیا تھا کہ میں یہ ہرگز نہ توڑوں، لیکن جب دین اسلام دنیا میں غالب ہونے لگا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے باپ نے مجھ سے کوئی علم چھپانے کی کوشش نہ کی ہو، چنانچہ میں نے ان کتابوں کی ہر توڑ دی، اور اُن کا مطالعہ کیا، تو اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کا تذکرہ مجھے ملا، اس لئے میں اب مسلمان ہو کر آیا ہوں ۱۱

۱۱ قال الکوفیؒ: ”دی سند ہذا الجرح حدیث مسلمة و ہو مختلط..... و فیہ ایضاً علی بن زید بن جردان ضعیف غیر

واحد (مقالات اکوثری ص ۳۲) و لکن جسنہ الحافظ فی الاصابۃ (۳: ۲۹۸)

کعب الاحبارؓ کو عام طور سے ثقہ قرار دیا گیا ہے، لیکن علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے بعض روایات کی بنا پر ان کے بارے میں کچھ شکوک و شبہات کا بھی اظہار کیا ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد اقصیٰ تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ ”مسجد کو صخرہ بیت المقدس کے آگے تعمیر کیا جائے یا پیچھے؟“ اس پر کعب الاحبارؓ نے مشورہ دیا کہ ”مسجد صخرہ کے پیچھے بنائی جائے“، یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، ”یہودی عورت کے بیٹے! تم پر یہودیت کا ابھی تک اثر ہے، میں تو مسجد کو صخرہ کے آگے بناؤں گا، تاکہ نماز میں صخرہ کا استقبال نہ کیا جائے“ علامہ زاہد کوثریؒ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد کعب احبار کے ذہن میں حضرت عمرؓ کے بارے میں کچھ رنجش رہی، یہاں تک کہ ان کا میل جول ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا جو حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی سازش میں ملوث تھے اور اس سے پہلے وہ اہل کتاب کی بعض کتابوں کے حوالے سے حضرت عمرؓ کو تینبہ کر چکے تھے کہ آپ کو کسی وقت قتل کیا جائے گا، ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد علامہ کوثریؒ لکھتے ہیں :-

”ان بکھرے ہوتے واقعات کو ملانے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عذیر رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ذرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عون بن مالکؓ اور حضرت معاذؓ کعب الاحبار پر پورا بھروسہ نہیں کرتے تھے“

علامہ کوثریؒ نے کعب الاحبار پر جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، اور مختلف صحابہؓ کے اقوال سے جو نتائج نکالے ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ ان کی بیشتر روایات اسرائیلی روایات ہیں، لہذا جب تک ان کی تصدیق خارجی دلائل سے نہ ہو جائے، اُس وقت تک ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا،

۱۰ مقالات الکوثریؒ ص ۳۳ و ۳۴، مقالہ: کعب الاحبار والاسرائیلیات“

۱۱ مصر کے محقق عالم ڈاکٹر رمزی نعتاً نے ان شکوک و شبہات کی مفصل اور مدلل تردید کی ہے، ملاحظہ ہو ان کی کتاب ”الاسرائیلیات و اثرها فی التفسیر“ ص ۴۲، تا ص ۸۳ مطبوعہ دارالانصاف بہرہ رسانی

وہب بن منبہ | دوسرے بزرگ جن سے بکثرت اسرائیلی روایات منقول ہیں وہب ابن منبہ (متوفی ۱۱۲ھ) ہیں، یہ بھی یمن کے علاقے صنعاء کے باشندے تھے، اور فارسی الاصل تھے، روایات کے مطابق یہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد منبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمان ہو چکے تھے، وہب بن منبہؓ عابد و زاہد تابعی تھے، اور انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ سے روایتیں لی ہیں، ان کے پاس علماء اہل کتاب کی روایات کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا، یہاں تک کہ وہ اس معاملے میں اپنے آپ کو حضرت عبداللہ ابن سلامؓ اور کعب الاحبار کے علوم کا جامع سمجھتے تھے، امام ابن سعدؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان روایات پر مشتمل ایک کتاب "احادیث الانبیاء" کے نام سے تالیف کی تھی، اور مسعودیؒ نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب "المبدأ" کے نام سے لکھی تھی، اور حاجی خلیفہؒ نے "کشف الظنون" میں شاید اسی کتاب کو "کتاب الاسرائیلیات" کے نام سے ذکر کیا ہے، نیز یاقوت الحمویؒ اور قاضی ابن خلکانؒ نے ان کی ایک اور کتاب کا تذکرہ کیا ہے، جس کا نام "ذکر الملوک المفتوحہ من حمیر و اخبار ہم وغیر ذلک" تھا، قاضی ابن خلکانؒ نے یہ کتاب خود دیکھی ہے،

جہاں تک وہب بن منبہؓ کے صدق اور امانت کا تعلق ہے اس کے بارے میں محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے کوئی کلام نہیں کیا، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: "وہ ثقہ اور سچے تھے، اور اسرائیلی کتابوں سے بکثرت نقل کرتے تھے" امام ابوزرعہؒ

۱۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۱۰۱ ج ۱

۲۔ مروج الذهب، ص ۱۱۲ ج ۵

۳۔ معجم الأدباء للحموی ص ۲۲۲ ج ۶، ووفیات الاعیان لابن خلکان ص ۱۸۰

اور امام نسائی نے انھیں ”ثقة“ قرار دیا ہے، امام عجل فرماتے ہیں: ”وہب ثقة تابعی تھے“ صرف امام عمرو بن علی الفلاس نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں وہب کے صدق و امانت میں کوئی شبہ تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہب ابتدائی قدرتیہ فرقہ کے عقائد کی طرف مائل تھے، لیکن امام احمد فرماتے ہیں کہ انھوں نے بعد میں اپنے اس عقیدے سے رجوع کر لیا تھا، اور ابوسنان نے خود وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے کہ میں پہلے قدری عقائد کا قائل تھا لیکن بعد میں میں نے ان سے رجوع کر لیا۔^۱

اس سے صاف واضح ہے کہ ائمہ جرح و تعدیل میں سے کسی نے بھی ان کی سچائی اور امانت و دیانت پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اسی بنا پر امام بخاری، اور امام مسلم دونوں نے اپنی اپنی صحیح میں ان کی روایات ذکر کی ہیں، لہذا جو روایات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگر ان کی سند اصول حدیث کی شرائط پر پوری اترتی ہو تو ان کو بلاشبہ قبول کیا جائے گا، البتہ زمانہ ماضی کے جو قصے اور زمانہ آئندہ کی جو خبریں انھوں نے بغیر کسی حوالے کے بیان کی ہیں وہ زیادہ تر اسرائیلی روایات ہیں جن کے بارے میں ہمیں حکم یہ ہے کہ ہم نہ ان کی تصدیق کریں اور نہ تکذیب، عہد حاضر کے بعض مصنفین مثلاً سید رشید رضا مرحوم وغیرہ نے ان کی عجیب و غریب اسرائیلی روایات کی بنا پر انھیں ضعیف قرار دیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کا محض بیان کرنا کوئی جرم نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان روایات پر کسی اسلامی عقیدے یا اسلامی حکم کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما | کتب الاحبار اور وہب بن منبہ تو تابعین میں سے ہیں، اور سب سے زیادہ اسرائیلی روایات انہی سے مروی ہیں، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ اسرائیلیات شاید حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما

لہ ہمدیہ الہمدیہ، ص ۱۶۸ ج ۱۱،

۱۵ سید رشید رضا مرحوم وغیرہ کے اس نظریے کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر رمزی نغاعہ کی محققانہ کتاب ”الاسرائیلیات و اثرہا فی التفسیر“ ص ۱۸۸،

سے مروی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سریانی زبان باقاعدہ سیکھی تھی، اس زمانے میں یہود و نصاریٰ کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں، اور غزوہ یرموک کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو اس قسم کی کتابیں اتنی بھاری تعداد میں ہاتھ آگئی تھیں کہ وہ دو اونٹوں پر لادھی جاتی تھیں، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے بہت سی احادیث خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت کی ہیں، لیکن ان کا اسرائیلیات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اگر وہ صحیح سند ثابت ہوں تو دوسرے صحابہؓ کی روایات کی طرح ان کی روایات بھی واجب التسلیم ہیں، ہاں جو روایات انھوں نے صراحتاً اہل کتاب سے نقل کی ہیں وہ اسرائیلی روایات ہیں جنکی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، اسی طرح جو روایات خود ان کے اپنے مقولے کے طور پر منقول ہیں ان کے بارے میں بھی اکثر گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلیات ہیں، اور ان کو اسلامی عقائد کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، مگر کے ایک منکر حدیث مصنف ابوریتہ نے اپنی کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیۃ" میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ پر یہ بے بنیاد الزام عائد کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی اسرائیلی روایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کر دیتے تھے، لیکن یہ الزام نہ صرف سونی صد غلط اور گمراہ کن ہے بلکہ اس نے خود ابوریتہ صاحب کے علم و دیانت کی قلعی بھی کھول دی ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی دلیل میں حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری سے یہ عبارت نقل کی ہے کہ :-

أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو كَانَ قَدْ أَصَابَ زَامِلَتَيْنِ مِنْ كُتُبِ
 أَهْلِ الْكِتَابِ وَكَانَ يَرُدُّنِيهَا لِلنَّاسِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 وَسَلَّمَ، فَتَجَنَّبَ، أَلَّا يَخُذَ عَنْهُ كِتَابٌ مِنْ أُمَّتِهِ النَّبَائِيَّةِ وَكَانَ
 يُعَالِقُهُ: لَا تَحْتِ شَاغِرِ الزَّامِلَتَيْنِ،

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو اہل کتاب کی کتابوں میں سے دو اونٹوں کا بوجھ ملا تھا،
 وہ ان کتابوں کی باتیں لوگوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسو

کر کے روایت کرتے تھے، اس لئے بہت سے ائمہ تابعین نے ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا، چنانچہ لوگ اُن سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں ان دو اونٹوں کے بوجھ میں سے کچھ دینائیے ۱۱

اس عبارت میں خط کشیدہ جملہ حافظ ابن حجرؒ کی ”فتح الباری“ میں نہیں ہے، البوریتہ صاحب نے یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا کر حافظ ابن حجرؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے، اس آپ منکرین حد اور مغرب زدہ موقفین کی علی امانت و دیانت کا اندازہ کر سکتے ہیں!

۲۔ صوفیاء کرام کی تفسیریں

صوفیائے کرام سے قرآن کریم کی آیات کے تحت کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو بظاہر تفسیر معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ آیت کے ظاہری اور ماثور معنی کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ
”قتال کرو ان کافروں سے جو تم سے متصل ہیں“

اس کے تحت بعض صوفیاء نے کہا کہ:-

قَاتِلُوا النَّفْسَ قَاتِلُوا شَتَّى الْاِنْسَانِ
”نفس سے قتال کرو، کیونکہ وہ انسان کے سب سے زیادہ متصل ہے۔“

اس قسم کے جملوں کو بعض حضرات نے قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا، حالانکہ درحقیقت وہ تفسیر نہیں، صوفیاء کرام کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ قرآن کریم کی اصل مراد یہ ہے اور جو مفہوم ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آ رہا ہے وہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہ قرآن کریم کے ظاہری مفہوم پر جو اس کے اصل مآخذ سے ثابت ہو پوری طرح ایمان رکھتے ہیں، اور اس

۱۱ اور اس سلسلے میں البوریتہ کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عجّاج الخطیب کی کتاب ”التنقیح للقرآن“ اور ڈاکٹر رمزی نغناء کی ”الاسرائیلیات و اثرات فی کتب التفسیر“ (ص ۱۵۸)

بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اُن وجدانی استنباطات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں جو اُس آیت کی تلاوت کے وقت اُن کے قلب پر وارد ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت میں کفار کے مقابلے پر جہاد و قتال کا حکم مراد نہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کفار سے جہاد و قتال کا حکم تو اس آیت کا اصلی تقاضا ہی ہے، لیکن اسی آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ سب قریبی منافران اس کا نفس ہے، جو اُسے بُرائیوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے، لہذا کفار سے جہاد کے ساتھ ساتھ اُس سے بھی جہاد ضروری ہے،

ماضی قریب کے معروف مفسر علامہ محمود آکوسی، جن کی تفسیر میں صوفیاء کرام کے اس قسم کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں، صوفیاء کے منشاء کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

”فسرآن کریم میں سادات صوفیاء سے جو کلام منقول ہے، وہ درحقیقت ان دینی امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو ارباب سلوک پر منکشف ہوتے ہیں، اور ان اشارات میں اور فسرآن کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقتاً مراد ہوتا ہے تطبیق ممکن ہے، صوفیاء کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں، اور باطنی مفہوم مراد ہے، اس لئے کہ یہ تو باطنی ملحوظوں کا اعتقاد ہے جسے انھوں نے شریعت کی بالکل نفی کا زینہ بنایا ہے، ہمارے صوفیاء کرام کا اس اعتقاد سے کوئی واسطہ نہیں اور ہر بھی کیسے سکتا ہے؟ جبکہ صوفیاء نے یہ تاکید کی ہے کہ فسرآن کریم کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حاصل کیا جائے“

لیکن صوفیاء کے اس قسم کے اقوال کے بارے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:-

۱۔ روح المعانی، ص ۱، مقدمہ، فائدہ ثانیہ، یہی مضمون علامہ سیوطی نے شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ سے نقل فرمایا ہے، (الاتقان، ص ۱۸۵، ج ۲)

۱۔ ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر قرار نہ دیا جائے، بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآن کریم کی اصل مراد وہی ہے جو تفسیر کے اصل ماخذ سے سمجھ میں آتی ہے، اور یہ اقوال محض وجدانی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا اگر ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا جائے تو یہ مگر اہی ہے، چنانچہ امام ابو عبد الرحمن سلمیٰ نے ایک کتاب "حقائق تفسیر" کے نام سے لکھی تھی جو اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی، اس کے بارے میں امام واحدی نے فرمایا کہ :-

”جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا“

۲۔ اس قسم کے اقوال میں بھی صرف ان اقوال کو درست سمجھا جا سکتا ہے جن قرآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم یا شریعت کے کسی مسلمہ اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، اور اگر ان وجدانیات پر دے میں دین کے مسلمہ اصول و قواعد کی خلاف ورزی کی جائے لگے تو یہ صریح الحاد ہے،

۳۔ اس قسم کے وجدانیات صرف اُس وقت معتبر ہو سکتے ہیں جب قرآن کریم کی تحریف کی حد تک نہ پہنچے ہوں، اور اگر قرآن کریم کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کوئی بات کہی جائے تو وہ بھی الحاد اور مگر اہی ہے، مثلاً ایک شخص نے آیت قرآنی ”مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ“ کے تحت یہ کہا کہ یہ اصل میں ”مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ“ ہے، ذی سے مراد ”نفس“ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ”جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا، شفا پا جائیگا“ اس بات کو یاد رکھو، علامہ سراج الدین بلقینی سے اس کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا کہ: ”ایسا کہنے والا ملحد ہے“

۴۔ قدیم زمانے میں ملحدوں کا ایک فرقہ ”باطنیہ“ کے نام سے گذرا ہے، جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم سے ظاہری طور پر جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی مفہوم کی طرف اشارہ ہے، اور

وہی سترآن کی اصل تفسیر ہے۔ یہ اعتقاد باجماع اہل کفر و الجار ہے، لہذا صوفیاء کے کسی قول کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد رکھا جاتے تو وہ باطنیت ہوگا، ان چار امور کی رعایت کے ساتھ صوفیائے کرام کے اقوال کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور بلاشبہ بعض مخصوص واردات و احوال رکھنے والوں کو ان اقوال سے فائدہ بھی پہنچا ہے، اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں آیات کی مکمل تفسیر لکھنے کے بعد ایک مستقل عنوان ”من باب الاشارة فی الايات“ قائم کرتے ہیں، اور اس میں اس قسم کے وجدانیات ذکر فرماتے ہیں،

مذکورہ بالا گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے قرآن کریم کے تحت اپنے جو وجدانیات ذکر فرمائے ہیں وہ قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہیں، اور بعض لوگوں نے ان پر باطنیت کا جو الزام عائد کیا ہے وہ درست نہیں، اس کے باوجود ہم حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کو نقل کے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ:-

وَمَعَ ذَلِكَ قِيَالِيَتَهُمْ كَمَا يَتَسَاهَلُونَ بِمِثْلِ ذَلِكَ لِمَا فِيهِ
مِنَ الْإِيْتَامِ وَالْإِلْتِمَاسِ،

”اس کے باوجود اے کاش! کہ یہ حضرات اس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اتنے تساہل سے کام لیتے، کیونکہ ان میں غلط فہمی اور شبہ کی بڑی گنجائش ہے۔“

۳۔ تفسیر بالراتے

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:-
”مَنْ كَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ“
”جو شخص سترآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر صحیح بات بھلے کہے تو اس نے غلطی کی۔“

علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ بعض غلو پسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب سمجھا کہ قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر و رائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعہ قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کئے جاسکتے جو اصول شرعیہ کے مطابق ہوں، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبیر اور استنباط کو جائز و مستحسن قرار دیا ہے، اور اگر فکر و تدبیر پر بالکل پابندی لگا دی جائے تو قرآن سنت سے شرعی احکام و قوانین مستنبط کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہو جائے گا، لہذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا نہیں ہے،

چنانچہ اس بات پر جمہور علماء متفق ہیں کہ خود قرآن و سنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کے معاملہ میں غور فکر اور عقل و رائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا اصل منشاء یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے جو اصول اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ ہیں، ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملے میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجے پر بھی پہنچ جائے تو وہ خطا کار ہے، کیونکہ اس نے راستہ غلط اختیار کیا، اب اصول تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً:-

- ۱- جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کرے،
- ۲- کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعین سے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے،
- ۳- جن آیات میں صحابہؓ و تابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان و ادب کے اصولوں کو پامال کر کے کوئی تشریح بیان کرے،

۴۔ قرآن و سنت سے براہ راست احکام و قوانین مستنبط کرنے کے لئے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اور پھر اجتہاد شروع کر دے،

۵۔ قرآن کریم کی متشابہ آیات و جہن کے بارے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ اُن کی سو فی صد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، ان کی جسز م و در ثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے، اور اُس پر مُصر ہو،

۶۔ قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ عقائد یا احکام مجرد ہوتے ہوں،

۷۔ تفسیر کے معاملے میں جہاں عقل و فکر کا استعمال جائز ہے، وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے،

یہ تمام صورتیں اس ”تفسیر بالرائی“ کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیث میں منع کیا گیا ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو اس مختصر جملے میں سمیٹ دیا گیا:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بَعْدَ عَلْمِهِ فَلَيْتَبْرَأُ
مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

جو شخص قرآن کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو تو وہ اس حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے، البتہ اس قسم کا اظہار رائے بھی قرآن و سنت کے وسیع و عمیق علم اور اسلامی علوم میں جہارت کے بغیر ممکن نہیں، اور علماء نے اس کے لئے بھی کچھ کارآمد اصول معسرر فرمائے ہیں، جو اصول فقہ اور اصول تفسیر میں تفصیل سے بیان کیے ہیں، اور اُن کا ایک نہایت مفید خلاصہ علامہ بدر الدین زکشی نے اپنی کتاب ”البرہان فی علوم القرآن“ کی نوع ۴۱ میں بالخصوص

”اقسام التفسیر“ کے زیر عنوان (صفحہ ۶۲ تا ۱۰۷) بیان فرمایا ہے، یہ پوری بحث نہایت قابل تدریسی، لیکن چونکہ عربی زبان و علوم کی ہمارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اس لئے یہاں اس کا ترجمہ نقل کرنا بے فائدہ ہے، جو عربی داں حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں،

تفسیر میں گمراہی کے اسباب

علم تفسیر جہاں ایک انتہائی شرف و سعادت کی چیز ہے وہاں اس نازک وادی میں قدم رکھنا بے حد خطرناک بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کسی آیت کی غلط تشریح کر بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہیں کہی، اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟ جن لوگوں نے ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر میں دخل اندازی کی ہے، وہ کافی محنت خرچ کرنے کے باوجود اس بدترین گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے یہاں ایک نظر ان اسباب پر بھی ڈال لینی ضروری ہے جو انسان کو تفسیر قرآن کے معاملے میں گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں؛

پہلا سبب، نااہلیت

تفسیر قرآن میں گمراہی کا سبب پہلا اور سب سے خطرناک سبب یہ ہے کہ انسان اپنی اہلیت و صلاحیت کو دیکھے بغیر قرآن کریم کے معاملے میں رائے زنی شروع کر دے، خاص طور سے ہمارے زمانے میں گمراہی کے اس سبب بڑی قیامت ڈھائی ہے، یہ غلط فہمی عام ہوتی جا رہی ہے، کہ صرف عربی زبان پڑھ لینے کے بعد انسان قرآن مجید کا عالم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جس طرح سمجھ میں آئے قرآن کریم کی تفسیر کر سکتا ہے، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں محض

زبان دانی کے بل پر جہارت پیدا ہو سکتی ہو، آج تک کبھی کسی ذی ہوش نے انگریزی زبان پر مشکل عبور رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا ہو گا کہ وہ ڈاکٹر ہو گیا ہے، اور میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر دنیا پر مشفق سم کر سکتا ہے، اسی طرح کوئی شخص محض... انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ قانون کی اعلیٰ کتابیں دیکھ کر ماہر قانون کہلا سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو یقیناً ساری دنیا اُسے احمق اور بیوقوف کہے گی، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام علوم و فنون محض زبان دانی اور بنی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے لئے ساہا سال کی محنت درکار ہے، انھیں ماہر اساتذہ سے پڑھا جاتا ہے، اس کے لئے بڑی بڑی درسگاہوں میں کئی کئی امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے، پھر کسی ماہر فن کی پاس رو کر ان کا عملی تجربہ کرنا پڑتا ہے، تب ہمیں انسان ان علوم کا مبتدی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے،

جب ان علوم و فنون کا حال یہ ہے تو تفسیر و تشریح جیسا علم محض عربی زبان سیکھ لینے کی بنا پر آخر کیسے حاصل ہو جائے گا؟ آپ گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ علم تفسیر میں درک حاصل کرنے کے لئے کتنی وسیع معلومات درکار ہوتی ہیں۔ تشریح کریم عام کتابوں کی طرح کوئی ایسی مسلسل کتاب نہیں ہے جس میں ایک موضوع کی تمام باتیں ایک ہی جگہ لکھی ہوتی ہوں، بلکہ وہ دنیا کی تمام کتابوں کے برخلاف اپنا ایک جداگانہ اور ممتاز اسلوب رکھتا ہے، لہذا کسی آیت کو قرار واقعی طور پر سمجھنے کے لئے اول تو یہ ضروری ہے کہ اس آیت کی مختلف قراءتوں، اُس موضوع کی تمام دوسری آیات اور ان کے متعلقات پر پوری نگاہ ہو، پھر آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ بہت سی آیتیں کسی خاص واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہوتی ہیں جسے سبب نزول کہا جاتا ہے، اور جب تک سبب نزول کی مکمل تحقیق نہ ہو اس کا پورا مفہوم نہیں سمجھا جاسکتا، نیز یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے کہ تشریح کریم بہت سی مجمل باتوں کی تشریح و تفسیر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

پر چھوڑ دیتا ہے، لہذا ہر آیت میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قرولی یا عملی تعلیم موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر موجود ہے تو وہ متفقہ روایات کے مسلم اصولوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں؟ نیز صحابہ کرام نے جو نزول قرآن کے علمی شاہد تھے، اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا؟ اگر اس بارے میں روایات کے درمیان کوئی تعارض یا اختلاف ہو تو اسے کیونکر رفع کیا جاسکتا ہے؟ پھر عربی زبان ایک وسیع زبان ہے جس میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی اور ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ ہوتے ہیں، لہذا جب تک اُس زمانے کے اہل عرب کے محاورات پر عبور نہ ہو کسی معنی کی تعیین بہت مشکل ہوتی ہے، اس کے علاوہ صرف الفاظ کے لغوی معنی جاننے سے کام نہیں چلتا، کیونکہ عربی میں نحوی ترکیبوں کے اختلاف سے معانی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ بات عربی لغت و ادب پر مکمل عبور کے بغیر طے نہیں کی جاسکتی، کہ اس مقام پر کونسی ترکیب محاورات عرب کے زیادہ قریب ہے؟ اور سب آخریں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار و معارف الیہ شخص پر نہیں کھولتا جو اس کی نافرمانیوں پر کمر بستہ ہو، لہذا تفسیر قرآن کیلئے اللہ کی بندگی اس کے ساتھ تعلق خاص، طاعت و تقویٰ اور حق پرستی کے لئے لاگ جذبے کی ضرورت ہے، اس لشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ تفسیر قرآن کے لئے صرف عربی زبان کی معمولی واقفیت کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے لئے علم اصول تفسیر و علم حدیث اصول حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، علم فقہ، علم نحو، علم صرف، علم لغت، علم ادب اور علم بلاغت میں ماہرانہ بصیرت اور اس کے ساتھ طہارت و تقویٰ ضروری ہے، ان شرطی شرائط کے بغیر تفسیر کی دادی میں قدم رکھنا اپنے آپ کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کے مرادف ہے، اور اسی طرز عمل کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

مَنْ قَالَ فِي الْعُرْوَانِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ
مِنَ النَّارِ،

”جو شخص قرآن میں بغیر علم کے گفتگو کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں
بتائے“

اس سلسلے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔
چند غلط فہمیاں (۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود اپنے بارے میں
ارشاد فرمایا ہے کہ:-

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِي تَكْرِهَمَنْ مِنْ مَثَلِ كِهْرَاهُ
”اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان
کر دیا ہے“

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہو تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن
کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شخص قرآن کریم کا متن پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے،
لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے، جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے
واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہے، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں
عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان
کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور
فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں اور زندگی کے دو سرسیدھے سادے حقائق،
اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں
سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، بلکہ یہ مقصد قرآن کریم کے مستند تراجم دیکھ کر
بھی ایک حد تک حاصل ہو جاتا ہے، مذکورہ آیت میں اسی مقصد کے لئے یہ کہا گیا کہ
کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے یہ بات مجھ نہیں چھوڑی
”لِلَّذِي تَكْرَاهُ“ یعنی نصیحت کے واسطے (کالفاظ بڑھا کر اس حقیقت کو روزِ روشن کی
طرح واضح کر دیا ہے،

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور
علیٰ مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کما حقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل

مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور بختگی حاصل نہ ہو اُس وقت تک قرآن کریم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انھیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ وغیرہ نے امام عبدالرحمن نسائیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دہل آیتیں سیکھتے تو اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علی اور علی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ:

فَعَلَّمَنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا
 ”ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے“

چنانچہ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۃ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مُسْتَدْرَجِمْ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۃ آلِ عمران پڑھ لیتا، ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا، لہ

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی شعر و ادب میں جہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور جن کو بلبے بلبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انھیں قرآن کریم حفظ کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی، کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے

کے لئے صرف عربی زبان کی ہمارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی ہمارت اور نزول وحی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود... "عالمِ تشریح" بننے کے لئے باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزولِ تشریح کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی تشریح پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفہمِ تشریح بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا فسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ واجبی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:-

مَنْ قَالَ فِي التَّوْحِيدِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَ كَافِي النَّارِ
جو شخص تشریح کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہو تو وہ اپنا ٹھکانا
جہنم میں بنالے۔

(۲) بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن کریم علماء اور اجارہ داری تمام انسانوں کے لئے ایک ہدایت کی کتاب ہے، لہذا ہر شخص کو اس سے اپنی سمجھ کے موافق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اور اس کی تشریح و تفسیر ہر صنفِ علماء کی "اجارہ داری" قائم نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ بھی انتہائی سطحی اور جذباتی اعتراض ہے جسے حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے دور رکھیں واسطہ نہیں، تشریح کریم بلاشبہ تمام انسانوں کے لئے سرمایہ ہدایت ہی، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ہر آن پڑھ جا بل بھی اس سے دقیق قانونی اور کلامی مسائل کا استنباط کر سکتا ہو، اور اس مقصد کے لئے کسی قسم کی صفاتِ اہلیت درکار نہیں ہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کوئی ماہر قانون فلسفی یا ڈاکٹر اگر اپنے فن پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشاء پوری انسانیت کو

فائدہ پہنچانا ہی ہوتا ہے، اب اگر کوئی ایسا شخص جو ان علوم و فنون کے مبادی سے واقف نہیں ہو کھڑا ہو کر یہ اعتراض کرنے لگے کہ یہ کتابیں تو پوری انسانیت کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھیں، ان پر ماہرین قانون، فلسفیوں اور ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری کیوں قائم کر لی ہے؟ تو اس کی عقل پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ اگر کسی کتاب سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کے لئے اہلیت کی کچھ صفات مقرر کرنا "اجارہ داری" قائم کرنے کی تعریف میں آتا ہے تو پھر دنیا کے کسی علم و ہنر کو جاہلوں اور اناڈیلوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا، دراصل علم و فن کی ہر کتاب انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس علم و فن کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرے، اور اس کے لئے جو محنت اور جتنا وقت درکار ہے، اُسے خرچ کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو جن لوگوں نے اس علم و فن کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عمریں کھپائی ہیں ان میں جس پر زیادہ اعتماد ہو، اُس کی تشریح و تفسیر پر بھروسہ کرے، ان دو راستوں کے علاوہ جو شخص کوئی تیسرا راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرے گا اور متعلقہ علم و فن پر بھی، بالکل یہی معاملہ قرآن و سنت کا بھی ہے، کہ وہ بلاشبہ پوری انسانیت کے لئے دستور ہدایت ہیں، لیکن ان سے ہدایت حاصل کرنے کے بھی دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان ان علوم کو ماہر اساتذہ سے باقاعدہ حاصل کرے ان میں پوری بصیرت پیدا کرے، یا پھر ان لوگوں کی تشریح و تفسیر پر اعتماد کرے جنہوں نے اپنی زندگیاں ان علوم کے لئے وقف کی ہیں اس سونی صد معقول اصول کو جس پر دنیا کے ہر علم و فن کے معاملے میں عمل کیا جاتا ہے، "اجارہ داری" کا طعنہ دینا سوائے سطحی جذباتیت کے اور کیلئے؟ کیا ساری دنیا میں صرف قرآن و سنت ہی (معاذ اللہ) ایسے لاوارث رہ گئے ہیں کہ ان سے مسائل مستنبط کرنے کے لئے اہلیت کی کوئی شرط درکار نہیں ہو؟ اور ان پر ہر کس و ناکس مشق ستم کر سکتا ہے؟

(۳) مذکورہ اعتراض ہی کو قد لے مختلف عنوان سے بعض علماء اور پاپائیت

لوگ اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اسلام میں "پاپائیت" کی

کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ بات عیسائی مذہب کا خاصہ ہے کہ اس میں بائبل کی تشریح و تفسیر کا حق صرف پوپ کو حاصل ہوتا ہے اور کسی دوسرے شخص کو اس سے مجال اختلاف نہیں ہوتی، اسلام نے پاپائیت کی جڑ کاٹی ہے، لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دین فطرت میں بھی سترآن کریم کی تفسیر کا سارا حق علماء کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے کر دیا جائے؟

لیکن یہ اعتراض بھی پاپائیت اور علماء اسلام دونوں کی بات کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے، علماء کسی ایسے مخصوص طبقے یا گروہ کا نام نہیں ہے جس کی بنیاد رنگ نسل، ذات پات، مال دولت یا جاہ و منصب کی خاص شرائط پر ہو، نہ ”علماء“ کسی ایسی لگی بندھی تنظیم کا نام ہے، جس کا رکن بننے بغیر انسان ”عالم“ کہلانے کا حق نہ ہو، بلکہ علم و فضل اور سیرت و کردار کی کچھ مخصوص صفات کا حامل ہر شخص عالم دین ہے، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، اور نسب کے اعتبار سے کسی بھی خاندان سے وابستہ ہو، اس لحاظ سے اسلام کے علماء اور عیسائیت کے پاپاؤں میں مندرجہ ذیل واضح فرق موجود ہیں:-

۱۔ ”پاپائیت“ ایک ایسے چھپیرہ مذہبی نظام کا نام ہے جو ایک لگی بندھی عالمگیر تنظیم میں جکڑا ہوا ہے، اس میں بے شمار عہدے اور منصب ہیں، ان عہدوں اور مناصب پر فائز ہونے والوں کی تعداد مہتر رہی، ہر عہدہ و منصب پر کسی شخص کا تقرر کچھ معین انسان کرتے ہیں، اور وہی اس کو فرائض و اختیارات تفویض کرتے ہیں، کوئی شخص محض اپنی ذاتی اہلیت، علم و فضل یا سیرت و کردار کی بنیاد پر لازماً اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس تنظیم کے ارباب اقتدار سے نامزد نہ کریں، اور جب تک وہ اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہ کرے مذہبی معاملات میں اُس کی ہر رائے قطعی غیر مؤثر ہے، خواہ وہ علم و فضل کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذہبی علوم میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کرے تب بھی وہ دلائل کے زور سے چرچ کے مضبوط حصار کو نہیں توڑ سکتا،

اور اگر یہ معین تنظیم اپنی کتب مقدسہ اپنے پیغمبروں اور اپنے اسلاف سے بغاوت پر کمر باندھ لے تب بھی تنظیم سے باہر کے کسی عالم کو اس کے خلاف دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے،

اس کے برخلاف علماء اسلام کی کسی بھی زلے میں اس نوعیت کی کوئی عالمگیر تنظیم نہیں رہی، جس میں داخلے کے بغیر مذہبی معاملات میں لب کشائی ممنوع ہو، جس کے ہمدردوں کا دائرہ اختیار خاص ہو، اور جن میں گفت و گو کا فیصلہ کچھ مخصوص افراد کرتے ہوں، اس کے بجائے ہر وہ شخص جس نے ماہر اساتذہ کے زیر نگرانی قرآن و سنت اور متعلقہ علوم میں بصیرت اور اصلاح و تقویٰ پیرا کر لیا ہو وہ عالم دین کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، مذہبی معاملات میں اُس کے فرائض و اختیارات کا تعین معدودے چند انسانوں کا کوئی گروہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے علم و تقویٰ کی بنیاد پر عام مقبولیت اس کا فیصلہ کرتی ہے، چرچ کے ارباب بست و کشاد اپنے عہدہ و منصب کے زور پر اپنی بات منواتے ہیں، اور ایک مسلمان عالم اپنے علم و فضل اور رت و کردار کی قوت سے یہ مقام حاصل کرتا ہے، وہاں چرچ کے منتشر دوانین کسی شخص کو واجب الاتباع اور قابل تقلید قرار دیتے ہیں اور یہاں اس معاملے میں اصل فیصلہ کن قوت اُمت کا اجتماعی ضمیر ہے، کلیسا کے عہدہ داروں کی ایک تعداد مقرر ہے، اور اس تعداد کے پورا ہو جانے کے بعد کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو اپنے زمانے کے کلیسا کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتا، اس کے برعکس علماء دین کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، علم دین کی ضروری شرائط پوری کرنے کے بعد ہر شخص عالم دین کے حقوق حاصل کر سکتا ہے،

۲۔ پھر کلیسائی نظام میں مذہب اور عقائد کی تشریح و تفسیر کے تمام اختیارات فرد واحد پر مرکوز ہو جاتے ہیں، جسے ”پوپ“ کہتے ہیں، اس پوپ کو مذہب کے کروڑوں پیروؤں میں سے مثل سٹر کارڈینل (Cardinals) منتخب کرتے ہیں، اس پوپ کے اختیارات یہ ہیں کہ وہ رئیس الحواریین (جناب پطرس) کا ہتھیار خلیفہ

تمام مذہبی معاملات میں آخری اتھارٹی ہے، مذہب کی تشریح کے معاملے میں ہر سچی کے لئے واجب الاتباع ہے، اس کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عالم کو اس سے اختلاف کا حق نہیں پہنچتا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اس کے اختیار کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

ہینڈ اپوپ عقائد و نظریات کے معاملہ میں مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت

سے اسی استناد (Authority) اور اسی معصومیت (Infallibility)

کا حامل ہے، جس طرح پورا کلیسا، وہ قانون ساز اور حج کی حیثیت

وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو پوری کلیسیا کو حاصل ہیں.....“

غور فرمائیے کہ پوری تاریخ اسلام میں آج تک کسی بھی عالم دین نے کبھی اس مطلق العنانی کا دعویٰ کیا ہے؟

۳- پھر عیسائی عقائد کے مطابق ”پوپ“ نظریاتی مسائل کا اعلان کرتے ہوئے

معصوم اور خطاؤں سے پاک ہوتا ہے، چنانچہ برٹانیکا میں ہے :-

”ہینڈ اپوپ کے دو خصوصی امتیازات ہیں، ایک یہ کہ جب وہ مقتدر

اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے عقائد کے بارے میں کوئی اعلان کرے تو وہ

معصوم اور غلطیوں سے پاک ہوتا ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ مذہب

کے تمام پیروؤں پر حاکمانہ اختیار کا کل (Sovereign)

jurisdiction رکھتا ہے، یہ دونوں استحقاقات جن کا دعویٰ اور

استعمال صدیوں سے پوپ کرتے آئے ہیں، ان کو جولائی ۱۸۷۰ء

کی ویٹی کن کونسل میں واضح دستوری شکل بھی دیدی گئی ہے“

۹ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ ”پوپ“ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ ج ۱۸

۱۰ ایضاً، ص ۲۲۳ ج ۱۸، مزید دیکھئے مقالہ ”معصومیت“ (Infallibility)

اس کے برخلاف یہ تمام علامتے اسلام کا متفقہ عقیدہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کوئی فرد معصوم نہیں ہے، اور ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے، چنانچہ علامتے اسلام پوری آزادی سے ایک دوسرے پر تنقید کرتے آئے ہیں، اور یہ سلسلہ عہد صحابہ سے اب تک جاری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی مشہور سے مشہور عالم اگر قرآن و سنت کی تشریح میں کوئی غلطی کرے تو دوسرے تمام علماء اس کی گرفت کر کے اُمت کو اس کے نتائج بد سے محفوظ کر سکتے ہیں۔

۴۔ پھر کلیسا میں جو سٹرکار ڈونیل پوپ کا انتخاب کرتے اور اس کو مشورے دیتے ہیں ان کی نامزدگی خود پوپ صاحبِ تنہا کرتے ہیں، چنانچہ ”برٹانیکا“ میں ہے :-
سٹار ڈونیلوں کی نامزدگی آجکل تنہا پوپ کا کام ہے، پوپ جن انفراد کو خفیہ طور پر چنتا ہے، اُن کے ناموں کی اشاعت سے یہ کام مکمل ہو جاتا ہے اس کے لئے کسی اور ضابطے کی پابندی ضروری نہیں، ... اسی طرح سیکرڈ کالچ کی ووٹنگ یا منظوری کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ کلیسا کے یہ ارباب اقتدار جو مذہب کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں ان کا تفسیر حص اہلیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ مختلف خطوں میں مختلف علاقائی تعصبات کا رفسرما ہوتے ہیں، ”برٹانیکا“ ہی کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو :-
”یہاں متحدہ امریکہ میں کلیسا دنیا کی ہر قوم کے مختلف گروپوں سے مرکب ہوتا ہے، لیکن انگریزی بولنے والی اقوام اکثریت میں ہوتی ہیں آئیسویں صدی کے وسط تک آئرش اور جرمن اقوام کو سب سے زیادہ کوٹا حاصل تھا، ... ان کے علاوہ مشرقی کیتھولک اقوام مثلاً رومانی، شامی اور آرمینی) ایک قابلِ لحاظ تناسب سے موجود ہیں“

۱۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۸۵۵ ج ۲، مقالہ ”کارڈونیل“

۲۔ ایضاً، مقالہ ”رومن کیتھولک چرچ“ ص ۲۲۱ ج ۱۹،

اس مختصر سے تعارف کے بعد پاپائی نظام کا موازنہ علماء اسلام سے کیجئے تو دونوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علماء اسلام کی نہ کوئی لگی بندھی تنظیم ہے، نہ کوئی فردِ اول مذہبی معاملات میں حاکمِ اعلیٰ ہے، نہ کوئی شخص معصومیت اور غلطیوں سے پاک ہونے کا دعویٰ دار ہے، نہ علماء کی کوئی مخصوص تعداد و عداد ہے جس پر اضافہ نہ ہو سکتا ہو، نہ کوئی شخص دوسرے علماء کی تنقید سے بالاتر ہے، نہ عالم کے منصب پر فائز ہونے کے لئے کسی فردِ واحد کی اجازت اور منظوری درکار ہے، نہ اس منصب کے لئے کسی رنگ و نسل یا زبان و وطن کی کوئی قید ہے، بلکہ تاریخ اسلام میں اکثر سیاست جڑوں کے پاس رہی، لیکن علماء عجمیوں بلکہ غلاموں کے خاندان سے پیدا ہوتے رہے، اور پورا عالم اسلام ان کے علم و فضل اور تقدس و تقویٰ کا لوہا مانتا رہا، لہذا جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرآن و سنت کے علوم میں دخل اندازی کے لئے ان علوم میں بصیرت و جہارت درکار ہے تو اس پر ”پاپائیت“ کا الزام عائد کرنا حقیقت اور انصاف کے ساتھ ایک سنگین مذاق کے سوا کچھ نہیں، اس کے بجائے درحقیقت دینی علوم کی مقال دوسرے علوم کی سی ہے، جس طرح دنیا کے تمام علوم فنون کے بارے میں کسی شخص کی بات اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک اس نے اُس متعلقہ علم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان کا عملی تجربہ حاصل نہ کیا ہو، اسی طرح قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر میں کسی کی بات اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوگی جب تک اس نے متعلقہ علوم کو باقاعدہ حاصل کر کے ماہر اساتذہ کے زیرِ نگرانی اُن کا عملی تجربہ نہ کیا ہو، اگر اس بات کو کوئی شخص ”پاپائیت“ سے تعبیر کرتا ہے تو دنیا کا کوئی علم و فن اس ”پاپائیت“ سے خالی نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا یہاں ہمارا منشاء صرف یہ بتانا ہے کہ علماء اسلام اور پاپائوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ بات فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ پاپائیت کے نظام میں واقعہ کتنی خرابیاں اور کتنی اچھٹیاں ہیں؟ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے پروپیگنڈہ نے جہاں پاپائیت کی حقیقی خرابیوں کی نشان دہی کی ہے، جہاں اسے محض بدنام کرنے کے لئے بہت سے الزامات غلط بھی لگائے ہیں جو اس پر عائد نہیں ہوتے، لیکن یہاں اس بحث کا موقع موقع نہیں ہے، محمد تقی

۲، قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تابع بنانا

تفسیر قرآن کے سلسلے میں دوسری عظیم گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ نظریات متعین کر لے، اور پھر قرآن کریم کو اُن نظریات کے تابع بنانے کی فکر کرے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے نشان دہی فرمائی ہے، قدیم زمانے سے باطل فرقوں، ظاہریتوں اور اپنے وقت کے فلسفے سے مرعوب لوگوں نے تفسیر قرآن میں یہی گمراہ کن طریقہ اختیار کیا ہے، اور الفاظِ قرآنی کو توڑ موڑ کر اپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل دنیا کے کسی بھی معاملہ میں حق و انصاف کے مطابق نہیں ہے، خاص طور سے قرآن کریم کے بارے میں یہ طریق کار اختیار کرنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس کے برابر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اپنے آپ کو ”ہدایت“ کی کتاب قرار دیا ہے، ”ہدایت“ کے معنی یہ ہیں کہ ”جس شخص کو منزل کا راستہ معلوم نہ ہو اُسے راستہ دکھلانا“ لہذا قرآن کریم سے ”ہدایت“ حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس شخص کی طرح خالی الذہن رکھے جسے اپنی منزل کا پتہ معلوم نہ ہو، اس کے بعد دل میں یہ اعتقاد پیدا کرے کہ قرآن کریم جو راستہ بتائے گا وہی میرے لئے صلاح و فلاح کا موجب ہوگا، خواہ اسے میری محدود عقل قبول کرے یا نہ کرے، اگر میری عقل ایسی ہی قابلِ اعتماد تھی کہ میں اس کے زور پر سب کچھ معلوم کر سکتا تھا تو پھر قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس اعتقاد کے ساتھ جب انسان قرآن کریم کی طرف رجوع کرے گا، اور اُن آداب و شرائط کو ملحوظ رکھے گا جو قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں تو اسے بلاشبہ ہدایت حاصل ہوگی اور وہ منزلِ مراد کو پالے گا، اس کے برعکس اگر کسی شخص نے محض اپنی عقل کی بنیاد پر کچھ مخصوص نظریات اپنے ذہن میں پہلے سے بٹھائے، اور پھر قرآن کریم کو اُن مخصوص نظریات کی عینک

پڑھنا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اللہ کی اس مقدس کتاب کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے عقلی نظریات کی تائید حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی عقل پر اتنا بھروسہ کرتا ہو اور اپنی عقل کو قرآن کا خادم نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) قرآن کو اپنی عقل اور خواہشات کا خادم بنانا چاہتا ہو،۔۔۔ قرآن کریم اسے ہدایت کی روشنی عطا کرنے سے بے نیاز ہے، یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد تک پہنچنے کے بجائے اپنی گمراہی کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے، اور اسے ہدایت کی توفیق نہیں ہوتی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۗ وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۗ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اس (قرآن) کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے؛

اور بہت سوں کو ہدایت بخشتا ہے ۛ

لہذا قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے ذہن کو دوسرے نظریات خالی کر کے ایک طالب حق کی طرح قرآن کریم کی طرف رجوع کیا جائے، اور اس کی مراد سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہو، ان کو حاصل کر کے اس کی تفسیر معلوم کی جائے، اور اس طرح جو کچھ ثابت ہو اس پر ایک سچے مومن کی طرح ایمان رکھا جائے، اور جو شخص اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو، یا اسے اپنے ذہن پر یہ اعتماد نہ ہو اس کے لئے سیدھا راستہ یہ ہو کہ وہ خود ”تفسیر قرآن“ کے وادی میں قدم رکھنے کے بجائے ان لوگوں کی تفسیر پر بھروسہ کرے، جنہوں نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کی ہیں، اور جن کی علمی بصیرت اور لٹریٹ وغدا ترسی پر اسے زیادہ اعتماد ہو؛

۳، زمانے کے افکار سے مرعوبیت

تفسیر قرآن کے سلسلے میں تیسری گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے وقت کے فلسفیانہ اور عقلی نظریات سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر قرآن کریم کی طرف رجوع کرے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں ان نظریات کو حق و باطل کا معیار قرار دے لے، یہ گمراہی دراصل دوسری

مگر اسی کے ذیل میں خود بخود آجاتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مغربی افکار سے مرعوبیت نے خاص طور سے بڑی قیامت ڈھائی ہے اس لئے یہاں اس مگر اہی کو مستقل طور سے ذکر کیا جا رہا ہے،

تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے افراد کی ایک جماعت موجود رہی ہے جو قرآن و سنت کے علوم میں چھتگی پیدا کئے بغیر اپنے زمانے کے فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہ فلسفہ اٹکے ذہنوں پر اس بڑی طرح مسلط ہو گیا کہ وہ اس کے بنائے ہوئے فکر و نظر کے دائروں سے باہر نکلنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو گئے، اس کے بعد جب انھوں نے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا، اور اس کی بہت سی باتیں انھیں اپنے آئیڈیل فلسفے کے خلاف محسوس ہوئیں تو انھوں نے اس فلسفے کو جھٹلانے کے بجائے قرآن کریم میں تحلیل و ترمیم شروع کر دی، اور اس کے الفاظ کو کھینچ ناکر اپنے فلسفیانہ افکار کے مطابق بنا کر بنا شروع کر دیا،

جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا چرچا ہوا، اور لوگوں نے قرآن و سنت کے علماء میں چھتگی پیدا کئے بغیر اس فلسفے کو حاصل کرنا شروع کیا، تو یہی فتنہ پیش آیا، اور بعض لوگ جو یونانی فلسفے سے بڑی طرح مرعوب ہو گئے تھے، قرآن کریم کو توڑ موڑ کر اس فلسفے کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگ گئے، ان میں بہت سے لوگ مخلص بھی تھے، اور سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ یونانی فلسفہ ناقابل تردید ہے، اور قرآن و سنت کی متواتر تفسیر اس کے لئے ہونے لگی، اس کے مقابلہ نہیں کر سکے گی، اس لئے اس تفسیر کو بدل کر قرآن و سنت کی ایسی تشریح کرنی چاہئے جو یونانی فلسفے کے مطابق ہو، لیکن درحقیقت یہ قرآن و سنت اور اسلام کے ساتھ ایک نادان دوستی تھی جس نے اسلام کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے مسلمانوں میں نظریاتی انتشار برپا کیا، اور معتزلہ اور حنبلیہ جیسے بہت سے نئے فرقے پیدا کر دیئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سچے کار عمائدین جنہیں قرآن و سنت کے علوم میں رسوخ حاصل تھا، اور جو قرآن و سنت کے مقابلے میں وقت کے کسی چلے ہوئے نظام فکر سے مرعوب نہیں تھے، ان کی ایک بڑی جماعت کو

دوسرے کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تردید میں مصروف ہو جانا پڑا اور انھوں نے یونانی فلسفے کی فکری غلطیوں کی نشان دہی کر کے ایسے لوگوں کی مدلل اور مفصل تردید کی جو اس فلسفے کے اثر سے قرآن و سنت میں معنوی تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، غرض ایک عرصے تک فکری مباحث اور تصنیف و مناظرہ کا بازار گرم رہا، اور فریقین کی طرف سے اپنے اپنے موقف کی تائید میں پورے کتب خانے تیار ہو گئے،

پختہ کار علماء دین کا موقف یہ تھا کہ قرآن کریم کسی انسان کی نہیں اس خالق کائنات کی کتاب ہے جو اس دنیا اور اس میں ہونے والے واقعات کی رتی رتی سے باخبر ہے، اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے اس سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہو سکتا، لہذا قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے بیان کردہ حقائق سدا بہار، اور ناقابلِ ترمیم ہیں، جن احکام و قوانین اور نظریات پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی تھی اُن کے بارے میں قرآن کریم نے خود کوئی معین بات کہنے کے بجائے ایسے جامع اصول بیان فرمادیئے ہیں جو ہر تبدیلی کے موقع پر کام آسکیں، اور اُن کی روشنی میں ہر بدلے ہوئے ماحول میں رہنمائی حاصل کی جاسکے، لیکن جو باتیں قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہیں، یا جن کی واضح تفسیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ زمانے کی تبدیلی سے بدلنے والی باتیں نہیں ہیں،

فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے وہ بیشتر نظریات جو قطعی مشاہدہ پر مبنی نہیں ہیں، مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، اور جس زمانے میں جو نظریہ رائج رہا وہ لوگوں کے ذہن و فکر پر اس بڑی طرح چھا گیا کہ لوگ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ رہے، لیکن جب زمانے کے کسی انقلاب نے اس نظریے کی کاپی پلٹی تو وہی نظریہ اتنا بدنام ہوا کہ اس کو منہ سے نکالنا بھی دقیانوسیت کی علامت بن گیا، اب اس کی جگہ کسی نئے نظریے نے ذہنوں پر اپنا مسک بٹھایا، اور اس کی گھن گرج نے ہر مخالف رائے کا گھلا گھونٹ دیا، پھر ایک عرصہ گزرنے پر یہ نیا نظریہ بھی اپنی آن بان کھو بیٹھا، اور کسی تیسرے نظریے نے اس کی جگہ لے لی، فکر انسان

کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے، اور جب تک حقیقت کی پیاس انسان کو قطعی مشاہدے تک نہیں پہنچا دیتی اُس وقت تک یہی ہوتا رہے گا، اس کے برخلاف قرآن کریم نے جن حقائق کی طرف واضح رہنمائی عطا کی ہے، وہ چونکہ ایک ایسی ذات کے بیان کئے ہوئے ہیں جس کے سامنے یہ پوری کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ واضح اور بے غبار ہیں، اس لئے فکر اور فلسفے کی اس آنکھ مچولی کو اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا، آپ زلمے کے جس نظریہ سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے، ہو سکتا ہے کہ وہی نظریہ عہدِ جہالت کی یادگار ثابت ہو، اور آپ اسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرمانے لگیں،

راخ العقیدہ اہل علم کا یہ طرزِ فکر تجربے سے بالکل سچا ثابت ہوا، آج فلسفہ اور سائنس کی ترقیات نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، اور اس کے نہ صرف بہتے طبعی، عنصری اور فلکیاتی نظریات غلط قرار پا گئے، بلکہ اُن کی بنیاد پر مابعد الطبیعی (Metaphysical) نظریات کی جو عمارت اٹھائی گئی تھی، وہ بھی زمین بوس ہو چکی ہے، جن لوگوں نے یونانی فلسفے کی چمک دمک سے خیرہ ہو کر قرآنِ سنت کو موم کی ناک بنایا تھا، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً اُن کی ندامت و شرمندگی کی کوئی انتہا نہ رہتی،

لیکن حیرت ہے کہ سطح پرستوں کا ایک گروہ تاریخ سے کوئی سبق لینے کے بجائے مغربی افکار سے متاثر و مرعوب ہو کر قرآن و سنت کی ایسی تفسیر گھڑنے کی فکر میں ہے جو مغرب کے چلے ہوئے نظریات پر فٹ ہو سکے، یہ گروہ تفسیر کے تمام معقول اور معروف اصولوں کو توڑ کر صرف ایک اصول کی بنیاد پر قرآن کریم کے ساتھ مشقِ ستم میں مصروف ہے، اور وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مغربی افکار کے مطابق بنا دیا جائے، یہ لوگ کبھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ جس کلام پر وہ تاویل و تحریف کی مشق کر رہے ہیں وہ کس کا کلام ہے؟ جن نظریات کی خاطر وہ خدا کے کلام میں کھینچ تان کر رہے ہیں، وہ کتنے پائیدار ہیں؟

اور جب فکر انسانی کا قافلہ ان نظریات کو روند کر اور آگے بڑھے گا تو اس قسم کی تفسیروں اور تشریحات کا حشر کیا ہوگا؟

یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، جب مغرب کے مشہور فلسفی معجزات کا مسئلہ نیوٹن نے سترھویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا تو

اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کے بارے میں ایک نظریہ مقبول عام ہو گیا، جسے ”میکانکی نظریہ حیات“ کہتے ہیں، اور سادہ لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ پورے کائنات کی علت و معلول کے نظام میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس سے سب کو تجاوز نہیں کر سکتی یہاں پائی جانے والی ہر چیز کی ایک فطرت یا نچر ہے، جو اس کے لئے لازم ذات ہے، اور کبھی اس سے الگ نہیں ہو سکتی، مثلاً آگ کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جلائیگی، اس طرح فطرت کا اس سے الگ ہونا ممکن نہیں، چنانچہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آگ موجود ہو اور اس سے جلانے کی خاصیت ختم ہو جائے،

جب پوری دنیا میں اس نظریہ کا ڈنکا بجنا شروع ہوا تو مغرب کے مفکرین نے ایسے تمام واقعات کا مذاق اڑانا شروع کیا، جنہیں وہ مافوق الفطرت (Super Natural) سمجھتے تھے، اور جو ان کے دریافت کئے ہوئے علت و معلول کے نظریے

کے خلاف تھے، چنانچہ انہوں نے ہر اس چیز کو توہم پرستی قرار دیدیا جو عادی اسباب کے ماتحت واقع نہ ہوئی ہو، اس نظریے کی گھن گرج اور اس سے زیادہ ”مافوق الفطرت“ اشیاء کے استہزاء نے عالم اسلام کے بعض مجددین کو بھی انتہائی مرعوب متاثر کر دیا، اور جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے بہت سے معجزات مذکور ہیں جو اس نظریے سے میل نہیں کھاتے، تو انہوں نے قرآن کریم کے الفاظ میں ایسی کھینچ تان شروع کر دی جس سے یہ سارے معجزات اہل مغرب کی اصطلاح میں ”مافوق الفطرت“ یا ”سپر نیچرل“ ہونے کے بجائے عادی اسباب کے ماتحت آجائیں، مثلاً علت و معلول کے مذکورہ بالا نظریے کے مطابق جلاؤ آگ کی لازمی خاصیت تھی جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ

میں بیان کیا ہے، کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اُن کے لئے آگ کو ٹھنڈا کر دیا گیا تھا، چنانچہ عالم اسلام کے بعض تجدد پسند لوگوں نے اس واقعے ہی سے سرے سے انکار کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی واضح آیتوں میں ایسی کھینچ تان شروع کر دی جو قرآن کی معنوی تحریف کی حد تک پہنچ گئی، اور جو تیرہ سو سال کے عرصے میں قرآنِ سنت کے کسی عالم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی، اور پوری اُمت کے پرغلامانہ آیاتِ تشریحی کی اس تحریفِ معنوی کا جواز پیدا کرتے ہوئے سرسید احمد خان صاحب نے لکھا:-

اُن کے (قدیم علماء اسلام کے) زمانے میں نچرل سینئر نے ترقی نہیں کی تھی، اور کوئی چیز اُن کو قانونِ فطرت کی نظرِ رجوع کرنے والی اور انکی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی، پس یہ سبب اور مثل ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ اُن کی کافی توجہ قرآن مجید کے ان الفاظ کی طرف نہیں ہوئی، مثلاً..... حضرت ابراہیم کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا، مگر انھوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا۔

حالانکہ احادیث و روایات سے قطع نظر، خود قرآن کریم کے الفاظ اس واقعے

سے متعلق یہ ہیں:-

قَالُوا احْرَقُوْهُ وَاَنْصُرُوْا آلَ الْاِهْتِ كُمْ اِنْ كُنْتُمْ قَاعِلِيْنَ ؕ قُلْنَا
يَا كَاذِبُوْنَ بَرَدًا وَاَوْسَلًا مَّا عَلَيْنَا اَنْ نُّرَاهِيْمَ ؕ وَاَنْزَلْنَا وَاِيْهَ كَيْدًا
وَجَعَلْنَاهُمْ اِلَّا كَحُسْرِ بَيْنَ ؕ (انبیاء، ۷۵)

”ان سب (کافروں) نے کہا کہ اس (ابراہیم) کو جلا ڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی

مدد کر دیا اگر تم کو مانا جاتے ہو، ہم نے حکم دیا، ارے آگ! تو ابراہیمؑ کے حق میں سرور اور سلامتی بن جا، اور انھوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ مکر کا ارادہ کیا، پس ہم نے ان کو ان کے ارادہ میں ناکام بنا دیا۔

قَالُوا ابْنُوا آلَٰنَا فَاَلْفَوْا فِي الْعَجْمِ ۗ فَآرَادُوا زِيَهٗ كَيْسًا ۚ
فَجَعَلْنَاهُمْ اَلَا سُقَلِيْنَ ۙ

”انھوں نے کہا اس کے لئے ایک عمارت بناؤ اور اس کو دکھتی آگ میں ڈال دو۔
پس انھوں نے اس کے ساتھ ارادہ بد کیا تو ہم نے ان کو پست اور ذلیل کر دیا۔“

ان واضح اور صریح الفاظ پر تحریف و تاویل کی مشق ستم صرف اس بنا پر کی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے آگ سے زندہ سلامت نکل آنے کا یہ واقعہ مغرب کے راجح الوقت ”نیچرل سینس“ کے خلاف تھا، چنانچہ سر سید احمد خان صاحب اور ان کے ہم نوا دوسرے تجدد پسندوں نے مغرب کی اس ”نیچرل سینس“ کی خاطر نہ صرف تفسیر قرآن کے تمام اصولوں کو پامال کیا اور قرآن کریم کے الفاظ میں کھینچ تان شروع کی، بلکہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے معاد جسمانی جیسے عقائد پر بھی خط نسخ پھیر دیا، ملائکہ، شیاطین اور جنات کو بھی تو ہم پرستی قرار دیا، انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات کو ”ما فوق الفطرت“ کہہ کر ان کے منکر ہو گئے، اور اس غرض کے لئے پورے قرآن کو شعائرہ تمثیلات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا، ایسے لوگوں کی تفسیر یہ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے تمام واقعات اپنے سیدھے سادے اسلوب کے بجائے تمثیلات کے معمول میں بیان کئے ہیں جن کا انکشاف تیرہ سو سال بعد پہلی بار ان فدایان مغرب پر ہوا ہے، قرآن کریم کے واضح اور صریح لفظ کو من مانے مجازی معنی پہنا دینا ان حضرات کا ایک معمولی کھیل ہے، جس کی بے شمار مثالیں ان کی تفسیروں میں ملتی ہیں، اور اس تمام کدو کاوش کا منشاء سر سید احمد خان صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

”جب معجزات کو ما فوق الفطرت قرار دیا جاوے جس کو انگریزی میں ”سپر نیچرل“ کہتے ہیں، اور اس سے انکار کرتے ہیں اور ان کا وقوع

ایسا ہی ناممکن قرار دیتے ہیں، جیسے کہ قوی وعدے کا ایفانہ ہونا، اور
 علانیہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے امر کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ہے، جو ناقص
 الفطرت ہو، اور جسکو تم معجزہ قرار دیتے ہو، اور اگر بغرض محال خدا کی
 قدرت کے حوالے پر اس کو تسلیم بھی کریں تو وہ ایک بے فائدہ امر ہوگا!

اس کے برخلاف علماء اسلام کا موقف یہ تھا کہ معجزات کا وقوع عقلی طور پر کوئی
 محال نہیں ہے، ہاں یہ واقعات خلاف عادت ضرور ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جب
 اپنے کسی پیغمبر کی حقانیت ہر عامی اور ان پڑھ کے سامنے واضح گان کرنا چاہتا ہے تو
 ان کے ہاتھ پر ایسے حیرت انگیز خلاف عادت کام ظاہر کر دیتا ہے، جنہیں دیکھ کر
 ہر شخص یہ سمجھ جائے کہ اللہ کے اس پیغمبر کو تا سید خداوندی حاصل ہے، مگر چونکہ مغرب میں
 نیچرل سائنس کا سکہ چلا ہوا تھا، اس لئے سمرسید صاحب وغیرہ یہ بات کہتے ہوئے فرماتے تھے،
 لیکن قدرتِ خداوندی کا یہ کرشمہ ملاحظہ فرمائیے کہ جس وقت سرسید احمد خان صاحب
 اور ان جیسے دوسرے متجددین "نیچرل سائنس" کی خاطر تمام انبیاء کے معجزات کا انکار کر رہے تھے
 اور اس غرض سے قرآن کریم کی آیات پر تخریص و تاویل کی مشق کی جا رہی تھی، ٹھیک
 اسی زمانے میں سائنس کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو رہا تھا، نیوٹن کے
 نظریات نئی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہے تھے، اور آئن سٹائن اپنا انقلابی
 نظریہ اضافت کی داغ بیل ڈال رہا تھا، جس نے سائنس کے گزشتہ مفروضات کی کاپیٹل کو
 رکھ دی، اور اس کی بنیاد پر بیسویں صدی میں جس ایٹمی سائنس کا ڈھنگا بجا اس نے قانون
 کشش اور قانون علت و معلول کو رد کر کے نیچرل اور سیر نیچرل کی تفریق ہی ختم کر ڈالی، چنانچہ
 عہد حاضر کا ایک عظیم اور مسلم سائنس دان سر آر تھو ایڈنگٹن (Eddington)
 لکھتا ہے :-

"سائنس کی تحقیقات سے اشیاء کی کسی اندرونی ذاتی ولایت تک

خاصیت یا ماہیت و نوعیت (جیجر) کا پتہ نہیں چلتا۔

اور اس طرح :-

”ایک اہم نتیجہ خارجی دنیا میں قانون علت کے ختم ہو جانے کا یہ نکلتا کہ فطرت اور فوق الفطرت کے درمیان کوئی واضح فرق باقی نہیں رہتا“
 سائنس کے مسلمات میں یہ زبردست انقلاب کس طرح رونما ہوا، اس کی مختصر سرگزشت
 ہمارے دور کے مشہور سائنسٹ سر جیمس جینز (Sir James Jeans)
 کی زبانی سنئے :-

”گلیڈیادریٹوشن کی عظیم سترہویں صدی کی یہ بڑی عظیم کامیابی اور فتح
 مان لی گئی تھی کہ کائنات میں ہر ما بعد کا تغیر و تبدل یا تحلیل اپنے قابل
 کا ناگزیر نتیجہ و لازمہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ ساری کائنات فطرت (جیجر)
 کی پوری تاریخ آخر تک لازمی اور ناگزیر نتیجہ اس ابتداء کا ہے جس میں وہ
 پہلے دن تھی،

اس تصور ہی کا لازمہ وہ تحریک تھی جس نے ساری مادی کائنات
 کو بس ایک مشین بنا اور سمجھا لیا تھا، یہ صورت حال انیسویں صدی کے
 آخر تک مسلم اور جاری رہی، اور ساری جیجرل سائنس کا واحد مقصد
 اس کائنات کو مشینی ساخت (میکانکس) میں تبدیل و تحویل کر دینا
 بن گیا.....

پھر اسی انیسویں صدی کے آخر ہینری میں برلن کے ماکس پلانک
 (Max Plank) نے کو انٹم نظریہ کی بنیاد ڈالی، جو بالآخر
 ترقی کر کے جدید طبیعیات (فزکس) کا ایک ہمہ گیر اصول قرار پا گیا جس

Eddington ; The Nature of Physicals World P 303

ماخوذ از ”مذہب سائنس“ از مولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء

آئے حل کر سائنس کے میکا کی عہد کا خاتمہ کر کے ایک نژدہ دور کا آغاز کر دیا۔
ابتداء میں پلانک کے نظریہ سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ کائنات فطرت میں تسلسل کا عمل
کار فرما نہیں، لیکن مسئلہ ۱۹۱۱ء میں آئن اسٹائن نے بتایا کہ پلانک کا نظریہ دراصل بہت یاد
الغلاب انگریز نتائج کا حاصل ہے اور بقول جیمس جینز:-

یہ نظریہ اس قانون علت و معلول ہی کو اپنی فرمانروائی کے تحت آتا رہے
والا ہے جسکو اب تک کائنات کے ایک ہمہ گیر رہنا اصول کا مقام حاصل تھا
پُرانی سائنس کا یہ قطعی اعلان اور دعویٰ تھا کہ فطرت (نچیسر) سلسلہ علت و
معلولات کے بندھے ہوئے قوانین سے باہر ایک قدم نہیں نکال سکتی، علت
"الف" کے بعد ناگزیر طور پر "ب" کے معلول ہی کو پیدا یا ظاہر ہونا چاہئے،
لیکن نئی سائنس اب سرت اتنا دعویٰ کر سکتی ہے کہ "الف" کے بعد "ب"،
"ج" وغیرہ کے یوں تو بے شمار امکانات ہیں، البتہ اتنا صحیح ہے کہ اُن میں
"الف" کے بعد "ب" کا نمودار ہونا "ج" کے مقابلے میں اور "ج" کا "د" کے
مقابلے میں اغلب ہے،

جیمس جینز نے بتایا ہے کہ اس اعلیٰت یا ظن غالب کے سوا کسی نام نہاد علت کے بعد
کسی خاص نام نہاد معلول ہی کے پیدا ہونے کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے
نہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے، بلکہ:-

This is matter which Lies on the kness
of gods whatever gods there be.

یہ معاملہ طیغ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے جس کو بھی خدا کہا جائے

غرض بیسویں صدی میں ایسی تجربات کی روشنی میں جو سائنس پر دان چڑھی ہے

۱۔ جیمس جینز کی کتاب "پراسرار کائنات" Mysterious Universe

ص ۲ تا ص ۳۲ ماخوذ از مذہب سائنس "مولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۳ تا ۸۵،

انچ ان پرانے تصورات کو جو طمول ہی سے ختم کر دیا ہے کہ کائناتی اشیاء کی خاصیتیں ان اشیاء سے جدا نہیں ہو سکتیں اور آگ سے جلانے کی صفت کو کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا، اب سائنس کا کہنا یہ ہے کہ آگ اکثر و بیشتر حلاقی ضرور ہے، اور غالب گمان یہی ہے کہ جہاں آگ ہوگی وہاں تپش اور جلن پائی جائے گی، لیکن اگر کبھی اس کے خلاف ہو جائے تو یہ نہ عقل کے خلاف ہو اور نہ سائنسی مسلمات اس کی تردید کر سکتے ہیں، لہذا آج کا سائنس دان معجزات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لاطعلی کا اظہار کر سکتا ہے، ان کو ناممکن کہہ کر آگ کا اصولی انکار نہیں کر سکتا، شاید یہی وجہ ہو کہ بیسویں صدی میں مغرب کے عوام پھر ان چیزوں کی طرف لوٹ رہے ہیں جنہیں وہ پہلے "ما فوق الفطرت" سمجھ کر توہم پرستی تشرار دیا کرتے تھے، انہنا یہ ہے کہ بعض اطلاعات کے مطابق مغرب کی بعض یونیورسٹیوں میں "جادو" سکھانے کے لئے باقاعدہ شعبے قائم ہونے لگے ہیں،

پھر تجدد پسندوں کی ذہنیت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ زمین کے عام شور و غیب سے متاثر و معرب ہو کر بڑی جلدی سے ایک رائے قائم کر لیتے ہیں، اور معاملے کی پوری تحقیق کئے بغیر ہی اُس رائے پر فکر و نظر کی پوری عمارت کھڑی کر لیتے ہیں، معجزات کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے کہ جس وقت سر سید احمد خان صاحب اور ان کے ہم نواد و کرمجددین معجزات کو "ناممکن" تشرار دے رہے تھے اس وقت مغرب میں عام شور تو بیشک ان کے انکار ہی کا تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ فلسفہ اور سائنس کی دنیا کے تمام لوگ ہیوم اور ہکسلے کی طرح معجزات کے منکر ہوں، بلکہ بہت سے ممتاز سائنس دان اُس وقت بھی معجزات کے قائل تھے جن میں نیوٹن، فرانک، سمپسن، کیلون، اور لستر بطور خاص قابل ذکر ہیں، اور جرمنی کے مشہور سائنس دان لوٹزر نے تو معجزات کی تائید میں بڑے معرکے کے مضامین لکھے ہیں، اور ثابت کیا ہے کہ معجزات کسی بھی طرح عقل یا سائنس کے خلاف نہیں ہیں،

اور پھر حاضر کے سانس دانوں کے جو اقوال پیش کئے گئے ہیں ہم نے اُن کو قرآن کریم کی صداقت اور حقانیت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا، کیونکہ قرآن کریم کی سچائی ان اقوال کی تائید سے بے نیاز ہے، وہ اُس وقت بھی سچا تھا جب سانس داں مافوق الفطرت اشیاء کا مذاق اڑاتے تھے، اور آج بھی سچا ہے، جب سانس داں خود مافوق الفطرت اشیاء کے امکان کو تسلیم کر رہی ہے، اور اگر بالفرض کل سانس کے نظریات دوبارہ بدل جائیں تو اس کی سچائی میں اس وقت بھی ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی، لیکن یہ اقوال ہم نے صرف یہ بتانے کے لئے پیش کئے ہیں، کہ جن لوگوں نے مروجہ نظریات سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کی تفسیر میں کتر بیونت کرنے کی کوشش کی تھی اُن کی بنیاد کس قدر کمزور اور ناپائیدار تھی، انہوں نے ایک ایسے کلام کو وقتی نظریات کے پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی تھی، جس کا عالم ماضی مستقبل کی تمام دستوں کو محیط ہے، اور جس کے آگے فکر انسانی کی تمام کاوشیں بچوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں،

لہذا اگر قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانے کے بجائے اُس سے واقعہ رہمانی حاصل کرنی ہے، تو اسے راجح الوقت نظریات کی عینک سے پڑھنے کے بجائے اُس طرح پڑھتے جس طرح سرکارِ دُعا عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے پڑھا تھا، اور اس کی تشریح و تفسیر کے وقت مروجہ افکار کے شور و غل سے متاثر ہونے کے بجائے اصول استعمال کیجئے جو تفسیر کے فطری معقول اور واقعی اصول ہیں، ان اصولوں کے ذریعہ

رہیقہ شیبہ صفحہ گذشتہ) (Miracle) اس مقالے میں تقریباً اسی نگار نے معجزات کے امکان اور ضرورت پر اچھی بحث کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ معجزات نہ صرف عقل اور سائنس کی رُو سے ممکن ہیں بلکہ انکی ضرورت ناقابل تردید ہے، اس کے علاوہ معجزہ کے موضوع پر مندرجہ ذیل کتابیں بطور خاص قابل مطالعہ ہیں: (۱) سیرۃ النبیؐ، اتاوص ج ۳، باب مؤلفہ مولانا عبد الباقی ندوی، (۲) موقف العقل والحلم والعالم، مؤلفہ شیخ مصطفیٰ صبری بک، (۳) اسلام اور معجزات، مؤلفہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ،

جو بات قرآن کریم سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسے جھینپ جھینپ کر اور شرما شرما کر نہیں، بلکہ پورے یقین دایمان اور خود اعتمادی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیجئے، اور زمانے کے مردِ جوہرِ نظریات ہزار اس کے خلاف ہوں، یہ یقین رکھئے کہ حق وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کر دیا، اگر انسانیت کی قسمت میں کوئی فلاح رکھی ہے تو وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کے بیان کئے ہوئے حقائق تک پہنچ کر رہے گی،

یہاں ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر

خلافِ عقل اور ماورائے عقل

تفسیر کے معروف اصول و قواعد کے مطابق کوئی ایسی بات قرآن کریم کی طرف منسوب ہوتی ہو جس کے بارے میں ہم جدید تحقیقات کی روشنی میں کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں کہ وہ عقل یا مشاہدے کے خلاف ہو تو پھر قرآن کریم کی اسی قدیم تفسیر پر اصرار کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم مفسرِ قرآن کریم کی باتوں کو قطعی مشاہدات کے خلاف قرار دیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات منسوب کریں جو یقینی مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ مفسرِ قرآن کریم کی جو تفسیر قطعی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام کے اجماع و اتفاق سے ثابت ہو، وہ آج تک کبھی عقل یا قطعی مشاہدے کے خلاف ثابت نہیں ہوئی، چودہ سو سال کے عرصے میں علمی تحقیقات و انکشافات میں سینکڑوں انقلاب آئے، لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مفسرِ قرآن کریم کی کوئی قطعی الثبوت تفسیر مشاہدے کے خلاف بڑھی ہو، اور چونکہ مفسرِ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی قوی اور عملی تفسیر ہی کے لئے مبعوث کیا گیا تھا، لہذا آپ کی بیان کردہ ہر تفسیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت کے مطابق ہے، اور آپ کی کوئی تفسیر آئندہ بھی عقل یا مشاہدے کے خلاف نہیں ہو سکتی،

البتہ اس معاملے میں غلطی دو طرح لگتی ہے :-

(۱) جو لوگ زمانے کے مردِ جوہرِ نظریات سے بہت جلد مرعوب ہو جانے کے عادی ہیں، وہ کسی چیز کے خلاف عقل ہونے کا فیصلہ بہت جلد کر ڈالتے ہیں، یہ ایک طے شدہ

مسئلہ ہے کہ ہر حیرت انگیز چیز خلافت عقل نہیں ہوتی، اور نہ ہر اس چیز کو ناممکن کہا جاسکتا ہے جس کے اسباب سمجھ میں نہ آئے ہوں، ایسی چیز کو مستبعد (improbable) غیر معمولی (Extra ordinary) یا حیرت انگیز (astonishing) کہنا خود خلافت عقل کا تو کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کو ناممکن (impossible) کہنا خود خلافت عقل کا جو شخص متعلقہ فن سے واقف نہ ہو اس کے لئے یہ بات قطعی ناقابل فہم ہے کہ وائرلس سیٹ میں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے انسان کی آواز کس طرح سنائی دے رہی ہے؟ اور اگر کسی دیہاتی کے سامنے یہ بات کہی جائے تو عجب نہیں کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وائرلس سیٹ میں دور دراز کے کسی آدمی کی آواز سنائی دینا "خلافت عقل" یا "ناممکن" ہے، بعض حضرات قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے، بلکہ ہر اس چیز کو "خلافت عقل" یا "ناممکن" قرار دیتے ہیں جو محض حیرت انگیز یا زیادہ سے زیادہ خلافت عادت اور مستبعد (improbable) معلوم ہوتی ہے، حالانکہ قرآن کریم اور احادیث وغیرہ میں اس قسم کی باتوں کا پایا جانا ہرگز محل تعجب نہیں، ہم کتاب کے شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ وحی نبوت کا آغاز ہی اُس مقام سے ہوتا ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وحی در رسالت کے سلسلے کا تو مقصد اصلی یہی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کو ان باتوں سے باخبر کیا جائے جنہیں وہ محض عقل کے ذریعے نہیں جان سکتا، چنانچہ اگر وحی در رسالت کا سلسلہ نہ ہوتا تو عقل معاد و آخرت حساب و کتاب، جنت و جہنم اور ملائکہ وغیرہ کا ادراک از خود نہیں کر سکتی تھی، ورنہ اگر یہ ساری باتیں نری عقل سے معلوم ہو سکتی تھیں تو انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمانے، ان کو وحی نازل کرنے اور انھیں آسمانی کتابیں دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، لہذا اگر وحی اور رسالت پر ایمان ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علم کے اس ذریعے سے ہمیں بہت سی باتیں ایسی معلوم ہوں گی جو محض عقل سے معلوم نہ ہو سکتی تھیں، اور جن کا ادراک و تصور عقل کے لئے مشکل تھا،

اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ قرآن و حدیث میں ایسی حیرت انگیز چیزوں کا وجود ان کے

موضوع کے لحاظ سے بالکل مناسب بلکہ ضروری ہے، تو قرآن کریم کی کسی ظاہر و مقبوار اور اجماعی تفسیر کو محض اس بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے ایک حیرت انگیز بات ثابت ہوتی ہے، تا وقتیکہ وہ بات واقعہً خلاف عقل یعنی ناممکن اور محال نہ ہو، لیکن قرآن کریم کی قطعی تفسیروں میں آج تک کوئی بات ایسی ناممکن اور خلاف عقل ثابت نہیں ہو سکی اور نہ قیامت تک ہو سکتی ہے، اس مسئلے کی مزید تفصیل و شرح ہم انشاء اللہ اگلے باب میں اصول تفسیر کے تحت کریں گے،

(۲) دوسری غلطی بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی تفسیر قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، نہ قرآن کریم کے سیاق و سباق سے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی قطعی تفسیر سے، نہ اُمت مسلمہ کے اجماع سے، اس کے باوجود وہ تفسیر عام لوگوں میں اتنی مشہور ہو جاتی ہے کہ لوگ اسے یقینی اور قطعی تفسیر سمجھنے لگتے ہیں، اور جب وہ عقل کی کسی قطعی دلیل یا مشاہدے کی بنا پر غلط ثابت ہوتی ہے تو بعض نادان لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں، اور بعض شران کریم یا اس کی یقینی اور قطعی تفسیروں کے بائے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اسی طرح خلاف عقل ہو سکتی ہیں، لہذا ایسے موقع پر یہ دیکھنا چاہو کہ قرآن کریم کی جو تفسیر عقل کی کسی دلیل قطعی یا مشاہدے کے خلاف معلوم ہو رہی ہے وہ کس کی ہے؟ محض عام شہرت کی بنا پر اسے یقینی تفسیر سمجھ لینا غلط ہے،

یہ بحث ”اصول تفسیر“ کے تحت قدرے تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے، کہ جب عقلی اور نقلی دلائل میں تضاد معلوم ہو تو صحیح راہ عمل کیا ہے؟ اُس موقع پر اس بحث کو ضرور دیکھ لینا چاہئے،

۲۔ قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا،

تفسیر قرآن کے بائے میں چوتھی مگر ابھی یہ ہرگز کہ بعض لوگ قرآن کریم کے موضوع کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھتے، اور اس میں وہ باتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے موضوع سے خارج ہیں، مثلاً بعض حضرات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم

سے کائنات کے تمام سائنسی اور طبعی حقائق مستنبط کئے جائیں، اور سائنس کے مسلمات کو قرآن سے ثابت کیا جائے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن سے سائنس کے یہ مسائل ثابت ہو سکیں تو معاذ اللہ، یہ قرآن کریم کا نقص ہوگا، چنانچہ وہ پورے خلوص کے ساتھ قرآنی آیات سے سائنسی مسلمات ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور بعض اوقات اس غرض کے لئے قرآنی الفاظ کو غلط معنی پہناتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے، اس میں اگر کہیں کائناتی حقائق کا ذکر آیا ہے تو ضمنی طور سے آیا ہے، لہذا اگر اس میں کہیں کوئی سائنٹفک حقیقت واضح طور سے مل جائے تو اس پر تو بلاشبہ ایمان رکھنا چاہئے، لیکن سائنس کا کوئی مسئلہ پہلے سے ذہن میں رکھ کر قرآن کریم سے لے کر زبردستی نکلانے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص طب کی کتاب میں قانون کے مسائل تلاش کرنے لگے،

قرآن کریم نے اپنا موضوع اور مقصد نزول مبہم نہیں چھوڑا، بلکہ بیسیوں آیات میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اُسے کیوں نازل کیا گیا ہے؟ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:-

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ هُتَيْدِي بِهٖ اللَّهُ مَرِيٓتَ
اتَّبِعْ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجْكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ
بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيكُمْ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ (مائدہ: ۱۶۵)

”تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے، اور کتاب واضح
کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رخصائے حق کے طالب ہوں
سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر
نور کی طرف لے آئے ہیں، اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں“

يَا اَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى قَلْتٍ
مِّنَ الرَّسُوْلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا تَنْبِرُوْا فَاَنْتُمْ
بَشِيْرٌ مِّنْ بَرٍّ (مائدہ: ۱۹)

اے اہل کتاب تمہارے پاس یہ ہمارے رسول آپ بھیجیں جو تم کو صاف
صاف بتلاتے ہیں، ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ (عرصہ) موقوف
تھا تا کہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا نہ آیا،
نہ ڈرانے والا، تو اب تمہاریے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے
والا آگیا ۛ

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ، لِكُلِّ جَعَلْنَا مَتَكُمُ شُرْعَةً وَ
مِنْهَا جَاهًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن
لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ
جَمِيعًا، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (مائدہ: ۴۸)

ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے، جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف
ہے اور اس سے پہلے جو (آسمانی) کتابیں ہیں ان کو بھی تصدیق کرتی ہے،
اور ان کتابوں کی محافظہ کر تو ان کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی
کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے، اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے
دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے، تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے
خاص مشریت اور خاص طریقہ تجویز کیا تھا، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور
ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت میں کر دیتے، لیکن ایسا نہیں کیا، تاکہ جو
دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرمادیں، تو میکوں کی طرف
درڑو، تم سب کو خدا ہی کے پاس جانہے، پھر وہ تم سب کو جلا دیگا
جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ۛ

وَكَذَٰلِكَ نَقُصُّ لَكَ الْآيَاتِ وَلِنَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ ۝

”اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ مکمل جاوے

طریقہ کنہنگاروں کا“

كِتَابٌ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صُدُورِكَ حَوَاجٌّ مِنْهُ لِتُنْزِلَ بِهِ
وَرَدَّ كُرْئِي لِلْمُؤْمِنِينَ (اعراف: ۱)

یہ قرآن، ایک کتاب ہے جو آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعے (لوگوں کو نافرمانی سے) ڈرائیں، سو آپ کے دل میں کسی کے نہ ماننے سے، بالکل تسلی نہ ہونی چاہئے، اور یہ نصیحت ہے ایمان والوں کی جو

أَوْعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِنْكُمْ
لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (اعراف: ۶۳)

تیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا بشر ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈراوے اور تاکہ تم ڈرجاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے“

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ هُدًى وَرَحْمَةً لِلْمُحْسِنِينَ
الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ
هُمْ يُوقِنُونَ (لقمان: ۲)

یہ آیتیں ہیں ایک پر حکمت کتاب کی، جو کہ ہدایت اور رحمت ہیں نیکو کاروں کے لئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور وہ لوگ آخرت پر پورے یقین رکھتے ہیں“

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ
أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مِمَّا آتَاهُمْ مِنْ
نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (سجدة: ۳)

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اس میں کچھ شبہ نہیں، یہ رب العالمین کی طرف

سے ہے، کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے دل سے بنا لیا ہے، بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے، تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، تاکہ وہ لوگ راہ پر آجائیں !!

تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ لِتُنذِرَ رِقَوْمًا مَّا أَنْذَرْنَا بآبَاءِهِمْ
فَهُمْ غَافِلُونَ (یس: ۶۵)

یہ قرآن خدا سے زبردست مہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے تھے، سو اسی سے یہ بے خبر ہیں !!

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ
الِدِينَ، (زمر: ۲)

”ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل کیا ہے، سو آپ خاص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کیجئے“

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَى وَمَنْ
حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجُمُعِ لَا رَيْبَ فِيهِ، فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ
قَرِيبٌ فِي السَّعِيرِ (شوری: ۷)

”ہم نے اسی طرح آپ پر قرآن عربی وحی کے ذریعے نازل کیا ہے، تاکہ آپ مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے ارد گرد ہیں، ان کو ڈرائیں، اور جمع ہونے کے دن (یعنی قیامت) سے ڈرائیں، جس میں ذرا شک نہیں، ایک گروہ جنت میں ہوگا، ایک گروہ دوزخ میں !!“

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ أَعْيُنٍ مِنَ الْعَامِلِينَ لَتُبْعُوا أَهْلَ الْأَرْضِ
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ، إِنَّهُمْ لَنُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ سِدْقًا
وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَرَى الْمُتَّقِينَ

هَذِهِ آيَاتُ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ لِقَوْمٍ يُؤْتُونَ

(الجماعیۃ: ۲۰۱۸)

پھر ہم نے آپ کو (دین کے) ایک خاص طریقے پر کر دیا، سو آپ اس طریقے پر چلے جاتیے، اور ان جملہ کی خواہشوں پر نہ چلئے، یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے، اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں، اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا، یہ قرآن عام لوگوں کے لئے ^{تسبیح} بتیاری اور ہدایت (پر مشتمل ہے) اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت رکھتا ہے۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْكِتَابِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانًا تَقْسَعُ مِنْهُ
مُجُودٌ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ مِجْلُودُهُمْ وَقَلْبُكُمْ
إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكُمْ هُدًى اللَّهُ يَهْدِي بِهٖ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُضَلِلْ
اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (زمزم: ۲۳)

”اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (قرآن) نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہو کہ ہر کہہ باہم بلتی جلتی ہے، (اور جس میں ضروری باتیں) بار بار دہرائی گئی ہیں جس سے ان لوگوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے، جس کو وہ چاہتا ہے اس کے لئے ذریعہ ہدایت کرتا ہے، اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں“

یہ محض چند مثالیں ہیں، اور اگر صرف اپنی پر غور کر لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد انسان کو آخرت کی تیاری پر آمادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم و ترغیب ہے، اور جتنی باتیں اس میں تاریخی واقعات یا کائنات و آفاق سے متعلق آئی ہیں وہ سب اسی بنیادی موضوع کی تائید و تقویت کے لئے آئی ہیں، لہذا اگر اس میں سائنس کا کوئی مشہور مسئلہ موجود نہ ہو تو نہ یہ کوئی عیب کی بات ہے نہ تعجب کی، کیونکہ یہ اس کا موضوع ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر

ماضی مستقبل کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں نہ ملے تو یہ بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ تاریخ کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں جستہ جستہ واقعات عبرت اور موعظت کے لئے بیان کئے گئے ہیں،

اس سے بعض اُن غیر مسلموں کا اعتراض بھی دُور ہو جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی ممالک نے جن علوم و فنون کے ذریعے مادی ترقی کی ہے، اُن کے بارے میں قرآن کریم نے کچھ کیوں نہیں بتایا؟ اور اُن لوگوں کی غلط فہمی بھی دُور ہو جاتی ہے جو ان اعتراضات سے متاثر ہو کر اس شکر میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے سائنس وغیرہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جاسے، کیونکہ اس کوشش کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص قانون کی کسی کتاب پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس میں ایٹم بم بنانے کا طریقہ کیوں مذکور نہیں؟ تو اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص قانونی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے ایٹم کی تصوری نکالنے کی کوشش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ یہ اُس اعتراض کا جواب نہیں، بلکہ ایک مذاق ہوگا، اسی طرح جو شخص قرآن کریم میں سائنس اور انجینئرنگ کے مسائل نہ ہونے پر اعتراض دے، اس کا صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ قرآنی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے سائنس کے مسائل زبردستی نکالے جائیں، بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نہ سائنس یا انجینئرنگ کی کتاب ہے، اور نہ مادی ترقی حاصل کرنے کے طریقے اس کا موضوع ہیں، چونکہ یہ ساری باتیں انسان اپنی عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے معلوم کر سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی محنت و کاوش اور تحقیق و جستجو پر چھوڑ دیا، اور ان باتوں کو قرآن کریم کا موضوع بنایا جو محض انسانی عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں، بلکہ اُن کے ادراک کے لئے وحی الہی کی رہنمائی ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے موجودہ مقام تک پہنچ گیا، لیکن ایمان و یقین کی دولت، قلب و رُوح کی پاکیزگی، اعمال و اخلاق کی تطہیر، اللہ کے ساتھ بندگی کا تعلق اور آخر دی زندگی سنوارنے کا جذبہ جو وحی الہی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اور جسے قرآن کریم نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ عقل و فکر کی اس حیرت انگیز نگاہ تا

کے بعد بھی انسان کو نہ حاصل ہو سکا ہے، اور نہ اُس وقت تک حاصل ہو سکتا ہے جب تک اس معاملے میں سچے دل سے قرآن کی رہنمائی حاصل نہ کی جائے،

ہماری اس گزارش کا منشار یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم سے سائنس کا کوئی مسئلہ اخذ کرنا علی الاطلاق کوئی جرم ہے، ہمیں یہ تسلیم ہے کہ قرآن کریم میں ضمنی طور سے سائنس کے بہت سے حقائق کا بیان آیا ہے، چنانچہ جہاں اس کی کسی آیت سے کوئی واضح سائنٹفک بات معلوم ہو رہی ہو اسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس معاملے میں درجہ ذیل غلطیوں سے پرہیز لازمی ہے۔

(۱) سائنس کی جو بات قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ضمناً مذکور ہے، اس کا اصل مقصد ان حقائق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار اور اس کے ذریعے ایمان میں پختگی پیدا کرنا ہے، لہذا اس بنیاد پر قرآن کریم کو سائنس کی کتاب سمجھنا یا باور کرنا بالکل غلط ہے،

(۲) جہاں سائنس کے کسی مسئلے کی مکمل وضاحت موجود نہ ہو وہاں خواہ مخواہ الفاظ اور سیاق و سباق کو توڑ موڑ کر سائنس کی کسی دریافت پر حسیان کرنے کی کوشش کسی طرح درست نہیں، یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی؛

جس وقت سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ مشہور ہوا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور دوسرے ستارے اس کے گرد حرکت کرتے ہیں تو بعض لوگوں نے اس نظریہ کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کی، اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا گیا:-

أَمْ نَجْعَلُ الْأَرْضَ مَسَرًّا،

یا وہ ذات لائقِ عبادت ہی جس نے زمین کو

جائے قرار بنایا ؟

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ”جائے قرار“ کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے، حالانکہ قرآن کریم کا مقصد تو یہ بیان کرنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ تم زمین پر ڈاؤنڈول رہنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ رہتے ہو، اور اس میں لیٹنے،

بیٹھنے اور قرار حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی تکلیف برداشت کرنی نہیں پڑتی، اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا زمین کی حرکت و سکون سے کوئی تعلق نہیں بلکہ زمین متحرک ہو یا ساکن، یہ نعمت ہر صورت میں انسان کو حاصل ہے، اس لئے اس آیت سے زمین کو ساکن ثابت کرنا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے،

پھر جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو بعض حضرات کو یہ نظریہ بھی قرآن سے ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوئی، اور مندرجہ ذیل آیت کو حرکت زمین کی تائید میں پیش کر دیا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدًا وَهِيَ
كَمُزْمَرٍ مِّنَ الشَّجَابِ ۝

”اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ یہ جامد ہیں“

اور یہ بادل کی طرح چل رہے ہوں گے“

ان حضرات نے یہاں ”کمزرم“ کا ترجمہ ”چل رہے ہوں گے“ کے بجائے ”چل رہے ہیں“ کر کے یہ دعویٰ کیا کہ اس آیت میں زمین کی حرکت کا بیان ہے، کیونکہ پہاڑوں کے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین چل رہی ہے، حالانکہ آیت کا سیاق و سباق (Context) صاف بتا رہا ہے کہ یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے، اور آیت کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ سارے پہاڑ جنھیں تم اپنی جگہ اٹل سمجھتے ہو فضا میں بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے، لیکن قرآن کریم سے سائنس کے مسائل مستنبط کرنے کے شوق نے سیاق و سباق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا،

واقعہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت اور سکون کے بارے قرآن کریم خاموش ہے، اور پورے قرآن میں کہیں اس مسئلے کا بیان نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بات اس کے موضوع سے خارج ہے، نہ قرآن سے زمین کی حرکت ثابت ہوتی ہے نہ سکون، لہذا سائنس کے دلائل کے لحاظ سے اس میں سے جو نظریہ بھی اختیار کیا جائے قرآن اس میں مزاحم نہیں ہوتا، اور نہ اُس سے دین و ایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے،

۲۹۹

تفسیر کے چند ضروری اصول

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن کریم کی تفسیر اور اس سے احکام و قوانین کا استنباط ایک بہت وسیع موضوع ہے، اور اس کے مکمل اصولوں کو سمجھنے کے لئے عربی زبان و ادب، نحو و صرف، بلاغت اور علم حدیث و فقہ کی واقفیت ضروری ہے، لہذا اس کتاب میں یہ تمام اصول بیان نہیں ہو سکتے، علم اصول فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم سے احکام و قوانین مستنبط کرنے کے اصولوں پر ہی مشتمل ہے، اور جو شخص اس موضوع کا مفصل علم حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لئے علم اصول فقہ کو ماہر اساتذہ سے پڑھنا ضروری ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہاں تفسیر قرآن کے سلسلے میں چند وہ موٹے موٹے اصول بیان کر دیں جو علم اصول فقہ کی پوری ہمارت کے بغیر بھی سمجھ میں آسکتے ہیں، اور جن کو نظر انداز کرنے کی بنا پر تفسیر کے معاملے میں بڑی غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پھیل رہی ہیں، یہ تفسیر کے مکمل اصول نہیں ہیں، بلکہ اس علم کے جستہ جستہ مباحث ہیں، جنہیں عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق انتخاب کر کے پیش کیا جا رہا ہے، واللہ الموفق والمعين،

۱۔ قرآن کریم اور مجاز

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ بعض اوقات ایک لفظ سے اس کے حقیقی معنی مراد

نہیں ہوتے، بلکہ مجازی معنی مراد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ”شیر“ کے حقیقی معنی تو ایک مخصوص درندے کے ہیں، لیکن بسا اوقات یہ لفظ ”بہادر انسان“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ایسی کامصرعہ مشہور ہے

کس شیر کی آمد ہے کہ زن کانپ رہا ہے

یہاں شیر سے مراد وہ درندہ نہیں ہے، بلکہ بہادر انسان ہے، اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ کسی خاص مناسبت سے کسی ایسے معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں جو ان کے لغوی اور حقیقی معنی نہیں ہوتے، قرآن کریم میں بھی بہت سے الفاظ اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ ان سے مجازی معنی مراد لگتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ قرآن کے جس لفظ کو چاہے حقیقی معنی پر اور جس کو چاہے مجازی معنی پر محمول کر سکتا ہے، بلکہ علماء اُمت نے اس کا ایک ایسا ضابطہ بنایا ہے جو سونی صد معقول ہے اور جس پر تمام علماء متفق ہیں، یہاں اس ضابطے کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ ضابطہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اصل یہ ہے کہ ان سے حقیقی معنی مراد ہوں گے، اور مجازی معنی صرف اُس وقت مراد ہوں گے جب حقیقی معنی کسی مجبوری کی وجہ سے مراد نہ ہو سکتے ہوں، اور جہاں کوئی مجبوری نہ ہو وہاں مجازی معنی مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا، مجبوری کی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ حقیقی معنی عقلی طور پر یا قطعی مشاہدے کی رُو سے ممکن نہ ہوں، اور عقلی طور پر ممکن نہ ہونے کی مفصل تشریح انشاء اللہ اگلے اصول میں ”قرآن کریم اور عقلی لائل“ کے زیر عنوان آئے گی،

۲۔ عوت اور محاورے کے اعتبار سے اُس لفظ یا جملے کے حقیقی معنی متروک ہو گئے ہوں، مثلاً کفار کے بارے ارشاد ہے :-

فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ

”یہ لوگ تھوڑا ہی ایمان لاتے ہیں“

لفظ ”قلیل“ کے حقیقی معنی ”تھوڑے“ یا ”کم“ کے ہیں، لیکن ایسے مقامات پر عوت اور

مجاہدے میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے کہ وہ ایمان تو لاتے ہیں مگر تھوڑا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بالکل ایمان نہیں لاتے، اور اس طر "قلیلاً" کا لفظ مجازاً نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اردو میں "تھوڑا ہی" اور انگریزی میں "few" کا بھی یہی حال ہے۔

۳۔ مجازی معنی مراد لینے کے لئے تیسری مجبوری یہ ہوتی ہے کہ عبارت کے سیاق و سباق میں کوئی قرینہ ایسا ہوتا ہے جو حقیقی معنی کو ناممکن بنا دیتا ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔

پس جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

ان الفاظ کا ٹھیک لغوی اور حقیقی مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور کفر کی مساوی اجازت ہے، لیکن آگے ارشاد ہے :-

إِنَّا آَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ

بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایمان اور کفر مساوی طور سے جائز ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دونوں کا انجام واضح ہو جانے کے بعد انسان کو اختیار ہو کہ وہ کفر کی راہ پر باقی رہے یا ایمان لے آئے، پہلی صورت میں اسے عذاب جہنم سے واسطہ پڑے گا اور دوسری صورت میں وہ رضاءِ الہی سے بہکنار ہوگا،

ان مجبوریوں کے سوا کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی پر محمول کرنا ہرگز درست نہیں، یہ ایک متفقہ اصول ہے، اور اس کی معقولیت ناقابل انکار ہے اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کلام سے مجازی معنی مراد لینے کی کھلی چھٹی دیدی جائے،

۱۔ یہاں ہم نے اس مسئلہ کے مفصل معنی مباحث سے بچتے ہوئے سادہ الفاظ میں اس اصول کا خلاصہ بیان کیا ہے اس موضوع کی مکمل اور جامع و مانع بحث کیلئے اصول فقہ کی کتاب میں ملاحظہ فرمائی جائیں، بالخصوص فخر الاسلام بزدویؒ کی اصول اور اس کی شرح "کشف الاسرار لعبد العزیز البخاریؒ،

تو قرآن کریم کی کوئی آیت معنوی تعریف سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور ہر شخص اپنی من مانی نظریات کو قرآن کریم میں ٹھونس کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں الفاظ کے مجازی معنی مراد ہیں بلکہ بات صرف حقیقت اور مجاز تک ہی محدود نہیں، بسا اوقات ایک ہی لفظ یا ایک ہی جملے کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں، اور وہ سب اس کے حقیقی معنی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں بھی مسلمہ قاعدہ یہ ہے کہ جو معنی عرف اور محاورے کے لحاظ سے زیادہ قریبی ظاہر اور متبادر ہوں ان کو اختیار کیا جائے گا، اور دور دراز کے معانی کو اس وقت تک اختیار نہیں کیا جاسکتا جب تک قریبی معنی مراد لینے میں مذکورہ بالا مجہولوں میں سے کوئی مجبوری لاحق نہ ہو، یا خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد سے دوسرے معنی ثابت نہ ہو جائیں، چنانچہ علامہ بدر الدین زکریاؒ و تخریر فرماتے ہیں:-

أَحَدٌ هُمَا أَنْ يَكُونَنَّ أَحَدٌ هُمَا أَظْهَرُ مِنَ الْأَخْرَجِ، فَيَجِبُ
الْحَمْلُ عَلَى الظَّاهِرِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْمُرَادَ هُوَ
الْخَفِيُّ دُونَ الظَّاهِرِ فَيُحْمَلُ عَلَيْهِ،

قرآن کریم میں ایک سے زائد معانی کے احتمال کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک معنی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہوں، ایسی صورت میں وہی معنی مراد لئے جائیں گے جو زیادہ ظاہر ہیں، الایہ کہ کوئی دلیل اس بات پر قائم نہ ہو جا سکے کہ یہاں ظاہری معنی کے بجائے پوشیدہ معنی مراد ہیں، ایسی صورت میں پوشیدہ معنی مراد لینا ضروری ہوگا۔

یہ اصول اس قدر بدیہی (self evident) اور معقول ہے کہ قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، عام انسانی گفتگو میں بھی اس پر عمل کتے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو کسی بھی شخص کی بات کو صحیح طور سے سمجھنا ممکن نہ رہے، فرض کیجئے کہ ایک مسافر فریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر اپنے

نوکر سے کہتا ہے کہ ”ٹکٹ لے آؤ“ اس کے جواب میں اگر نوکر ریلوے کا ٹکٹ لانے کے بجائے ڈاک کا ٹکٹ لے آئے تو اسے ساری دنیا احمق قرار دے گی، اگرچہ ”ٹکٹ“ کے لفظ میں دونوں احتمال موجود تھے لیکن نوکر کی حماقت یہ ہے کہ اس نے ریلوے اسٹیشن کے ماحول میں ٹکٹ کے ظاہری اور قریبی معنی کو چھوڑ کر دُور کے معنی مراد لئے، اسی طرح اگر کسی شہر کا حاکم کسی انجینئر کو یہ حکم دے کہ فلاں جگہ ایک نہر کھودی جائے جس سے آس پانی کی آبادی سیراب ہو سکے، اور انجینئر اس کا یہ مطلب بیان کرے کہ نہر کھودنے سے یہاں مراد ایک درسگاہ قائم کرنا ہے جس سے آس پاس کی آبادی تعلیم حاصل کر سکے، اور اپنے آس و جوئے کی تائید میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا کلام پیش کر دے کہ انھوں نے درسگاہ کے لئے ”نہر“ کا لفظ استعمال کیا ہے، تو ایسے انجینئر کو آپ کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ ساری دنیا اُسے دیوانہ قرار دے گی، کیونکہ ”نہر“ کے لفظ کو مجازاً ”درسگاہ“ کے معنی میں بے شک استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس لفظ کی یہ تشریح اسی وقت درست ہو سکتی ہے جبکہ ”نہر“ کے اصلی اور حقیقی معنی کے خلاف کوئی دلیل یا قرینہ موجود ہو، اور مذکورہ مثال میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں تھی،

بعض لوگ اس واضح اصول کو پس پشت ڈال کر قرآن کریم کی تفسیر میں شدید گمراہیوں کے شکار ہو گئے ہیں، قدیم زمانے میں ملحدین کی ایک جماعت قرامطہ یا باطنیہ کے نام سے گزری ہو، اس نے تو اپنے مذہب باطل کی پوری عمارت اسی طرح کھڑی تھی کہ قرآن کریم کے ہر لفظ کو اس کے ظاہری اور حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اسے عجیب و غریب معانی پہناتے تھے، چنانچہ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم میں ”صلوٰۃ“ (نماز) سے مراد امام (یعنی باطنی لیڈر) کی اطاعت ہے، ”حج“ سے مراد اُس لیڈر کی زیارت اور خدمت ہے، ”صوم“ (روزے) سے مراد اس لیڈر کا راز فاش کرنے سے پرہیز ہے، نہ کہ کھانے پینے سے، اور ”زنا“ سے مراد باطنی فرقے کا کوئی راز فاش کرنا ہے، اسی طرح عَصَا مِوٰی

سے خزاں کے نزدیک حضرت موسیٰ کا غالب آجانا ہے، اور بادل کے سایہ کرنے سے مراد انکی حکومت کا قیام ہے،

ہمارے زمانے میں بھی بہت سے مصنفین نے اس اصول کی خلافت ورزی کر کے تفسیر کے معاملے میں خطرناک ٹھوکریں کھائی ہیں؛ مثلاً انیسویں صدی کے آغاز میں مغربی فلسفے کی سرسری معلومات کی بنیاد پر عالم اسلام کے بعض "جذبات پسند" حضرات اسلامی عقائد میں سے اُن تمام چیزوں کا انکار کر بیٹھے تھے، جنہیں مغرب کے لوگ "توہم پرستی" کا طعنہ دیا کرتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے قرآن کریم میں ایسی ایسی تحریفات کی ہیں جنہیں دیکھ کر دل لرز اٹھتا ہے، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی تقریباً آدھی آیات کو مجاز، استعارہ اور تمثیل قرار دیا ہے، مثال کے طور پر قرآن کریم میں دسیوں مقامات پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، اُن کے آگے فرشتوں کے سجدہ ریز ہونے اور ابلیس کے انکار کا واقعہ بیان ہوا ہے، لیکن چونکہ مغرب میں ڈارون (Darwin) کا نظریہ ارتقاء اُس دور میں کافی مقبول ہو رہا تھا، اور اس کی کچھ ناتمام سی اطلاعات ہندوستان میں بھی پہنچ رہی تھیں، اس لئے انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام، فرشتوں اور ابلیس کا جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ محض ایک تمثیل ہے، اور نہ آدم علیہ السلام کا کوئی شخصی وجود ہے، نہ فرشتوں کا اور نہ ابلیس کا۔ چنانچہ سرسید احمد خان صاحب لکھتے ہیں:-

"آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے، جس کو عوام الناس اور مسجد کے مثلاً باو آدم کہتے ہیں، بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:-

"اس قصے میں چار فریق بیان ہوئے ہیں، ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی

۱۔ الملک والنخل للہرستانی ۲ مع حاشیہ ص ۳۳۲ ج ۱،

۲۔ تفسیر القرآن از سرسید احمد خان ص ۲۸ ج ۱،

۳۔ غیرت ہے کہ خدا کا مطلب تو سین میں ماڑہ وغیرہ نہیں بتایا،

قوائے ملکوئی) تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم ربیعنی انسان جو مجموعہ ان قوی کا ہے، اور جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں) مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے۔

سوال پیدا ہوا کہ قرآن نے تو فرشتوں کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں، اس کے جواب میں سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”جو قوی جس کام کے لئے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں کہ وہ ہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے، قوت نامیہ انما اور قوت ناطقہ لطق، قوت احراق حرقت، قوت سیالہ سیلان، قوت جامدہ انجماد کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی“

پھر سوال پیدا ہوا کہ آدم کے جنت میں رہنے، شجرہ ممنوعہ کھانے اور وہاں سے زمین پر اتارے جانے (ہبوط) کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں ”مجاز و تمثیل“ کی یہ کرشمہ کاری ملاحظہ فرمائیے :-

”ہم شروع ہی سے اس قصہ (یعنی آدم و ابلیس کے واقعہ) کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے، بلکہ صرف انسانی فطرت کا اس فطرت کی زبان حال سے بیان قرار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہے، جب تک وہ مکلف کسی امر و نہی کا نہ تھا.... اور اس کا شجر ممنوعہ کے پاس جانا، اس کا پھل کھانا، اس کی فطرت کی اس حالت کا بیان ہے جبکہ وہ غیر مکلف سے مکلف ہوا، ہبوط (یعنی اترنے) کے لفظ کا استعمال قرآن انتقال مکان ہی پر مختص نہیں ہے۔“

پھر بھی کوئی پوچھ سکتا تھا کہ اسی واقعہ میں ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا :-

”قواتے سمیٹتے کو جن کا مہیا آحرارتِ غریزی وحرارتِ خارجی ہے آگ سے مخلوق

ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک اُن کی فطرت کا بتلانا ہے۔“

اب پورے واقعہ کا خلاصہ خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے۔

”یہ فطرتِ انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارے میں بیان کی ہے، اس لئے تمام

فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے، سن رشد و تمیز کے پہنچنے کو درخت

معرفةِ خردِ شر کو پھل کھانے سے، انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے

پتوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے، مگر شجرۃ الخلد کے پھل تک اس کو نہیں پہنچایا،

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں ملے۔“

ان اقباسات پر ہم کسی علی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے، قرآن کریم میں حضرت

آدم اور ابلیس کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے، اور مذکورہ بالا تا دیلات و تخریفات کو اس پر چسپاں

۱۱ تفسیر القرآن از مسید احمد خان، ص ۱۵۹ ج ۱۱

۱۱ البتہ مذکورہ بالا تخریفات پر ہمیں فرقہ باطنیہ کا مشہور لیڈر عبید اللہ بن الحسن الیقروانی یا آگیا،

جس نے اپنے ایک پیرو کو لکھا تھا: اِنِّیْ اَوْصِیْکَ بِتَشْکِیْکِ النَّاسِ فِی الْعُرْآنِ وَالتَّوْرَةِ وَالزَّبُورِ

الانجیل ویدعوہم الی الباطل الشرائع والی الباطل المعاد والنشور و الباطل الملائکۃ فی السماء

والباطل الجن فی الارض و اوصیک بان تدعوہم الی القول بانه کان قبل آدم بشر کثیر فان ذلک

عون علی قدم العالم (الفرق بین الفرق، ص ۲۹۶ و ۲۹۷) یعنی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ،

لوگوں کو قرآن، توراہ، زبور اور انجیل کے بارے میں شکوک و شبہات کا تکرار بناؤ، انھیں تمام

شرعی قوانین کے باطل ہونے کی طرف دعوت دو، اور آخرت اور حشر و نشر، آسمان میں ملائکہ اور

زمین میں جنات کے تصور کو مٹاؤ، نیز میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ لوگوں کو اس اعتقاد کی طرف

دعوت دو کہ آدم (علیہ السلام) سے پہلے بھی بہت سے انسان ہو چکے ہیں، کیونکہ یہ اعتقاد دنیا

کو غیر فانی ثابت کرنے میں تمہارا مددگار ثابت ہوگا،

کر کے دیکھئے، خود اندازہ ہو جائے گا کہ حقیقت و مجاز کے بارے میں جو مسئلہ اصول اور پر بیان کیا گیا ہے اس کو نظر انداز کر کے کیسی کیسی لغو باتیں فترآن کریم کی طرف منسوب کی گئی ہیں اسی طرح فترآن کریم جا بجا جنت کی نعمتوں کے بیان سے بھرا پڑا ہے، اس میں جنت کے ہرے بھرے باغات، بہتے ہوئے دریاؤں، خوبصورت مکانات، حسین اور پاکیزہ شریک زندگی، لذیذ کھانوں اور پھولوں کا بیان اس کثرت سے آیا ہے کہ شمار مشکل ہے، لیکن سرسید احمد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ مجاز ہی مجاز ہے، اُن کا اصل مقصد اعلیٰ درجے کی خوشی اور راحت کا بیان ہے، اور مذکورہ بالا اشیا، محض اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ جاہل قسم کے لوگ ان لذتوں کے لالچ میں دن رات اٹا میں لگے رہیں،

”ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ دند و دعیذ و وزخ و بہشت کے جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں اُن سے بعینہ وہی اشیا، مقصود نہیں، بلکہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجے کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے، اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عہدگی، نعیم جنت کی اور ایک ترغیب و امر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے، اور ایک کوڑمغز، تلا یا شہوت پرست زاہدیہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت آن گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پیئیں گے، میوے کھا دیں گے، دودھ و شہد کی ندیوں میں نہا دیں گے، اور جو دل چاہے گارہ مرنے اڑا دیں گے، اور اس لغو، بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے“

واقعہ یہ ہے کہ حقیقت و مجاز کے بارے میں جو اصول اور پر بیان کیا گیا ہے اگر اس کو

پس پشت ڈال دیا جائے تو کوئی خراب سے خراب عقیدہ اور بُرے سے بُرا عمل ایسا نہیں ہے جسے قرآن کی طرف منسوب نہ کیا جاسکے، آخر باطنی فریق کے لوگوں نے مجاز و استعارہ کے یہی ہتھیار استعمال کر کے قرآن سے مجوسی عقائد ثابت کر دیئے تھے، اور آج بھی بہت سے عیسائی پادری قرآن کریم ہی کی آیتوں میں دو درواز کی تاویلات کر کے اُسے عیسائی مذہب کا حامی ثابت کرتے رہتے ہیں، اور پھر جب آدھا قرآن مجاز و استعارے پر مشتمل ہو اور اس میں ملائکہ سے مراد درختوں کی قوتِ نمود، دریاؤں کی قوتِ روانی اور آگ کی قوتِ احراق، آدم علیہ السلام سے مراد نوح انسانی، ابلیس سے مراد شر کی قوتیں ہو سکتی ہیں تو دوزخ سے مراد دنیوی تکلیفیں اور جنت سے مراد دنیوی راحتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور خدا کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ (معاذ اللہ) وہ کسی مستقل وجود کا نام نہیں، بلکہ کائنات کی اصل یعنی مادے یا توانائی کا نام ہے، اور خدا کا تصور جو قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ (معاذ اللہ) آپ نے محض اس لئے بیان فرمایا تاکہ عرب کے بدوؤں کو اس سے ڈرا کر اچھے کاموں کی طرف بلایا جاسکے، لیجئے: اس طرح مجاز و استعارے کے اس ہتھیار نے دین و مذہب کی بالکل ہی چھٹی کر ڈالی، اور قرآن پر عمل کرنے کے لئے خدا کے وجود پر ایمان رکھنا بھی ضروری نہ رہا، اور یہ بات محض ایک عقلی مفروضہ ہی نہیں ہے، مجاز اور تمثیل کے استعمال کو کھلی چھٹی دے کر فرقہ باطنیہ نے بالکل اسی جیسی دعوے کئے تھے، علامہ عبد القادر بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

”فرقہ باطنیہ کے مشہور لیڈر عبید اللہ بن الحسن قردانی نے اپنی ایک

کتاب میں لکھا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا لغو باتیں ہیں اور جنت سے

مراد درحقیقت دنیا ہی کا عیش و آرام ہے، اور عذاب مراد شریعت پر عمل

کا سزا، روزے اور حج و جہاد کے چکر میں پھنسا رہنا ہے۔“

لہذا اگر قرآن کریم سے اللہ کی کتاب ہدایت کی حیثیت میں فائدہ حاصل کرنا ہے

تو یہ طرز عمل انتہائی نامعقول ہے۔ بہبود اور خطرناک ہے، کہ قرآن کریم کی جو بات اپنے کسی نظریہ کے خلاف معلوم ہو اس میں تاویلات کا دروازہ کھول کر یہ کہنا شروع کر دیا جائے کہ اس کے ظاہری اور حقیقی معنی کے بجائے فلاں معنی مراد ہیں، عہد حاضر کے جن مصنفین نے علم تفسیر کی ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر پر قلم اٹھایا ہے، اُن میں یہ اصولی غلطی بکثرت پائی جاتی ہے، اور اُن کے مطالعہ کے دوران اگر مذکورہ بالا اصول کو ذہن میں رکھا جائے تو ایسی تصانیف کی بہت سی غلطیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں،

۲۔ قرآن کریم اور عقلی دلائل؛

عہد حاضر کے بعض مصنفین قرآن و سنت کے ارشادات میں بعض اوقات یہ کہہ کر دروازہ کار تاویلات اختیار کرتے ہیں کہ ان ارشادات کا ظاہری مفہوم عقل کے خلاف ہے، اس لئے اُن کی ایسی تاویل کرنی ضروری ہے جو عقل کے خلاف نہ ہو، اس معاملے میں چونکہ غلط فہمیاں بہت عام ہیں، اس لئے ہم یہاں اس مسئلے کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں،

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن و سنت سے جو باتیں ثابت ہوتی ہیں آگے ہم انہیں ”نقلی دلائل“ سے تعبیر کریں گے، اور عقل سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں انہیں ”عقلی دلائل“ سے، دراصل اس معاملے میں غلط فہمیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے علماء و متکلمین نے اپنی کتابوں میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ اگر نقلی دلائل عقلی دلائل کے خلاف ہوں تو عقلی دلائل پر عمل کیا جائے گا، اور نقلی دلائل اگر سند کے اعتبار سے قابل اعتماد نہ ہوں تو ان کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اور اگر وہ سند کے لحاظ سے ناقابل انکار ہوں تو یہ کہیں گے کہ اُن کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے، پھر اگر ان کا کوئی دوسرا مطلب بے تکلف ہو سکتا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ مفہوم مراد ہے، اور اگر کوئی بے تکلف مطلب سمجھ میں نہ آئے تو کہیں گے کہ اس کا صحیح مفہوم ہم پر واضح نہیں ہو سکا، اور اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، نقلی دلائل کی اس آخری قسم ہی کو ”متشابہات“ سے تعبیر کرتے ہیں،

یہ قاعدہ علماء اور متکلمین میں مشہور و معروف ہے، لیکن اس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر بعض مصنفین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ قرآن و سنت کی جو کوئی بات اپنی کسی رائے کے خلاف ہوئی اس میں یہ کہہ کر تاویل شروع کر دی کہ یہ عقل کے خلاف ہے، حالانکہ جن متکلمین نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے انہوں نے اس کی مکمل تشریح بھی کر دی، یہاں اس تشریح کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ”الانتباہات المفیدہ“ میں اس قاعدے کو بہترین انداز میں منضبط فرمایا ہے، پہلے ہم انہی کے الفاظ میں یہ قاعدہ ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد انشاء اللہ اس کی مفصل تشریح پیش کی جائے گی، حکیم الامت، حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں :-

”دلیل عقلی و نقلی میں تعارض کی چار صورتیں عقلاً محتمل ہیں :-
 ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں، اس کا کہیں وجود نہیں، نہ ہو سکتا ہے، اس لئے کہ صادقین میں تعارض محال ہے، دوسرے یہ کہ دونوں ظنی ہوں وہاں جمع کرنے کے لئے گور دو میں صرف عن الظاہر کی گنجائش ہے، مگر لسان کے قاعدے سے کہ اصل الفاظ میں حل علی الظاہر ہے، نقل کو ظاہر پر رکھیں گے اور دلیل عقلی کی دلالت کو حجت نہ سمجھیں گے،

رہیقہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعلم ان الدلائل القطعیۃ العقلیۃ از اقامت علی ثبوت شیء، ثم جزاً اولہ نقلیۃ یشرظاہر باختلاف ذلک، فنماک لایخلو الحال من احد اور اربعۃ.... ولما بطلت الاقسام الاربعۃ لم یبق الا ان یقطع بمقتضی الدلائل العقلیۃ القا طعۃ بان ہذہ الدلائل النقلیۃ اما ان یقال انہا غیر صحیحۃ، او یقال انہا صحیحۃ الا ان المراد منها غیر ظاہر ہا، ثم ان جوزنا التاویل و اشتغلنا علی سبیل التبرع بذکر تک التاویلات علی التفصیل، وان لم یجز التاویل فوضنا لعلم بہا الی اللہ تعالیٰ، فہذا ہوا القانون الکل المرجوع الیہ فی جمیع المتشابہات، (اساس التقدریس، ص ۲۷۲ و ۲۷۳، مطبوعہ مصطفیٰ البانی مصر ۱۳۵۲ھ)

تیسرے یہ کہ دلیل نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی، یہاں یقیناً نقلی کو مقدم رکھیں
چوتھے یہ کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی ہو، ثبوتاً یا دلالتاً، یہاں عقلی کو
مقدم رکھیں گے، نقلی میں تاویل کریں گے، پس صرف یہ ایک موقع ہی،
درایت کی تقدیم کار وایت پر، نہ یہ کہ ہر جگہ اس کا دعویٰ یا استعمال
کیا جاوے۔

اس قاعدے کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ عقلی دلائل تین
قسم کے ہو سکتے ہیں :-

۱۔ قطعی عقلی دلائل | یعنی ایسے عقلی دلائل جو سو فی صد یقینی ہوں، انہیں تمام انسان
کسی ادنیٰ اختلاف کے بغیر تسلیم کرتے آتے ہوں، اور ان
کے خلاف ہر بات سو فی صد ناممکن ہو، مثلاً یہ بات کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں،
قطعی عقلی دلیل ہو، جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا، یعنی دو اور دو تین کر کبھی
تین یا پانچ نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ بات عقلاً قطعی طور سے ناممکن ہو کہ ایک شخص
ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر موجود بھی ہو اور وہاں سے غائب بھی،

۲۔ ظنی عقلی دلائل | یعنی وہ عقلی باتیں جو سو فی صد یقینی تو نہ ہوں، لیکن عقل اور
تجربے کی رُو سے اُن کی سچائی کا غالب گمان پیدا ہوتا ہو
ایسی باتوں کی سچائی پر تمام اہل عقل ہمیشہ متفق نہیں رہتے، بلکہ مختلف زمانوں،
مختلف خطوں اور عقل و خرد کے مختلف سانچوں کے اعتبار سے ان معاملات میں
نظریاتی اختلاف پیش آتا رہتا ہے، مثال کے طور پر نیوٹن کا نظریہ تجاذب
(Theory of Gravity) آئن آسٹائن کا نظریہ اضافیت
(Theory of Relativity) ڈارون کا نظریہ ارتقاء
(Theory of Evolution) وغیرہ، ظاہر ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی

نظر یہ سو فی صد یقینی نہیں تھا، بلکہ ان فلسفیوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربات کو کام میں لاکر ایک رائے قائم کی تھی، جو اُن کو اس وقت کی معلومات اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی تھی، اور اس کی سچائی پر اُن کا گمان غالب ہو گیا تھا، لیکن اس رائے کو یقینی اور قطعی طور سے سو فی صد درست نہیں کہا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے دوسرے فلاسفہ نے اس سے اختلاف کیا، ایک زمانے میں کوئی نظریہ ذہنوں پر چھایا رہا، اور دوسرے زمانے میں وہی نظریہ عقل سے خارج نظر آنے لگا،

۳۔ وہی عقلی دلائل یعنی وہ دلائل جن کی بنیاد یقین یا گمان غالب کے بجائے محض وہم و قیاس پر ہو، مثلاً آب سے کچھ عرصہ پہلے تک سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ مریخ پر زندگی موجود ہے، ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد کسی قطعی یا ظنی دلیل پر نہیں، بلکہ محض وہی اندازوں پر تھی، اسی طرح نقل دلائل کی بھی تین قسمیں ہیں :-

۱۔ قطعی نقلی دلائل وہ دلائل ہیں جو سو فی صد یقینی ہوں، یعنی کسی مضمون کے متعلق ان کے الفاظ بھی بالکل صریح اور صاف ہوں، اور سند و ثبوت کے اعتبار سے بھی یقینی طور سے قابل اعتماد ہوں، مثلاً قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لَا تَقْرُبُوا الزِّنٰیةَ زَنٰا کے پاس تک نہ جاؤ، یہ اس بات کی قطعی اور یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں زنا حرام ہے، کیونکہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے کلام الہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس کی مذکورہ آیت سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم زنا سے منع کرنا چاہتا ہے، اسی طرح جو باتیں متواتر احادیث یا اجماع قطعی سے ثابت ہوں

۱۔ متواتر ان احادیث کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے ہر دور میں اتنے رہے ہوں کہ عقل اُن سب کے بیک وقت جھوٹا ہونے کو ناممکن سمجھتی ہو، ایسی احادیث تو سند و ثبوت کے اعتبار سے سو فی صد قطعی اور یقینی ہوتی ہیں، لیکن اخبارِ آحاد یعنی وہ حدیثیں جن کو روایت کرنے والے کسی زمانے میں صرف ایک یا دو تین رہ گئے ہوں (ظنی ہوتی ہیں، یعنی اُن کے ثبوت کا ایسا یقین (باقی صفحہ آئندہ)

وہ بھی اسی قسم میں داخل ہیں،

۲۔ قطعی نقلی دلائل | یعنی وہ نقلی دلائل جو پہلی قسم کی طرح قطعی تو نہیں ہوتے، لیکن اُن سے جو بات ثابت ہوتی ہے اس کے صحیح ہونے کا غالب

گمان قائم ہو جاتا ہے، مثلاً وہ تمام احادیث جو متواتر نہیں ہیں، لیکن اصول حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہیں، ایسی احادیث اگرچہ واجب العمل ہوتی ہیں، اور ان کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہوتا، لیکن چونکہ ثبوت کے اعتبار سے وہ قرآن اور متواتر احادیث کی طرح قطعی اور یقینی نہیں ہوتیں، اس لئے انھیں دوسرے درجے میں رکھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی حدیث قرآن کریم یا متواتر احادیث کے خلاف ہو تو اس کی ایسی تشریح کی جائے گی جو قرآن کریم یا متواتر احادیث کے مطابق ہو، اور اگر ایسی تشریح ممکن نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے گا،

۳۔ وہی نقلی دلائل | یعنی وہ نقلی دلائل جن کی صحت کا غالب گمان بھی قائم نہ ہوتا، بلکہ وہ محض وہم اور تخمینہ پر مبنی ہوں، مثلاً وہ احادیث جو اصول حدیث کی شرائط پر پوری نہیں اُترتیں،

ان چھ قسموں میں سے دو (یعنی وہی عقلی دلائل اور وہی نقلی دلائل) کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں ہے، لہذا وہ خارج از بحث ہیں، البتہ باقی چار اقسام کو مد نظر رکھتے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض و اختلاف کی عقلاً چار صورتیں ہو سکتی ہیں :-
۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ دلیل نقلی بھی قطعی ہو اور دلیل عقلی بھی قطعی، یہ صورت محض ایک نظر یا قیاس مفروضہ پر، عملاً آج تک نہ ایسا ہوا ہے اور نہ آسکدہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی قطعی نقلی دلیل کسی قطعی عقلی دلیل کے مخالفت ہو جائے، اگر کہیں بظاہر

(فقہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں ہوتا جیسے متواتر احادیث کا، البتہ اگر وہ اصول حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہوں تو غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، اس لئے پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ اُن پر عمل ضروری ہے،

ایسا نظر آتا بھی ہو تو نقلی دلیل صرف اپنی سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہوگی، لیکن اس کا جو مضمون قطعی دلیل عقل کے مخالف معلوم ہو رہا ہو، اس پر اس کی دلالت قطعی نہیں ہوگی، اور اگر اس مضمون پر اس کی دلالت قطعی ہوگی تو وہ سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی نہیں ہوگی، ایسا آج تک ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی دلیل نقلی اپنے ثبوت اور دلالت دونوں کے اعتبار سے قطعی ہو، اور پھر وہ کسی قطعی دلیل عقلی کے خلاف ہو،

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل ظنی ہو اور عقلی دلیل قطعی، اور دونوں میں تعارض واقع ہو جائے، یہ وہ صورت ہے جس کے بارے میں علماء اور متکلمین نے کہا ہے کہ ایسی صورت میں عقلی دلیل پر اعتماد کیا جائے گا، اور نقلی دلیل کے ایسے معنی بیان کئے جائیں گے جو عقل کی دلیل قطعی کے موافق ہوں مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-
 اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی

”مُحَمَّدٌ رَاىَ اللّٰهَ تَعَالٰی، عَرَشٌ پَر سِيْدَهَا هُوَ كَيْفَا“

یہ قرآن کریم کی آیت ہے، لہذا ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے، یعنی اس کا کلام آہی ہونا یقینی ہے، لیکن اس کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ قطعی نہیں، کیونکہ لفظ ”اسْتَوٰی“ کے عبرتی محاورے میں بہت سے معنی ہو سکتے ہیں، اور جو معنی لئے گئے ہیں وہ قطعی نہیں، لہذا یہ اس نقلی دلیل کی مثال ہے جو (دلالت کے اعتبار سے) ظنی ہے، دوسری طرف اس کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آ رہے ہیں (یعنی عرش پر سیدھا ہونا) وہ عقل کی دلیل قطعی کے خلاف ہیں، کیونکہ ”سیدھا ہونا“ جسم کی صفت ہی، اور عقل کے یقینی دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ باری تعالیٰ کوئی جسم نہیں ہے، اس طرح یہ ظنی نقلی دلیل عقل کی دلیل قطعی کے مخالف ہوگئی، چنانچہ مفسرین امت نے با اتفاق عقل کی دلیل قطعی کو اختیار کیا، اور اس آیت کے بارے میں تمام علماء نے یہ فرمایا کہ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، پھر بعض حضرات نے تو اس کو مجاز قرار دیا، اور کہا کہ اس سے مراد غلبہ اور قدرت وغیرہ ہی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ آیت اُن متشابہات میں سے

ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **ذَلَّا يَعْلَمُهُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ** (اس کی تاویل و تفسیر اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اسی طرح قرآن کریم میں حضرت ذوالقرنین کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے :-

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ ،

یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) مغرب میں پہنچے تو سورج کو ایک کچھڑ والے چشمے میں ڈوبتایا،

یہ بھی قرآن کریم کی آیت ہے، اس لئے اس کے کلامِ الہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس جملے کا جو مفہوم ظاہری طور سے سمجھ میں آتا ہے کہ سورج واقعی ایک کچھڑ والے چشمے میں ڈوب رہا تھا، وہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل کی رُو سے درست نہیں، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ سورج اور زمین دونوں الگ الگ کرے ہیں، جو کسی بھی مقام پر آپس میں نہیں ملتے، لہذا آیت کا یہ ظاہری مفہوم مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس مقام پر اُس وقت ذوالقرنین پہنچے تھے وہاں آگے کوئی آبادی نہیں تھی، اور حدِ نظر تک دَلِّل ہی دَلِّل تھی، اس لئے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ سورج اس کچھڑ والے چشمے میں ڈوب رہا ہے، یہ مفہوم اگرچہ آیت کے الفاظ سے پہلے مفہوم کے برابر ظاہر نہیں ہے، لیکن چونکہ آیت کے الفاظ میں اس کی بھی پوری گنجائش ہے، اس لئے یہ آیت پہلے مفہوم پر ظنی الدلالة ہے اور جب اس کا مقابلہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل سے ہوا تو یہ قطعی دلائل راجح قرار پائے، اور آیت کے اس مفہوم کو باجماع اختیار کر لیا گیا، جو ان قطعی دلائل کے موافق تھے،

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل قطعی ہو اور عقلی دلیل ظنی، ظاہر ہے کہ اس صورت میں نقلی دلیل ہی کو ترجیح ہوگی، کیونکہ ظنی دلیل قطعی دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مثال کے طور پر ڈارون نے اپنے نظریہ ارتقاء میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ

انسانوں کی نسل یکایک وجود میں نہیں آئی، بلکہ حیوانات مرد و ایام کے ساتھ ساتھ ایک سلسلہ ارتقاء سے وابستہ رہے ہیں اور اس ارتقاء کے نتیجے میں انھوں نے بہت سی ہمتیں بدلی ہیں، یہاں تک کہ انسان بننے سے پہلے اس کی آخری شکل بندریا بن گئی تھی، اور انہی بندروں یا بن مانسوں کی ایک نسل ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی انسان بن گئی، ظاہر ہے کہ ڈارون کا یہ نظریہ ایک قیاسی نظریہ تھا، اور جو دلائل اس نے پیش کئے تھے، اگر انھیں دلائل کہنا صحیح ہو تو زیادہ سے زیادہ وہ قطعی دلائل تھے، اس کے مقابلے میں قرآن کریم واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً
(نساء: ۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت (دنیا میں) پھیلا دیئے۔

نیز ارشاد فرمایا :-

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ
مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ فَإذْ أَسْوَبْتَهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ
سَاجِدِينَ، فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ،
(الحجر: ۲۸ تا ۳۱)

جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اٹھے ہو چکا ہوں
سے جو سوکھ کر بچے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پس جب
میں اس کو بنا چکوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو تم اس کے
آگے سجدے میں گر پڑنا، پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، الخ۔

یہ اور ان جیسی متعدد آیات صراحتاً یہ ثابت کرتی ہیں کہ بنی نوع انسان کی ابتداء ایک

فرد واحد (حضرت آدم علیہ السلام) سے ہوئی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے گارے سے پیدا کیا تھا، قرآن کریم کے یہ دلائل قطعی ہیں، لہذا ان سے ڈارون کے نظریے کی قطعی تردید ہو جاتی ہے، اور اس نظریے کی وجہ سے (جسے زیادہ سے زیادہ ظنی کہا جاسکتا ہے) قرآن کریم کے صریح بیانات کو چھوڑ دینا یا ان میں دوراز کار تاویلات کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا،

(۴) جو تھی صورت یہ ہے کہ نقل دلیل بھی ظنی ہو اور عقلی دلیل بھی ظنی، اس صورت میں بھی علماء اور متکلمین کا اس پر اتفاق ہو کہ نقل دلیل کو ترجیح ہوگی، اور جب تک عقلی دلیل قطعی مشاہدے کی صورت اختیار نہ کر لے اس وقت تک اس کی وجہ سے قرآن و سنت کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹانا درست نہیں ہوگا، اس کی وجہ وہی ہے جو ”قرآن کریم اور مجاز“ کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ صرف قرآن کریم ہی نہیں دنیا کی ہر گفتگو میں اصل یہ ہے کہ وہ حقیقت ہو، مجازی معنی اسی وقت اختیار کئے جائیں گے جب کوئی مجبوری لاجہی ہو جائے، اگر عقل کی کوئی دلیل قطعی حقیقی معنی کے معارض ہو تب تو مجبوری واضح ہو، اور اس صورت میں مجازی معنی بھی مراد لینا واضح ہے، لیکن جب عقلی دلیل ظنی ہے تو مجازی یا دور کے معنی اختیار کرنے کی مجبوری ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ عقل کے ظنی دلائل کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی عالمگیر اور ابدی نہیں ہوتے، ایک شخص ظنی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرا اس کا منکر ہے، ایک زمانے میں اسے قبول عام حاصل ہے، اور دوسرے زمانے میں اسے چہالت سمجھا جاتا ہے، فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے وہ اس قسم کے کتنے بیشمار نظریات سے بھری ہوئی ہے، ایک ہی زمانے میں ایک فلسفی ایک نظریے کا قائل ہے، اور اپنے ظنی دلائل کو تمام دوسرے دلائل پر فوقیت دیتا ہے، لیکن دوسرا فلسفی ٹھیک اسی دور میں ایک بالکل متضاد نظریہ کو درست سمجھتا ہے، اور اس کے دلائل کو ترجیح دیتا ہے، پھر جب زمانہ کچھ آگے بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دور کے تمام فلسفیوں کے دلائل بے بنیاد اور غلط تھے، ایسے ظنی عقلی دلائل کا تو شمار

مشکل ہے جنہیں آگے چل کر عقل اور مشاہدے کے قطعی دلائل نے ہمیشہ کے لئے باطل قرار دیدیا، اس کے برخلاف چودہ سو سال کی مدت میں ایسے ظنی نقلی دلائل اکا دکا ہی ملیں گے جن کو عقل کے قطعی دلائل یا مشاہدے نے یقینی طور پر غلط قرار دیدیا ہو، لہذا اگر عقل کی ہر ظنی دلیل کی وجہ سے نقلی دلائل میں تاویلات کا دروازہ کھولا گیا تو قرآن و سنت کو بازو پھیلنے والے بنانے کے سوا اس کا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیو باروی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے :-

ڈراصل اس قسم کے مباحثِ علمیہ کے لئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدے کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحی الہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے رکھیں، تو ان کے مشاہدے اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا، تو ان کو بلاشبہ تسلیم کیا جائے اس لئے کہ ایسے حقائق کا انکار بے جا تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اُس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جاسکے، تو ان کے متعلق قرآن عربیہ کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں، اور خواہ مخواہ ان کو جدید تحقیقات کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہئے، کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدے اور بداہت کا انکار لازماً آجائے، اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ مسائلِ علمیہ کو تو بار بار اپنی جگہ سے ہٹانا پڑا ہے، مگر علومِ فترائی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹانے کی ضرورت پیش نہیں آئی،

لہذا بنیادی اصول تو یہی ہے کہ جب عقل اور نقل کے ظنی دلائل میں تعارض پیش آئے

تو نقل کے ظنی دلائل کو ترجیح ہوگی، اور عقل کے ظنی دلائل کی بنیاد پر نقلی دلائل میں دو درجہ کی تاویلات اختیار کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے اور وہ یہ کہ ظنی دلائل بھی سب ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، بلکہ ان میں بھی مختلف درجات ہوتے ہیں، چنانچہ بعض ظنی دلائل دوسرے ظنی دلائل کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتے ہیں، مثلاً یہ بات بھی ظنی ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے، اور یہ بھی ظنی ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں "نیاندرتھل" (Neanderthal) کے نام سے ایک مخلوق پائی جاتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ قوت کا جو درجہ پہلی بات کو حاصل ہے وہ دوسری بات کو حاصل نہیں، اسی طرح ایک ظنی نقلی دلیل وہ ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور تمام حدیث کی کتابوں میں موجود ہو، اور ایک وہ ہے جو صحیح سند کے ساتھ منقول ہے، لیکن صحاح ستہ اور حدیث کی معروف و متداول کتابوں میں نہیں پائی جاتی ظاہر ہے کہ پہلی قسم دوسری کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس طرح ظنی دلائل میں درجہ متفاوت ہو سکتے ہیں، اب اگر کوئی عقلی دلیل ظنی درجہ اول کی ہو اور نقلی دلیل ظنی درجہ دوم سوم کی ہو تو ایسی صورت میں ایک مجتہد عقلی دلیل کو نقلی دلیل پر ترجیح دیکر نقلی دلیل کی ایسی توجیہ کر سکتا ہے جو ظاہری الفاظ کے لحاظ سے نسبتاً بعید لیکن عقلی دلائل کے مطابق ہو، البتہ جب تک وہ عقلی دلیل مشاہدے یا قطعیات سے ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک نقلی دلیل کی اس توجیہ کو قطعی اور متعین طریقے سے بیان نہ کرنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جو عقلی دلائل کے لحاظ سے راجح معلوم ہوتا ہے،

یعنی چونکہ ظنی دلائل کے ان درجات کو اپنے لئے قواعد کے تحت لانا مشکل ہے اس لئے یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ کونسی دلیل کس درجے کی ظنی ہے، چنانچہ یہ فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے نقل و عقل کے دلائل پر مکمل عبور اور قرآن و سنت کے علوم میں

پوری بصیرت حاصل ہو، اور اس معاملے میں اہل علم کی آراء میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے۔
یہ بات ایک مثال سے واضح ہو سکے گی، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جب حضرت

ذوالقرنین نے یا جوج و ماجوج کو روکنے کے لئے دیوار بنائی تو فرمایا:۔
هٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّيْ فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهُ
دُكَّاءً وَّكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا

”یہ (دیوار) میرے پروردگار کی طرف سے ایک رحمت ہے، پس جب
میرے پروردگار کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئے گا تو وہ اس دیوار کو
ٹوٹ ڈیگا، اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے۔“

اس میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ ”پروردگار کا وعدہ“ سے مراد قیامت ہے،
اور مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب آجائے گی، اور یا جوج و ماجوج کے نکلنے کا وقت
ہوگا، اُس وقت یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اگرچہ قرآن کریم نے صرت ”پروردگار کا وعدہ“
کا لفظ ذکر فرمایا ہے، اُس کی مزید تشریح و تفسیر نہیں فرمائی، لیکن چونکہ قرآن کریم میں
متعدد مقامات پر یہ لفظ قیامت کے معنی میں آیا ہے، اس لئے مفسرین نے یہاں
بھی اُس کے یہی معنی مراد لئے ہیں، لیکن یہ تفسیر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے،

دوسری طرف اب تک جو جغرافیائی اور تاریخی تحقیقات ہوئی ہیں اُن سے لگتا
یہ ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کافی عرصہ پہلے ٹوٹ چکی ہے، اگرچہ یہ
تحقیقات بھی ظنی ہیں، کیونکہ ذوالقرنین کی دیوار کا قطعی اور یقینی تعین جس میں کوئی
مشبہ باقی نہ رہے بہت مشکل ہے،

اس کے باوجود ایک شخص جسے عقلی اور نقلی دلائل میں موازنے کا مکمل سلیقہ اور
ان معاملات کی صحیح بصیرت عطا فرمائی ہو یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ تاریخی اور جغرافیائی
تحقیقات درجہ اول کی ظنی ہیں، اور آیت کی مذکورہ بالا تفسیر درجہ دوم کی ظنی ہے،
لہذا ان تحقیقات کے مطابق یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہو کہ تشریح کریم کی مذکورہ
آیت میں ”پروردگار کے وعدے“ سے مراد قیامت کے بجائے وہ معین وقت بھی

ہو سکتا ہے، جس میں اس دیوار کا ٹوٹنا تقدیرِ رابئی میں طے شدہ ہو، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے گزشتہ عام مفسرین کے خلاف اسی تفسیر کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے کہ ذوالقرنین کے اس قول کا منشاء قیامت کی کسی علت کی طرف اشارہ کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ ایک عام بات کہنا چاہتے تھے، کہ جب میرے پروردگار کا حکم ہو گا یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اور قیامت کے قریب یا جوج و بآجوج کے جس خرد جگ کا ذکر سترآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے اُس کا دیوار ٹوٹنے کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں!

لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ظنی دلائل کی یہ درجہ بندی بڑا نازک کام ہے، اور اس کے لئے نقلی و عقلی علوم میں فترارِ واقعی بصیرت و مہارت کی ضرورت ہو، لہذا اس معاملے میں پوری احتیاط، سمجھ بوجھ اور خوفِ خدا کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہو، اور محض کسی راجح الوقت نظریے کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ کر لینا اکثر گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، یہ ہے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض کے وقت صحیح طریق کار جو تمام علمائے سلف کا معمول رہا ہے، اور جس کی معقولیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا،

۳۔ احکام شرعیہ اور عقل

قرآن کریم کی تفسیر میں عقل کے استعمال کی ایک بدترین صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کے صریح اور واضح الفاظ سے جو شرعی حکم ثابت ہو رہا ہو، اُس سے اس بنا پر انکار کیا جائے کہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آسکی، آجکل مغربی افکار کے تسلط کا یہ خطرناک و با بھی عام ہو رہی ہے کہ جن شرعی احکام پر چودہ سو سال سے پوری

لے تفصیل کیلئے دیکھیے عقیدۃ الاسلام فی حیاء عینے علیہ السلام از حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری ص ۱۹ و نفعۃ العبر از حضرت مولانا محمد یوسف صاحب تہوری ص ۵۸ و قصص لہستہ آن،

امت مسلمہ متفق علیٰ آرہی ہے، اور جو قرآن کریم یا احادیث نبویہ سے صراحت و وضاحت کے ساتھ ثابت ہیں، وہ بعض افراد کو اپنے مزاج کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، اس لئے قرآن و سنت کی جن نصوص سے وہ ثابت ہیں ان میں وہ تاویل اور تحریف کا دروازہ کھول دیتے ہیں، اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہم اے زلمے میں یہ احکام شرعیہ (معاذ اللہ) منہی برحمت نہیں رہے،

مثلاً قرآن کریم نے چور کی سزا کے بارے میں واضح حکم دیا ہے کہ :-

أَشْرَافُ وَالسَّارِقُ فَإِنْ قَطَعُوا آيُنَ يَسْتَمِ

چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے

ہاتھ کاٹ دو۔

اب ایک عرصہ سے مغرب کے مصنفین اسلام کی مقرر کی ہوئی ان سزائوں پر اعتراض کرتے ہیں، اور چوروں پر ترس کھا کر ہاتھ کاٹنے کی سزا کو بہت سخت بلکہ (معاذ اللہ) جیسا قرار دیتے رہے ہیں، چنانچہ عالم اسلام کے وہ مجددین جو مغرب کے ہر اعتراض کے جواب میں ہاتھ جوڑ کر معذرت پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اسی وقت سے اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسلام کی مقرر کی ہوئی ان سزائوں میں کوئی ایسی ترمیم کی جائے جو اہل مغرب کو راضی کر سکے، چنانچہ وہ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت میں توڑ مروڑ کی کوشش کرتے رہے ہیں، ایک معاصر اہل قلم نے اپنے ایک مقالہ میں تو یہاں تک لکھ دیا کہ مذکورہ آیت میں "چور" سے مراد "سرمایہ دار" ہیں، اور ان کے ہاتھ کاٹنے سے مراد ان کے کارخانے ضبط کر لینا ہے، اور اس آیت میں چور کی سزا بیان نہیں کی گئی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ سرمایہ داروں کی تمام صنعتیں قومی تحویل میں لے لی جاسکتی ہیں،

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو سوڈا، قمار اور شراب وغیرہ کی کسی نہ کسی شکل کو جائز قرار دینے کی فکر میں ہیں، اور اپنے اس طرز عمل کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ عقل کی رو سے موجودہ دور میں ان کی حرمت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، لہذا یہاں اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ احکام شرعیہ اور عقل میں کیا نسبت ہے؟ شرعی احکام

کے معاملہ میں عقل سے کام لےنا لیا جاسکتا ہے؟ اور اس کی کیا حدود ہیں؟
 واقعہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکام عقل سلیم کے عین مطابق ہیں، اور ان میں
 سے ایک ایک کے بارے میں پوری تفصیل سے ناقابل انکار دلائل کے ذریعہ یہ ثابت
 کیا جاسکتا ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں، البتہ
 اس موضوع سے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں وہ چونکہ چند در چند ہیں، اس لئے یہاں
 اس بحث کو کئی حصوں پر منقسم کرنا پڑے گا، ذیل میں ہم مقدمہ کے طور پر چند باتیں
 بیان کرتے ہیں، ان مقدمات کے اچھی طرح ذہن نشین ہوجانے کے بعد ہی صحیح نتیجہ
 برآمد ہو سکے گا، لیکن جو حضرات واقعہً اس مسئلہ کی تشفی بخش تحقیق چاہتے ہیں ان سے
 گزارش یہ ہے کہ وہ اس بحث کے صرف کسی ایک جز کو دیکھ کر عجلت میں فیصلہ نہ کریں،
 بلکہ پوری بحث اور اس کے تمام مقدمات کو ایک مرتبہ پورے غور و خوض اور ٹھنڈے
 دل کے ساتھ پڑھ لیں، واللہ ولی العزیز والتوفیق،

۱۔ آزاد عقل اور ہدایت دگر اہی؛

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا قرآن و سنت کا کوئی حکم عقل سلیم کے مخالف نہیں
 لیکن سب سے پہلے متعین کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے
 سے مختلف ہوتی ہے، لہذا اچھے برے کی تمیز کے لئے کوئی عقل کو بنیاد بنایا جائے؟
 اگر دنیا کے تمام معاملات کا فیصلہ اور قانون سازی اس خالص عقل کی بنیاد
 پر کی جانے لگے جو ہر قسم کی دینی پابندیوں سے آزاد ہو تو دنیا میں ایک ایسی فوضویت
 اور انارکی کا دور دورہ ہوگا، جس کی موجودگی میں انسانیت کی بالکل تباہی یعنی ہر
 وجہ یہ ہے کہ اگر انسانی عقل کو ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد کر دیا جائے تو اس سے
 وہ پیش پا افتادہ اخلاقی مسلمات اور حقائق بھی ثابت نہیں ہو سکتے جنہیں ایک
 شریف بچہ بھی درست سمجھتا ہے، مثلاً اپنی بہن کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب ایسا گناہ
 مجرم ہے جسے دنیا کے کسی مذہب و ملت اور کسی قوم میں بھی پسند نہیں کیا جاتا۔۔۔
 یہاں تک کہ وہ بدترین طحیر و خدادار رسول کو بھی نہیں مانتے وہ بھی اس فعل کو انتہائی برا

سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس گھنٹاؤنے فعل کو ناجائز ثابت کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے؛ کیونکہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی کو راحت پہنچانے کے لئے کھانا پکاتی ہے، اس کے سونے کے لئے بستر تیار کرتی ہے، اس کے کپڑے سیتی ہے، اس کی ضروریات کو سنوار کر رکھتی ہے، وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیمارداری کرتی ہے، غرض اپنے بھائی کو آرام پہنچانے کے لئے اس قسم کی جو خدمت بھی انجام دیتی ہے، تو معاشرہ اسے اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور اس کی تعریف کرتا ہے، لیکن اگر یہی بہن اپنے بھائی کی جنسی تسکین کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے تو ساری دنیا اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ کر دیتی ہے، اگر ہر معاملہ کا تصفیہ خالص اور آزاد عقل کے حوالے سے کیا جائے تو وہ بالکل بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر ایک بھائی اپنی بہن سے ہر قسم کا آرام حاصل کر سکتا ہے تو جنسی آرام حاصل کرنا کیوں ممنوع ہے؟ یہ سوال اخلاق اور رسم و رواج کی مہتر کی ہونی حدود کے تحت انتہائی اجنبی بلکہ گھنٹاؤنا محسوس ہوتا ہے، لیکن جو عقل کسی قسم کی حدود و قیود کی پابند نہ ہو اس کو آپ یہ کہہ کر مطمئن نہیں کر سکتے کہ یہ فعل اخلاقی اعتبار سے انتہائی پست اور گھنٹاؤنا فعل ہے، سوال یہ ہے کہ خالص عقلی نقطہ نظر سے اس میں کیا خرابی ہے؟ آپ کہیں گے کہ اس سے اختلاط انساب کا فتنہ پیدا ہوتا ہے، لیکن اول تو ہر تھکنے پر اس کے اس دور میں اس جواب کے کوئی معنی ہی نہیں رہا اور اگر بالفرض اسے اختلاط انساب ہوتا بھی ہو تو خالص عقل کی بنیاد پر ثابت کیجئے کہ اختلاط انساب بڑی چیز ہے، کیونکہ وہاں بھی ایک آزاد عقل یہ کہہ سکتی ہے کہ اختلاط انساب کو بڑائی نسرار دینا مذہب و اخلاق کا کرشمہ ہے، اور جو عقل مذہب و اخلاق کی زنجیروں سے آزاد ہو اس کے لئے کسی بڑائی کو بڑائی ثابت کرنے کے لئے کسی خاص عقلی دلیل کی ضرورت ہی

آپ کہیں گے کہ یہ عمل انتہا درجے کی بے حیائی ہے، لیکن خالص اور آزاد عقل اس کے جواب میں یہ کہو گی کہ ”حیا اور بے حیائی“ کے یہ سارے تصورات

مذہب، اخلاق یا سماج کے بنائے ہوئے ہیں، ورنہ عقلی اعتبار سے یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک عورت اپنے جسم کو ایک قطعی انجان آدمی کے حوالے کرنے کو تو یہ "حیاداری" ہے، اور جس بے تکلف شخص کے ساتھ اس کا بچپن گزر رہے اس کے حوالے کرے تو یہ بے حیائی ہے۔۔۔۔۔؛ آپ کہیں گے کہ انسانی فطرت اس عمل سے انکار کرتی ہے لیکن آزاد عقل اس کے جواب میں کہتی ہے کہ اس عمل کے غیر فطری ہونے کی دلیل عقلی کیا ہے؟ درحقیقت یہ عمل اس لئے خلافتِ فطرت معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں سے سماج اس کو بُرا سمجھتا آ رہا ہے، اگر سماج کے بندھن کو توڑ کر خالص عقل سے جوہن تو اس عمل میں قباحت کیا ہے؟ غرض آپ خالص عقل کی بنیاد پر اس سوال کو حل کرنا چاہیں گے تو یہ قیامت تک حل نہیں ہو سکے گا،

اور یہ محض ایک مفروضہ ہی نہیں، آج کی آزاد عقل نے تو اس کے قسم کے بے شمار سوالات اٹھا ہی رکھے ہیں، پرلئے زمانے میں بھی جب کسی نے خالص اولِ آزاد عقل کے ذریعہ دنیا کے معاشرتی مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیشہ عقلی سوال و جواب کی اس بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گیا ہے، یقین نہ آئے تو فرقہ باطنیہ کے حالات کا مطالعہ کیجئے، اس فرقہ کا ایک مشہور لیڈر عبداللہ بن حسن القیروانی اپنی کتاب "السیاستہ والبلاغ الاکیدہ والناہوس الاعظم میں لکھتے ہیں:-

اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ عقل کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس قسم کی بے عقلیاں کرتے ہیں کہ اُن کے پاس ایک حسین و جمیل بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے، اور خود ان کی بیوی ایسی حسین نہیں ہوتی، اس کے باوجود وہ اپنی بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام سمجھ کر اس کو ایک اجنبی شخص کے حوالے کر دیتے ہیں، اگر یہ جاہل عقل سے کام لیتے تو انھیں احساس ہوتا کہ ایک اجنبی کے مقابلہ میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار تھے دراصل اس نادانی کی ساری وجہ یہ ہے کہ اُن کے رہنا اُن پر دنیا کی لذتیں حرام کر دی ہیں۔

اس گھناؤنی عبارت کی مشناعت و خباثت پر جتنی چاہے لعنت بھیجے رہتے، لیکن ساتھ ہی دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس دلیل کا کوئی جواب آپ دے سکتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے جو عقل پرست صبح و شام آزاد عقل کی رٹ لگاتے رہتے ہیں، اگر وہ سب مل کر اس اعتراض کا خالص عقلی جواب دینا چاہیں تب بھی قیامت تک نہیں دے سکتے،

اور پھر کمال یہ ہے کہ یہ عبید اللہ قیسروانی جس کی عبارت اوپر لکھی گئی ہے قرآن کا کھلا منکر نہیں تھا، بلکہ دوسرے باطنیہ کی طرح قرآن میں عقل کی بنیاد پر تاویلات کیا کرتا تھا، اور یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ قرآن کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آتے ہیں وہ حقیقت وہ مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجاز و استعارہ اور تمثیل و تشبیہ ہے جس کا حقیقی مطلب کچھ اور ہے،

اسی طرح اگر آپ مطلق زینا کی حرمت آزاد اور خالص عقل سے ثابت کرنا چاہیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ آزاد عقل یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر مرد و عورت باہمی رضامندی سے بدکاری کا ارتکاب کرنا چاہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسی بنا پر معسر بنی قوانین میں باہمی رضامندی سے زنا کر لینا کوئی جرم نہیں ہے، کیونکہ ان قانون سازوں کو زنا با رضامندی کوئی خالص عقلی خرابی نظر نہیں آتی، بلکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے برطانیہ کی مجلس قانون ساز نے بھاری اکثریت سے تالیوں کی گونج میں یہ قانون منظور کیا ہے کہ دو مردوں کا باہمی رضامندی سے لواطت د **Homo Sexuality** کا ارتکاب

قانوناً بالکل جائز ہے، اس قانون سازی کی وجہ بھی یہی تھی کہ خالص عقلی طور پر اس عمل میں کوئی قابل سزایات نظر نہیں آتی،

اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، انسانی ذہن کے بنائے ہوئے قوانین کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ وہ انسانیت کی صحیح تربیت کر کے اس کو امن و سکون سے ہمکنار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، اور ان کے ذریعہ انسان عقل کے نام پر ایسی

ایسے بے عقلیاں کرتا ہے کہ الامان، وجہ یہ ہے کہ جب مثلاً "عقل" قانون سازی کی بنیاد ٹھہری تو اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، زمانے کا کوئی عام چلن اگر ایک زمانے کے افراد کو کسی ایک عمل کی اچھالی یا بُرائی پر متفق کرتا بھی ہو تو کسی دوسرے زمانے کی عقل اسی عمل کے بارے میں کوئی مختلف رائے دیدیتی ہے کیونکہ "عقل" کے پاس کوئی ایسا متفقہ معیار نہیں ہے جس کی بنیاد پر اقدار (Values) کا تعین کیا جاسکے اور اس کی روشنی میں صحیح قوانین بنائے جاسکیں،

چنانچہ عہدِ حاضر کے ماہرین قانون بھی عقل و فہم کے ہزاروں دعویوں کے باوجود سنا سال کی بحثوں کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قانون سازی کا یہ بنیادی مسئلہ ابھی طے نہیں کر سکا کہ قانون سازی کے لئے کسی چیز کو اچھالیا بُرا سمجھنے کا کیا معیار میں مقرر کرنا چاہتے؟ ہمارے زمانے کے معروف ماہر قانون ڈاکٹر جیٹن *George Whitecross*

Paton اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب "اسول قانون" میں لکھتے ہیں:

"ایک مثالی نظامِ قانون میں کون سے مفادات کا تحفظ ضروری ہے؟

یہ ایک اقدار کا سوال ہے جس میں فلسفہ قانون کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے

بنیادی طور پر یہ "فطری قانون" (*Natural Law*) کا مسئلہ ہے

لیکن اس سوال کا جواب ہم جتنا فلسفہ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں،

اتنا ہی فلسفہ سے اس کا جواب ملنا مشکل ہے، کیونکہ ابھی تک اقدار کا کوئی

متفقہ پیمانہ نہیں مل سکا، واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہب ایسی چیز ہے کہ

جس میں ہمیں ایسی بنیاد مل سکتی ہے، لیکن مذہب کے حقائق کو اعتقاد یا

وجدان کے ذریعہ تسلیم کرنا ضروری ہے، نہ کہ خالص منطقی دلائل کے ذریعہ

آگے اسی مصنف نے ان آراء و خیالات کی بڑی دلچسپ داستان بیان کی ہے جو قانون کے مقصد، اس کے فلسفہ اور اس کے اخلاقی بنیادوں سے متعلق مختلف مفکرین نے

ظاہر کی ہیں، لیکن بہ آراء و خیالات اس قدر متضاد ہیں کہ جارح بیٹن لکھتے ہیں :-
 ”قانون کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟ اس بارے میں آراء و نظریات تقریباً اتنے
 ہی بے شمار ہیں جتنے اس موضوع سے متعلق رکھنے والے مصنفین کی تعداد،
 کیونکہ ایسے لکھنے والے مشکل ہی سے ملیں گے جنہوں نے قانون کے لئے کوئی
 مثالی مقصد وضع نہ کیا ہو۔“

آگے انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اس موضوع پر ہر زمانے میں مفکرین قانون
 عقل و فکر کی تنگ و تاز سے اس الجھی ہوئی ڈور کو کس طرح مزید پُرپچ بٹلتے رہے ہیں،
 آخر میں وہ لکھتے ہیں :-

“
 The orthodox natural law theory based
 its absolutes on the revealed truths of
 religion. If we attempt to secularize
 jurisprudence, where can we find an
 agreed basis of values ? (P. 126)

زراخ العقیدہ فطری قانون کا نظریہ اپنے عمومی اصولوں کی بنیاد مذہب کے
 الہامی حقائق پر رکھتا تھا، اگر ہم اصول قانون کو لادینی بنانے کی کوشش
 کریں تو اقدار کی متفقہ بنیاد ہم کہاں سے لاسکیں گے؟
 غرض یہ کہ اگر وحی الہی کی رہنمائی سے قطع نظر کر کے عقل کو بالکل مادر پدر
 آزاد چھوڑ دیا جائے تو اچھے بُرے کی تمیز کرنے کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی،
 انسان کو گمراہی اور بے عقلی کے ایسے ایسے تاریک غاروں میں گرا کر چھوڑتی ہے کہ
 جہاں رُشد و ہدایت کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نہیں پڑی، وجہ یہ ہے کہ وحی الہی کی
 رہنمائی کے بغیر جب انسان نری عقل کو استعمال کرتا ہے تو وہ اسے آزاد عقل سمجھتا ہے
 لیکن درحقیقت وہ اس کی نفسانی خواہشات کی غلام ہو کر رہ جاتی ہے جو عقل کی
 غلامی کی بدترین شکل ہے، جو لوگ ہر کام میں خالص عقل کی پیروی کا دعوے

کرتے ہیں وہ درحقیقت انتہاء درجہ کی خود فریبی میں مبتلا ہیں، اُن کے مقابلہ میں وہ لوگ زیادہ حقیقت پسند اور جرأت مند ہیں جو کھل کر یہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل آزاد نہیں، بلکہ ہماری خواہشات نفس کی غلام ہے، فلسفہ قانون کی بحث میں۔۔۔ ماڈرن مفکرین کے ایک گروہ کا ذکر آتا ہے، جن کا فلسفہ (Noncognitivist Ethical Theory) کے نام سے مشہور ہے، عہد حاضر کے معروف ماہر قانون ڈاکٹر فریڈمین کے الفاظ میں اس فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

Reason is and ought only to be the slave
of the passions and can never pretend to
any other office than to serve and obey
them.

یعنی ”عقل درحقیقت انسانی جذبات کی غلام ہے، اور اسے صرف اپنی جذبات کا غلام ہونا بھی چاہیے، اس کا کام اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اُن جذبات کی خدمت اور اطاعت کرتی رہے۔“
اس فلسفہ کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فریڈمین لکھتے ہیں:-

”اس کے علاوہ ہر چیز مثلاً ایک سادہ حجم، شرم، حیا، جاتی، بلکہ ”اچھے“ بُرے“ جیسے تصورات یا ”خلائ کام ہونا چاہیے“ اور ”خلائ کام اس لائق ہے“ جیسے الفاظ سب خالصہ خواہشات و جذبات کی پیداوار ہیں اور علم اخلاق نام کی کسی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔“

اس بحث سے قطع نظر کہ اُن لوگوں کا یہ فلسفہ اچھا ہے یا بُرا؟ لیکن بات انہوں نے بالکل سچی کہی ہے، کہ دجی الہی کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد عقل اور اخلاق نام کی کوئی چیز باقی رہ ہی نہیں سکتی، اس کے بعد انسان کے وجود اور اعمال و افعال

پرفائلٹ اس کے جذبات و خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے، اور یہ خواہشات و جذبات اسے جہاں لیجانا چاہیں وہاں اسے جانا پڑتا ہے، پھر اگر کسی کام کو انسان کا ضمیر قبول بھی نہ کرتا ہو تب بھی اس کے پاس خواہشات کو رد کرنے کے لئے کوئی معین بنیاد باقی نہیں رہتی، چنانچہ برطانیہ میں ہم جنس پرستی کو سنبھال دینے کا اقدام اسی بیچارگی کے عالم میں ہوا کہ بعض مفکرین اسے ناپسند کرتے تھے، اور خود جائز قرار دینے والے بعض افراد کا ضمیر اس پر مطمئن نہ تھا، لیکن خواہشات کی غلام بننے کے بعد عقل کے پاس اس مطالبہ کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، دو لفٹننٹ کیٹی (Wolfenden Committee) جو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی، اور جس کی سفارشات کی بنیاد پر اسمبلی میں یہ فیصلہ ہوا، اس کی رپورٹ کے یہ الفاظ کس درجہ عبرت خیز ہیں :-

”جب تک قانون کے ذریعہ کام کرنے والی سوسائٹی اس بات کی جانی ہوگی اور سوچی سمجھی کوشش نہ کرے معاشرے میں مجرم کا خوف گناہ کے خوف کے برابر ہو جائے اس وقت تک پرائیویٹ اخلاق اور بد اخلاق کے تصور کی حکمرانی باقی رہے گی، جو مختصر مگر صاف لفظوں میں قانون کے دائرہ کار سے باہر ہے“

لیکن قرآن کریم جو انسانیت کو خواہشات کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا چھوڑنے کے لئے نہیں بلکہ ہدایت کا صاف اور سیدھا راستہ بتانے کے لئے آیا ہے اور جس نے واضح طور سے بتایا ہے کہ انسان کی جبلت میں اچھی اور بُری ہر طرح کی خواہشات و دلچت کی گئی ہیں وہ اپنے پیروؤں کو اس ہولناک اندھیرے میں نہیں چھوڑ سکتا، اس کی اصطلاح میں وحی کی رہنمائی سے آزاد عقل کا نام ”ہومی“ ہے، جس کے بارے میں اس کے ارشادات یہ ہیں :-

وَلْيُؤْتِكُمُ الْحَقَّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ
وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (المؤمنون: ۷۱)

”اور اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو آسمان و زمین اور
ان کی مخلوقات درہم برہم ہو کر رہ جائیں“

أَقْمِنَ كَانٍ عَلَى بَيْتِنَا مَنْ رَبَّهِ كَمَنْ زَيْنَ لَهُ سُوءَ
عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (محمد: ۱۴)

”تو کیا وہ شخص جسے اپنے پروردگار کی طرف روشنی ملی ہو ان لوگوں کی
طرح ہو سکتا ہے جنہیں اپنی بد عملی اچھی لگتی ہے، اور جو اپنی خواہشات
نفس کی اتباع کرتے ہیں“

وَلَا تَطِيعُ مَنْ أَعْفَلْنَا قُلُوبَهُ عَنْ ذِكْرِ نَاوَاتَّبَعِ
هُوَ أَهْوَاءُ وَكَانَ أَمْرُهُ قُرْطًا، (کہف: ۲۸)

”اور تم اس شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی
یاد سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش نفس کے پیچھے ہو گیا،
اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا“

فَلَا يَصُدُّهَا عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ
فَكَرَدَ لِي (طہ: ۱۶)

”پس ہمیں آخرت سے ہرگز گریزاں نہ کرے وہ شخص جو اس پر
ایمان نہیں رکھتا، اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتا ہے (ایسا
نہ ہو کہ تم ہلاک ہو جاؤ“

وَمَنْ أَهْلٌ هِيَ مِنَ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغْيًا هُدًى مِنَ اللَّهِ،
(القصص: ۵۰)

”اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہو گا جو اللہ کی طرف سے آئی
ہوئی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے“

فَلْيَدْعُ إِلَيْكُمُ فَادْعُوا وَاسْتَقِيمُوا كَمَا أُمِرْتُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا
 أَهْوَاءَهُمْ رَالشوری: ۱۵)

”پس اسی کی تم دعوت دو، اور جیسا تمہیں حکم دیا ہے اس پر
 استقامت اختیار کرو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو
 أَفَلَمْآجَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّمَّا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمْ
 اسْتَكْبَرْتُمْ (البقرہ: ۸۷)

”تو کیا تمہارا حال یہ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہارے پاس آئی
 بات لے کر آئے جو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم نے

سرکشی کی“

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد اس عقل پر نہیں جو خواہشاتِ نفس
 کی غلام ہو، بلکہ اس عقل پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہدایات کی پابند
 اور اپنے حدودِ کار سے اچھی طرح واقف ہو، اور یہی عقلِ سلیم کی تعریف ہے،
 ۲۔ اسلامی احکام کی حکمتیں اور دین میں ان کا مقام

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے ذریعہ جو احکام دیے ہیں
 وہ معاذ اللہ عقل و حکمت کے خلاف ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے
 دیئے ہوئے احکام عقلِ سلیم کے عین مطابق ہیں، اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ
 صلاح و فلاح کا اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ اس کے ہر حکم
 میں بہت سی حکمتیں مصلحتیں اور انسانیت کے فوائد مضمر ہوتے ہیں، لیکن یہ
 ضروری نہیں کہ ہماری محدود عقل ان تمام حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ بھی
 کر سکے، ظاہر ہے کہ وہ خالق کائنات جس کے سامنے زمین و آسمان کی تمام
 موجودات اور ماضی و مستقبل کے تمام حالات ہیں، اس کے علم و حکمت کا کون
 احاطہ کر سکتا ہے؟ لہذا یہ عین ممکن ہے کہ قرآن و سنت کے کسی حکم کی حقیقی حکمت
 و مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آنے کا یہ نتیجہ

ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اس حکم ہی کو درست تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ اگر انسان کو اپنے فائدے کی تمام باتیں از خود سمجھ میں آسکتی تھیں تو پیغمبروں کو بھیجے اور آسانی کتابیں نازل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وحی و رسالت کا مقدس سلسلہ تو جاری ہی اس لئے کیا گیا ہو تاکہ اس کے ذریعہ انسان کو ان باتوں کی تعلیم دیا جاسکے جس کا ادراک نری عقل سے ممکن نہیں، اس لئے اگر اللہ پر اس کی قدرت کا ملکہ اس کے علم محیط پر، اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان ہے تو لازماً یہ بھی ماننے پڑے گا کہ اس کے نازل کئے ہوئے ہر حکم کی پوری پوری مصلحت کا بالکل سمجھ میں آجاتا ضروری نہیں، اور اگر اس کا کوئی حکم ہماری محدود عقل و نظر سے ماوراء ہو تو اُسے ملنے سے انکار کرنا کوئی معقول طرز عمل نہیں، اس بات کو ایک نظیر سے سمجھئے، دنیا کے جس کسی ملک میں کوئی قانون بنایا جاتا ہے وہاں قانون سازوں کے پیش نظر ہر قانون کی کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں، اور انہی مصلحتوں کی خاطر وہ قانون نافذ کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ملک کا ہر شہرہ منگ کے ہر قانون کی پوری پوری مصلحتوں سے باخبر ہو؟ ظاہر ہے کہ ملک میں بسا اوقات اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو قانون اور اس کی عائدگی کوئی پابندیوں کے قواعد سے واقف نہیں ہوتے، اب کسی ملک کا جو قانون اُس کے بہترین دماغوں نے تمام پہلوؤں سے نظر رکھ کر بنایا ہو، کیا اُسے اس بنا پر ناکارہ یا غلط کہا جاسکتا ہے کہ چند آن پڑھ دیہاتیوں کو اس کا فائدہ سمجھ میں نہیں آیا؟ اگر کوئی جاہل انسان محض اس بنا پر کسی قانون کی تعمیل سے انکار کرے، کہ اس کی مصلحتیں میری سمجھ سے باہر ہیں تو اس کا مقام جیل خانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر ماہرین قانون اور ایک جاہل انسان کے علم میں تو کسی نسبت کا تصور کیا بھی جاسکتا ہے، خالق کائنات اور ایک بے مقدار انسان کے علم میں تو کوئی نسبت ہی..... متصور نہیں، لہذا ایک انسان کے لئے یہ بات کیونکر معقول ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی صریح اور واضح حکم کو اس بنا پر رد کر دے

یا اس میں تاویل و تحریف کا مرتکب ہو کہ اس کے فوائد اس کی سمجھ میں نہیں آرہے،

۳۔ حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا

اسی بنا پر تمام اہل علم کا ہر دور میں اس بات پر اجماع رہا ہے کہ شرعی حکم کا دار و مدار ان کی حکمتوں پر نہیں بلکہ علتوں پر ہوتا ہے، چونکہ ہمارے دور میں بہت حضرات "علت" اور "حکمت" کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے، اس لئے یہاں مختصراً ان دونوں کی حقیقت بھی سمجھ لینا ضروری ہے،

"علت" اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قانون کے واجب لتعمیل ہونے کا لازمی سبب ہوتی ہے، اس کی حیثیت ایک ایسی لازمی علامت کی سی ہے جسے دیکھتے ہی قانون کے متبعین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ حکم کی پیروی کریں، اور "حکمت" اس فائدے اور مصلحت کو کہتے ہیں جو قانون وضع کرتے وقت قانون ساز کے پیش نظر ہوتی ہے، مثلاً شراب کریم نے شراب کی حرمت کا حکم دیا ہے، اور "نشہ" کو حرمت کی لازمی علامت قرار دیا گیا ہے، کہ جس چیز میں بھی نشہ ہو اس کا پینا ممنوع ہے، اور اس ممانعت کی بہت سی مصلحتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ ہوش و حواس کھو کر ایسے افعال میں مبتلا نہ ہوں جو انسانی شرف و وقار سے فروتر ہیں۔ اس مثال میں شراب کریم کا یہ ارشاد کہ شراب سے پرہیز کرو، ایک حکم ہے، "نشہ" اس حکم کی علت ہے، اور لوگوں کو ہوش و حواس کھو کر پڑے افعال سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب ممانعت کے حکم کا دار و مدار اس کی علت یعنی "نشہ" پر ہوگا، اور جس چیز میں بھی "نشہ" پایا جائے گا، اُسے حرام کہیں گے، اس حکم کی حکمت پر حکم کا دار و مدار نہیں ہوگا، لہذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں شراب پینے کے باوجود بہکتا نہیں ہوں اور نہ ہوش و حواس کھوتا ہوں، اس لئے شراب میرے لئے جائز ہونی چاہئے، یا اگر کوئی شخص کہنے لگے کہ آجکل شراب تیار کرنے کے زیادہ ترقی یافتہ ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں جنہوں نے اُس کے نقصانات کو کم کر دیا ہے، اور شراب پینے والوں کی ایک بڑی تعداد

شراب نوشی کے باوجود ہوش و حواس کے ساتھ اپنے کام کرتی رہتی ہے، اس لئے آجکل شراب جائز ہونی چاہئے، تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ عذر قابل سماعت نہیں ہوگا، اسی طرح قرآن و سنت نے اپنے متبعین کو مشقت سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا ہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنے کے بجائے آدمی نماز پڑھا کر وجہ ”قصر“ کہتے ہیں، اس مثال میں ”قصر“ ایک حکم ہے، سفر اس کی علت ہے، اور مشقت سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب حکم کا دار و مدار اس کی علت یعنی سفر پر ہوگا، حکمت پر نہیں، لہذا اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آجکل ہوائی جہازوں اور ریل کے آرام دہ ڈبوں نے سفر کو آسان کر دیا ہے، اور اب پہلی سی مشقت باقی نہیں ہی اسلئے آجکل ”قصر“ کا حکم باقی نہیں رہا، تو اس کا یہ کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ کے بندے کی حیثیت میں ہمارا کام حکم کی علت دیکھ کر حکم پر عمل کرنا ہے، اس حکم کی حکمتوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام کی تعمیل ہمارا منصب نہیں،

اور یہ قاعدہ صرف اسلامی شریعت ہی کا نہیں، بلکہ رائج الوقت قوانین میں بھی یہی قاعدہ کارفرما ہے، مثال کے طور پر ٹریفک کے حادثات کی روک تھام کے لئے حکومت نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب کسی چوراہے پر سُرُخ سگنل نظر آئے ہر گاڑی کے لئے رُک جانا لازمی ہے، اس مثال میں گاڑیوں کا یہ حکم کہ ”رُک جاؤ“ ایک قانون ہے، سُرُخ سگنل اس قانون کی علت ہے، اور تصادم کے خطرات سے بچاؤ کرنا اس کی ”حکمت“ ہے، اب اس حکم کا دار و مدار اس کی ”علت“ یعنی سُرُخ سگنل پر ہے، نہ کہ اس کی ”حکمت“ یعنی تصادم کی روک تھام پر، لہذا اگر کسی وقت حادثے کا کوئی خطرہ نہ ہو تب بھی سگنل دیکھ کر رُک جانا لازمی ہے، اور اگر کوئی ڈرائیور یہ سوچ کر سگنل پار کر جائے کہ اس کی نظر میں حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو قانون کی نظر میں وہ مجرم اور جلالان کا مستحق ہے،

غرض رائج الوقت قوانین میں بھی احکام کا دار و مدار ہمیشہ ان کی علتوں پر ہوتا ہے..... حکمتوں پر نہیں ہوتا، اور جب دنیا کے عام قوانین کا معاملہ یہ ہے

تو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین میں تو اس قاعدے کی پابندی زیادہ ضروری ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم ہر شرعی حکم کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے اس لئے اگر احکام کا مدار حکمتوں پر رکھا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایک فائدہ کو سمجھ کر اس کی واحد حکمت سمجھ کر اس کے مطابق کوئی اقدام کر بیٹھیں، حالانکہ اس کی دوسری بہت سی حکمتیں اور بھی ہوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ”حکمت“ یا ”مصلحت“ عموماً کوئی لگی بندھی، منضبط اور ایسی واضح چیز نہیں ہوتی جسے دیکھ کر ہر کس و ناکس یہ فیصلہ کر سچے کہ یہاں یہ حکمت حاصل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اب اگر حکم کا مدار و مدار اس کی حکمتوں پر رکھ دیا جائے تو احکام و قوانین کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے فلاں حکم پر اس لئے عمل نہیں کیا کہ اس وقت اس کی حکمت نہیں پائی جا رہی تھی، مثلاً اگر ہر شخص کو یہ آزادی دیدی جائے کہ وہ چوراہے عبور کرتے وقت خودیہ فیصلہ کرے کہ حادثے کا خطرہ ہے یا نہیں، اگر خطرہ ہو تو رُک جائے اور خطرہ نہ ہو تو آگے بڑھ جائے، تو اس کا نتیجہ شدید بد نظمی اور پہلے درجے کی ابتری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح اگر شراب کی حرمت کو اس کی علت یعنی نشہ کے بجائے اس کی حکمت پر موقوف کر دیا جائے تو ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے شراب سے ایسا نشہ لاحق نہیں ہوتا جو میرے ہوش و حواس گم کر کے میرے کاموں میں خلل انداز ہو، ایسی صورت میں حرمت شراب کا حکم محض ایک کھلونا بننے کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے؟

اس کے برعکس احکام کی علتیں ایسی لگی بندھی اور منضبط ہوتی ہیں کہ ہر شخص انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہاں علت پائی جا رہی ہے، لہذا ان کے ذریعہ احکام کی خلاف ورزی پر گرفت بھی باسانی ہو سکتی ہے، اور ان پر قوانین کا دار و مدار قرار دے کر ہی دنیا میں نظم و ضبط، امن و سکون اور قانون کا احترام پیدا کیا جاسکتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے بہت سے علماء نے اسلامی احکام کی حکمتیں اور

مصلحتیں واضح کرنے کے لئے باقاعدہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اور ہر حکم کے بارے میں بتایا ہے کہ اس سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں، لیکن نہ تو کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اسلامی احکام کی تمام حکمتوں کو یا گیلے ہے، اور نہ یہ غلط فہمی کسی کو ہوئی ہے کہ آئندہ ان احکام کی تعمیل حکمتوں اور مصلحتوں کو دیکھ دیکھ کر کجا سے گی، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ اسی مقصد کے لئے لکھی ہے کہ اس کے ذریعہ شریعت کی حکمتوں کو تفصیل سے واضح کریں، اور انہوں نے ایسے لوگوں کی سخت تردید کی ہے جو احکام شریعت کی حکمتوں کا انکار کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تحریر فرماتے ہیں :-

لا یحل أن یتوقف فی امتثال احکام الشرع اذا صحت بہا
 المراد علی معرفۃ تلك المصالح لعدم استقلال عقول
 کثیر من الناس فی معرفۃ کثیر من المصالح و لکن النبی
 صلے اللہ علیہ وسلم اوثق عندنا من عقولنا و لذ لك
 لم یزل هذا العلم مضمونا بہ علی غیر اہلہ؛

”یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ شریعت کے جو احکام صحیح روایت سے ثابت ہیں ان کی تعمیل میں اس بنا پر پس و پیش کیا جائے کہ ان کی مصلحتیں ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقلیں بہت سی مصلحتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتیں اور کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نزدیک ہماری عقلوں سے زیادہ قابل اعتماد ہیں اسی لئے اس علم (یعنی حکمت دین کے علم) کو ہمیشہ نا اصل لوگوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے“

لہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۶ ج ۱ مطبوعہ مکتبۃ سلفیہ لاہور ۱۳۹۵ھ، اسی کی مزید تفصیل تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب مذکور، ص ۱۲۹ ج ۱ باب الفرق بین المصالح والشرائع ۱۲

۴۔ احکامِ شریعت کا اصل مقصد اتباع کا امتحان ہے،

ایک اور چیز جو احکامِ شریعت کے معاملہ میں پیش نظر رہنی چاہئے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد ”اللہ کی بندگی“ ہے، ارشاد ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ،

(الذکریات : ۵۶)

اُد میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ

وہ میری بندگی کریں“

اور اس بندگی کا طریقہ بھی قرآن کریم نے واضح فرما دیا ہے، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکمل اتباع میں منحصر ہے، ارشاد ہے :-

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا
مِن دُونِهِمْ أَوْ يُبَدِّلُوا ، (الاعراف : ۷)

جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اُس کا اتباع کرو، اور اس کے علاوہ دوسرے (خود ساختہ) شرکاء کا اتباع نہ کرو“

يَقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ، اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلْكُمْ
أَجْرًا وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ۝ (یس : ۲۰ و ۲۱)

”اے میری قوم! (اللہ کے) پیغمبروں کی اتباع کرو، اُن کی اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اور وہ ہدایت پر ہیں!“
وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ،
(الزمر : ۵۵)

اُن بہترین باتوں کی اتباع کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہیں“

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبَارَكًا فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا
تَعْلَمُوا تَرْحَمُونَ (الانعام: ۱۵۳)

” اور یہ برکت والی کتاب ہو جسے ہم نے نازل کیا ہے، پس تم اسکے
اتباع کرو، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے “

فَأَمَّا مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنِّي أُوَفِّيهِ أَجْرًا كَبِيرًا
وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ (الاعراف: ۱۵۵)

پس تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جو اُمّی ہے، اور خود
اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور اس کی اتباع کرو “

قرآن کریم ہی نے یہ واضح فرمایا ہے کہ انسان کو پیدا کرنے اور اُسے مختلف احکام کا پابند
بنانے کا مقصد اس بات کی آزمائش ہے کہ کون اللہ اور اس کے رسول کی اتباع
کرتا ہے اور کون نہیں کرتا؟

الَّذِينَ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَسْئَلُوْكُمْ أَتَيْكُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ۲)

” اللہ وہ ذات ہے جس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا
تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے؟ “

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن
يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلٰى عَقْبَيْهِ (البقرہ: ۱۴۳)

” اور (وہ نبی!) جس قبلے پر آپ پہلے تھے اس کو ہم نے صرف اسی
لئے قبلہ بنایا تھا تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ کون رسول کی اتباع

کرتا ہے اور کون لٹے پاؤں لوٹ جاتا ہے “

اور جب بندے کا کام ہی اللہ اور اس کے رسول کی اتباع ہوا، اور اسی میں اس کی
ساری آزمائش ہے، تو اللہ اور اس کے رسول کا کوئی صریح حکم آجانے کے بعد انسان
کا کام بس تسلیمِ ختم کر دینا ہے، اُس کے بعد اُسے یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ حکم

اسے اچھا لگے تو قبول کرے اور اچھا نہ لگے تو اسے رد کرے ؛
 وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ
 أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ،
 (الاحزاب : ۳۶)

”اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا
 رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار
 باقی رہے !“

لہذا اللہ اور اس کے رسول کا واضح حکم سننے کے بعد اگر کوئی شخص اس بنا پر اسے
 ماننے میں تاہل کرے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تو درحقیقت
 وہ عقل کا نہیں، بلکہ اپنی خواہشات نفس یا شیطان کا اتباع کر رہا ہے :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ
 مَلَاحِ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ ، (الحجج : ۳۱)

”اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں (صحیح) علم کے بغیر
 جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں !“
 ایسے شخص کو آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی خسارہ اٹھانا پڑے گا :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْصِي اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِن أَصَابَ
 خَيْرٌ لِّطَمَآنٍ بِهِ ۖ وَإِن أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ أِنَّا نَقْلِبُ
 عَلَىٰ وَجْهِهِ قَعْنَبَةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ
 الْخُسْرَىٰ ۗ إِنَّ الْمُبِينَ ۗ (الحجج : ۱۱)

”اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (اس طرح) کرتا ہے (جیسے) کنارے
 پر (کھڑا ہو) پس اگر اسے کوئی (ذیبوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے
 سے مطمئن ہو گیا، اور اگر کوئی آزمائش پڑ گئی تو منہ اٹھا کر چل دیا ،
 (ایسا شخص) دنیا اور آخرت (دونوں) کے خسرانے میں ہو اور یہ
 کلمہ برافعالی ہے“

لہذا اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم اگرچہ اپنے پیچھے بیشمار حکمتیں اور مصالح رکھتا ہے، لیکن انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس حکم کی اطاعت کا مقصود اصلی اُن حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ بنائے، بلکہ اس کا اصل مطمح نظر ایک حقیقی بندے کی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی خوشنودی اور اس کے احکام کا اتباع ہونا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کریم میں سید کی حرمت کا حکم نازل ہوا، اور اس پر کفار نے یہ اعتراض کیا کہ:-

قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا،

”انہوں نے کہا کہ بیع سود ہی کی طرح تو ہے“

تو اس کے جواب میں بہت سی عقلی دلیلیں بھی دی جاسکتی تھیں، اور یہ بھی بتایا جاسکتا تھا کہ بیع و شراہ اور سودی لین دین میں کیا فرق ہے؟ لیکن ان ساری عقلی توجیہات کو چھوڑ کر قرآن حکیم نے ایک ہی ٹکسالی جواب دیا:-

وَاحْتَلَّ اللَّهُ التَّبِيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ: ۲۷۵)

”حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام“

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے ایک چیز کو حلال اور ایک کو حرام کر دیا تو اب تمہیں عقلی دلیلیں طلب کرنے کی گنجائش نہیں، تمہارے لئے دونوں کے درمیان یہی فرق کیا کم ہے کہ اللہ نے دونوں کا حکم یکساں نہیں رکھا، بلکہ ایک کو جائز اور دوسرے کو ناجائز قرار دیدیا ہے،

قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ دسیوں مقامات پر ذکر فرمایا ہے، اس واقعہ میں مذکور ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی تھی کہ ”میں آدم سے بہتر ہوں“ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو کیڑے سے“ غور فرمائیے کہ خالص اور آزاد عقل کے نقطہ نظر سے اس دلیل میں کیا خرابی تھی؟ لیکن یہی ”عقلی دلیل“ ابلیس کے رائدہ درگاہ ہونے کا سبب بن گئی، وجہ وہی تھی کہ واضح اور صریح حکم آجانے

کے بعد اس کے خلاف عقل کی پیروی درحقیقت عقل کی نہیں خواہشات کی غلامی ہو
شاعر مشرق علامہ اقبال نے یہی بات بڑے لطیف پیرایہ میں کہی ہے :-
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جرتیل نے ، جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

۵۔ قرآن و سنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ

اور جب انسان کا فریضہ احکام الہی کا اتباع ہے تو اس کا صاف اور
سادہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کا جو حکم صریح اور واضح ہو اسے اپنے واضح معنی
میں ہی اختیار کیا جائے، اور محض اس بنا پر اس میں توڑ مروڑ اور تاویل و تحریف
کا ارتکاب نہ کیا جائے کہ یہ واضح معنی ہمارے نفس کو پسند نہیں آ رہے، اللہ تعالیٰ
نے اپنی کتاب ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمائی ہے، اور اس لئے نازل فرمائی ہے
کہ اس کے احکام کا ادراک ہم محض اپنی عقل سے نہیں کر سکتے تھے، لہذا اُس کی
تشریح و تفسیر میں اگر ہم اپنی خواہشات کی بنا پر دروازہ کار تاویلات اختیار
کریں گے، تو یہ اُن احکام کا نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا اتباع ہوگا، اور اس
سے کتاب الہی کا مقصد نزول ہی تلبٹ ہو کر رہ جائے گا،

قرآن کریم کا معاملہ تو انتہائی ارفع و اعلیٰ ہے، خود انسانی ذہن کے تراشے
ہوئے قوانین کا حال یہ ہے کہ جب پارلیمنٹ کوئی قانون منظور کر لیتی ہے تو جج
کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اس قانون کی لفظی پیروی کرے، اگر اسے اپنے علم اور
تجربے کی روشنی میں وہ قانون غلط معلوم ہوتا ہو تب بھی وہ اس کے اتباع
پر مجبور ہے، اور اس کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنی ذاتی رائے کی
بنیاد پر قانون کی ایسی تعبیر و تشریح کرے جو اس کے الفاظ اور عبارتوں کے لحاظ
سے دروازہ کار ہو، موجودہ اصول قانون میں ایک مستقل بحث ”تعبیر قانون“

(Interpretation of statutes. سے متعلق)

ہوتی ہے، اس بحث کا خلاصہ ڈاکٹر صاحب پیٹن کے الفاظ میں یہ ہے :-
”انگریزی مقدمات میں تعبیر قانون کے تین بنیادی اصول تجویز کئے گئے ہیں

پہلا اصول لفظی اصول کہلاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قانونی دفعہ کا مطلب واضح ہو تو ہر حال میں اسی پر عمل کیا جائے گا، نتائج خواہ کچھ ہوں، دوسرا اصول ”سہرا اصول“ کہلاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قانون کے الفاظ کو ہمیشہ اُن کے معمولی معنی پہنائے جائیں گے، تا وقتیکہ ایسا کرنے سے کوئی اہمال یا قانون کی باقی دفعات سے واضح تضاد پیدا نہ ہوتا ہو، تیسرا اصول ’فسادی اصول‘ (**Mischief Rule**) ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس قانون کی عمومی پالیسی کیلئے ہے اور کس خرابی کو کرنا اس کے پیش نظر ہے۔“

آگے اس تیسرے اصول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

”یہ نظریہ کہ پارلیمنٹ کی نیت اور اس کے مقصد کی پیروی کرنی چاہئے، ہمیں (الفاظ قانون سے) زیادہ دور نکلنے کی گنجائش نہیں دیتا، کیونکہ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ تعبیر قانون کے وقت (پارلیمنٹ کی) داخلی نیت۔۔

(**Subjective Intention**) پر غور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ

پارلیمنٹ کی نیت بھی لازماً اس کے وضع کردہ قانون ہی سے نکالی جاسکتی ہے۔“

یہ اس قانون کا حال ہے جسے انسانی ذہن جنم دیتا ہے، اور جس کے بارے میں تھیٹن کے الفاظ میں خود ماہرین قانون کا اعتراف یہ ہے کہ :-

”یہ سمجھنا مبالغہ ہو گا کہ انسان اپنے ہر عمل کی کوئی معقول وجہ رکھتا ہے، اس

کے بجائے ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ہم کوئی کام پہلے کر لیتے ہیں اور سوچتے

بعد میں ہیں، ہمارا یہ طرز عمل صرف اسی قسم کی صورت حال سے مخصوص ہیں

جب ہم کسی تیز رفتار کار سے اپنی جان بچانے کے لئے چھلانگ لگاتے ہیں،

بلکہ یہ طرز عمل بسا اوقات اس وقت بھی ہوتا ہے، جب ہم معاشرتی رسوم و

عادتاً کو جنم دیتی ہیں، بلکہ اگر کسی ادارے یا قانون کی تشکیل کے وقت کوئی معقول پالیسی پہلے سے متعین رہی ہو تب بھی ایسا کمزور ہوتا ہے کہ قانون کا حاصل ہونے والا نتیجہ اُس مقصد سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کی خواہش نے وہ قانون بنوایا تھا۔

لیکن ایک بیج یہ جاننے کے باوجود کہ قانون کے موجودہ ڈھانچے سے اس کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے، اُس قانون کی لفظی پیروی پر مجبور ہو کر، اور اسے دروازہ کا تار پلا گھڑنے کا حق حاصل نہیں، خواہ وہ اس کی نظر میں مطلوبہ نتائج سے زیادہ قریب ہوں بلکہ بقول پیٹن :-

”اگر ہمیں غیر منصفانہ قوانین نافذ ہوں تو بھلی طرح کا قانون ساز ادارہ، تو انہیں منسوخ کر سکتا ہے، لیکن جج پر ایسے قانون کی پیروی لازم ہے، خواہ وہ اس قانون کے اصولوں کو کتنا ہی ناپسند کرتا ہو۔“

کیونکہ بیج درحقیقت قانون ساز نہیں، بلکہ شراح قانون ہے، اس کا منصب قانون وضع کرنا نہیں، بلکہ قانون کا اتباع کرنا ہے، اور وہ قانون کی تشریح بھی اپنی حدود میں رہ کر کر سکتا ہے، جو ”اتباع“ کے دائرے میں سما سکتی ہوں، اُسے ”اتباع“ کی حدود پھلانگ کر ”اصلاح و ترمیم“ کے منصب پر پہنچ جانے کا اختیار نہیں ہے، یہ حال انسان کے بنائے ہوئے اُن قوانین کا ہے جن میں فکری غلطیوں کے ہزار امکانات موجود ہیں جن میں نہ قانون سازوں کی امانت و دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے، نہ اُن کی عقل و فکر کو غلطیوں سے پاک کہا جاسکتا ہے، اور نہ اس بات کی کوئی ضمانت ہے کہ انہوں نے واقعہً اس قانون کے تمام ممکنہ نتائج پر مکافحہ غور کر لیا ہوگا،

پھر یہ ان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں جنہیں آنے والے دن کا بھی کچھ

پتہ نہیں کہ وہ حالات میں کیا تبدیلی لے کر نمودار ہوگا؟ اور نہ اس بات کا کوئی علم ہو کہ ہمارے مطلوبہ نتائج اس قانون سے حاصل ہو سکیں گے یا نہیں؟

جب محض قیاسات اور تخمینوں کے اندھیروں میں بنے ہوئے قوانین کا اتباع اس درجے میں لازم ہے تو وہ خالق کائنات جس کے علم محیط سے موجودات کا کوئی ذرہ مخفی نہیں جو زمانے کے تمام بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر ہے جو انسان کے نفع و نقصان اور اس کی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے، اس کے بنائے ہوئے قوانین میں محض اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر دو دراز کار تا دیلات تلاش کرنا آخر کونسی عقل، کونسی دیانت اور کونسے انصاف کی رُو سے درست ہو سکتا ہے؟

۶۔ زمانے کی تبدیلی اور احکام شریعتیہ

پھر یہاں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری ہے، آجکل یہ بات تفسیراً ہر "جُدت پسند" کی زبان پر رہتی ہے کہ کسی بھی نظام قانون کو جامد (Static) نہیں ہونا چاہئے، بلکہ حالات کے لحاظ سے تغیر پذیر (Dynamic) ہونا چاہئے، اور یہ بات "جُدت پسند" ذہن کی خاصیت ہے کہ اس کی نظر میں جب کوئی چیز بُری قرار پاتی ہے تو وہ ہر حال میں سرتاپا بُری ہوتی ہے، اور اس کا نام ہی گالی بن جاتا ہے، اور جب کوئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے تو وہ ہر حال میں سرتاپا خیر ہی قرار پاتی ہے، اور جگہ بے جگہ اس کا استعمال ایک فیشن بن جاتا ہے، یہی حال جامد (Static) اور تغیر پذیر (Dynamic) کی اصطلاحات کا ہے کہ اول الذکر کی بُرائی کرنا، اور متوخر الذکر کی تعریف کرنا آج کا علمی فیشن بن چکا ہے، اور جس "جُدت پسند" کو دیکھئے، دنیا کی ہر چیز میں "جامد" اور "نا قابل تغیر" کے نام سے مٹہ بنانے اور "تغیر پذیر" کے نام سے خوش ہونے کا عادی بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ مغرب کے فکری نظام میں کوئی بڑے سے بڑا اخلاقی یا دینی اصول ناقابل تغیر باقی نہیں رہا، بلکہ انھوں نے زندگی کی ہر چیز کو "تغیر پذیر" کی خرد پر گھس دیا ہے، اور اس کی دست برد سے نہ کوئی دینی عقیدہ محفوظ ہو اور نہ کوئی اخلاقی اصول صحیح سالم رہا ہے،

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ ہر چیز کا ہر حال میں "نا قابل تغیر" رہنا انسانیت کے لئے مفید ہے اور نہ ہر چیز کا ہر حال میں "تغیر پذیر" رہنا، انسان کو اس دنیا میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے جہاں اس بات کی ضرورت ہو کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کرتا رہے وہاں اس بات کی بھی شدید ضرورت ہو کہ اس کے پاس کچھ اصول و احکام ہر حال اور ہر زمانے میں آن مٹ اور ناقابل ترمیم ہوں، اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان میں تبدیلی نہ کر سکے، ورنہ اس کی بہیمی اور نفسانی خواہشات "زمانے کی تبدیلی" کی آڑ لے کر اس کو شر و فساد اور اخلاقی دیوالیہ پن کی اس آخری سرحد تک پہنچا سکتی ہیں جہاں وہ "انسانیت" کے ہر جملے سے آزاد ہو کر جانوروں کی صف میں شامل ہو جائے، اگر دنیا کے ہر فکری اصول، ہر اخلاقی ضابطے اور ہر قانونی حکم کو "تغیر پذیر" قرار دے کر جب جی چاہے بدل دینے کی آزادی ہو تو اس کا انجام اُس حلاق باختگی، انسانیت کشی اور اضطراب و سبھی کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، جو ہمارے زمانے میں مغربی معاشرے کا مقدّر بن چکی ہے اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ تمام فکری اصول اور قانونی احکام قابل ترمیم و تغیر نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ کچھ احکام ایسے بھی رہنے ضروری ہیں جو کسی حال تبدیل نہ ہوں تو اب صرف یہ مسئلہ باقی رہتا ہے کہ قانون کے کون سے احکام کو ناقابل تغیر قرار دیا جائے اور کون سے احکام کو قابل تغیر؟ اگر اس مسئلے کو "عقلِ خالص" کے حوالے کیا جائے تو اس کی نارسائی کا مفضل حال آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اس کے علاوہ اس مسئلے کو "نرمی عقل" کے حوالہ کر کے آپ کبھی ایسے ناقابل تغیر اصول و احکام حاصل نہیں کر سکتے، جو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان متفق علیہ ہوں، کیونکہ دنیا میں ہر شخص کی عقل کا فیصلہ اور سوچ کے نتائج دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ایک شخص یا جماعت کسی ایک اصول کو ناقابل تغیر قرار دے گی اور دوسرا شخص یا جماعت کسی دوسرے اصول کو اور مسئلہ جوں کا توں باقی رہے گا، لہذا اس مسئلہ کا حل بھی مجبوز اس کے کوئی نہیں کہ جس ذات نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو انسان کی تمام

واقعی ضروریات سے بھی باخبر ہے اور اس کے نفس کی چوریوں سے بھی آگاہ ہے، اسی سے اس معاملہ میں رہنمائی طلب کی جائے، اور اس سے رہنمائی طلب کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اُس کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کی طرف رجوع کیا جائے، جو بالترتیب قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہیں۔ جب ہم قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور سے نظر آتا ہے کہ ان میں بعض احکام صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان ہو کر ہیں، اور بعض احکام میں ان دونوں نے محض چند موٹے موٹے اصول بیان کرنے پر اکتفا فرمایا ہے، اور ان کی جزوی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں، قرآن کریم کے ارشادات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت چونکہ کسی خطے یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے عام ہے، اس لئے جن احکام پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اُن کو قرآن و حدیث میں صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اور بعض اوقات اُن کی جزوی تفصیلات بھی بیان فرمادی گئی ہیں، اس کے برعکس جو احکام زمانے کی تبدیلی سے متاثر ہو سکتے تھے قرآن و حدیث نے اُن کی جزوی تفصیلات معین کرنے کے بجائے کچھ عام اور ہمہ گیر اصول بیان فرمادیئے ہیں، جن کی روشنی میں ہر دور کے اہل علم جزوی تفصیلات معین کر سکیں،

لہذا قرآن و حدیث میں جو احکام منصوص ہیں اور جن پر امت کا اجماع منفق ہو چکا ہے وہ قطعی طور پر ناقابل تغیر اور ہر دور کے لئے واجب العمل ہیں، کیونکہ اگر زمانے کے بدلنے سے اُن میں فرق پڑتا تو انھیں قرآن و حدیث میں منصوص نہ کیا جاتا، ہاں جو احکام قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں، اور نہ اُن پر امت کا اجماع منفق ہوا ہے اُن میں قرآن و سنت کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق قیاس و اجتہاد کی گنجائش ہے، اسی قسم کے احکام پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی ہے، اور ایسے ہی احکام کے بارے میں فقہاء کا یہ مقولہ ہے کہ:

الاحکام تتغير بتغير الزمان

احکام زمانے کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں

ورنہ اگر قرآن و سنت کے واضح اور صریح احکام میں بھی زمانے کی تبدیلی سے ترمیم و تغیر کی گنجائش ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو آسمانی کتاب نازل کرنے اور پیغمبروں کو مبعوث فرمانے کی کوئی ضرورت نہی تھی، بس ایک ہی حکم کافی تھا، کہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عقل سے احکام وضع کر لیا کرو، لہذا جو شخص قرآن و سنت کے صریح اور واضح احکام سننے کے بعد بھی ”زمانے کی تبدیلی“ کا عذر پیش کرتا ہے، یا زمانے کی تبدیلی کی بنیاد پر قرآن و سنت کے واضح احکام کو من مانے معنی پہنانے اور ان میں ترمیم و تحریف کے لئے تیار رہتا ہے، وہ آسمانی کتابوں کے نزول اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بنیادی مقصد تک سے بے خبر ہے،

۷۔ زمانے کی تبدیلی کا مطلب

پھر یہاں ”زمانے کی تبدیلی“ کا مطلب سمجھ لینا بھی ضروری ہے، زمانے کی جو تبدیلی احکام شرعیہ پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ تبدیلی جو جس سے حکم کی علت بدل جائے، مثلاً ہمارے قدیم فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گھوڑا کریمہ پر لے اور گھوڑا کے مالک سے یہ طے نہ کرے کہ کتنی دور اس پر سفر کرنا ہے اور اس کی نکل اجرت کیا ہوگی، تو یہ اجارہ فاسد اور ناجائز ہے، لیکن آج جبکہ میٹر والی ٹیکسیاں ایجاد ہو چکی ہیں تو یہ حکم باقی نہیں رہا، آج لوگ ٹیکسی میں بیٹھے سے قبل ڈرائیور سے کوئی معاملہ نہیں کرتے، اور فریقین میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں مہوتا کہ سفر کی مجموعی اجرت کیا ہوگی، لیکن اس کے باوجود یہ اجارہ جائز اور درست ہی، وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ کے فقہاء نے جو مسئلہ بیان کیا تھا اس کی علت خود انہی کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ اجرت طے نہ ہونے کی صورت میں فریقین کے درمیان جھگڑنے کا قوی امکان تھا، اب

۱۔ علت کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے گزشتہ قریبی صفحات میں عنوان ”حکمتوں پر حکم کا دار نہیں ہوتا، ضرور ملاحظہ فرمایا جائے،

زمانہ بدل گیا اور میٹروں کی ایجاد کے بعد عرف عام یہ ہو گیا کہ میٹر جو اجرت بتا دیتا ہے اس پر فریقین متفق ہو جاتے ہیں، اس لئے جھگڑے کا وہ قوی امکان باقی نہیں رہتا جو معاملہ کے ناجائز ہونے کی علت تھا، چنانچہ زمانے کی اس تبدیلی سے حکم بھی بدل گیا، اس کے برعکس جہاں حکم کی علت برقرار ہو وہاں محض زمانے کے عام چلن کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اسلام میں اس اصول کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کہ زمانے میں جس جس برائی کا رواج پھیلتا جائے اس کو جائز و حلال اور جس جس شکی کو لوگ چھوڑتے جائیں اُسے غیر ضروری قرار دیتے جاؤ، کیونکہ اس شکست خوردہ ذہنیت کی تان بالآخر اسی ”خوابِ ہش پرستی“ پر جا کر ٹوٹتی ہے جس سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا ہے اور جس کی غلامی سے نجات دینے کے لئے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں،

۸۔ عقل کا صحیح دائرہ کار،

مذکورہ بحث کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ جو احکام قرآن و سنت میں منصوص ہیں اُن کے بارے میں زمانے کے کسی مروجہ نظریہ یا اہل زمانہ کے عام چلن سے مرعوب و متاثر ہو کر عقلی گھوڑے دوڑانا اور قرآن و سنت کو ٹوڑ مڑ کر ان میں دوڑا کر تاویلات تلاش کرنا یا زمانے کی تبدیلی کا عذر پیش کرنا کسی طرح درست نہیں، کیونکہ قرآن و سنت میں جو احکام منصوص ہیں وہ ایسے ہی ہیں جن پر زمانے کی تبدیلی سے کوئی حقیقی اثر نہیں پڑتا، خواہ زمانے کے شور و شغب اور خواہشات کی زد سے انھیں کتنا ہی اجنبی اور اچنبھا بنا دیا ہو، لہذا ایسے مواقع پر عقلی تاویلات کو احکام شرعیہ میں دخل دینا درحقیقت عقلِ سلیم کا نہیں بلکہ اُس ”عقل“ کا اتباع ہے جو خواہشاتِ نفس کی غلام ہوتی ہے، اور جس کے بارے میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا نتیجہ بدترین گمراہی اور انسانیت، اخلاق اور شرافت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں،

حقیقت یہ ہے کہ خود ”عقلِ سلیم“ ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی دماغ کی حدود

کو پہچانا جائے، اور اس پر وہ بوجھ نہ ڈالا جائے جس کا وہ تحمل نہیں ہے، اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کی صلاحیت کی کچھ حد و دہلیز ہیں، جن سے آگے وہ کام نہیں رہتی، ”عقل“ بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہے، اور اس کی صلاحیتیں بھی غیر محدود نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنی حقائق و احکام کی طرف انسان کی رہنمائی فرمائی ہے، جن کے ادراک میں عقل ٹھوکریں گھاٹا سٹی، لہذا ان آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کی صراحتوں کے مقابلہ میں عقلی حکمتوں کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق ہوائی جہاز کے انجن کو ریل گاڑی کے اصولوں کے مطابق ٹیسٹ کرنا شروع کرے،

آخر میں یہ بات وہ نشین کر لینا بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن و سنت پر ایمان لانے کے بعد عقل کا کوئی کام باقی ہی نہیں رہتا، وجہ یہ ہے کہ انسان کو زندگی میں جن کاموں سے سابقہ پیش آتا ہے ان میں سے ایسے افعال بہت کم ہیں جنہیں شریعت نے فرض و واجب یا مسنون و مستحب یا حرام و مکروہ قرار دیا ہے، اس کے مقابلے میں ایسے افعال بے شمار ہیں جنہیں ”مباح“ قرار دیا گیا ہے، یہ ”مباحات“ کا دائرہ عقل کی وسیع جولانگاہ ہے، جس میں شریعت کوئی مداخلت نہیں کرتی، ان ”مباحات“ میں سے کسی کو اختیار کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا عقل ہی کے سپرد کیا گیا ہے، اس وسیع جولانگاہ میں عقل کو استعمال کر کے انسان مادی ترقی اور سائنٹفک انکشافات کے باہم عروج تک بھی پہنچ سکتا ہے، اور ان ترقیات و انکشافات کا صحیح فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے، اس کے برعکس احکام الہیہ میں دخل اندازی کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ ترقیات جن کو انسانیت کیلئے باعثِ رحمت ہونا چاہئے تھا، ان کا نہ صرف صحیح فائدہ انسان کو حاصل نہیں ہو رہا، بلکہ بسا اوقات وہ انسان کے لئے ایک عذاب کی صورت اختیار کر گئی ہیں، یہ تمام ترتیب اس بات کا ہے کہ ”عقل“ پر وہ بوجھ لا دیا گیا ہے جو اس کی برداشت سے باہر تھا، اور جس کا تحمل انسان سے وحی الہی کے مکمل اتباع کے بغیر

ہو ہی نہیں سکتا،

فلسفہ تالیخ کے مشہور امام علامہ ابن خلدونؒ نے اس سلسلے میں بڑی نفیس بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

فانهم ادراكك ومدراكك في الحصر، واتبع ما امرك الشارع
من اعتقادك وعملك، فهو احرص على سعادتك، واعلم
بما ينفعك لانه من طور فوق ادراكك ومن نطاق اوسع
من نطاق عقلك وليس ذلك بقادح في العقل ومداركة
بل العقل ميزان صحيح، فاحكامه يقينية لا كذب فيها
غير انك لا تطمح ان تنزن به امور التوحيد والاخرى وحقيقة
النبوة وحقائق الصفات الالهية وكل ما وراء طوره، فان
ذلك لطبع في محال، ومثال ذلك مثال رحل رأى الميزان
الذي يوزن به الذهب، فيطمح ان يزن به الجبال، هذا
لا يدرك على ان الميزان في احكامه غير صادق،
لكن العقل يقف عنده ولا يتعدى طوره،

”لہذا تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دیتے ہیں خطا وار سمجھو، جو کچھ تم
جانتے ہیں تمام موجودات ان میں منحصر ہیں، اور شارع علیہ السلام کے بتائے
ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو، کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے
بہی خواہ اور سورد و ہیبرود کو سمجھنے والے ہیں، ان کا علم تمہارے علم سے بلند اور اس
ذریعے سے حاصل ہونے والا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے،
اور یہ بات عقل اور اس کی معلومات کے لئے کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ عقل
درحقیقت ایک صحیح میزان ہے، جس کے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں“

۱۰ معتزمہ ابن خلدونؒ،

لیکن یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرت کے امور نبوت و صفات اکیس یا کسی اور ایسی چیز کا وزن کرنے لگو جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص سونا تو لے گا کاٹنا دیکھے اور پھر اسے پہاڑوں کو توڑنے کی خواہش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ (جب اس میں پہاڑ نہ مل سکیں تو) یہ نہیں کہا جائے گا کہ ترازو جھوٹی ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہر میزان کی ایک حد ہوتی ہے، جس سے آگے وہ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح میزان عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی ہے، اور اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی ۱۱

اسی طرح قرآن و سنت نے بہت سی باتیں خود بیان کرنے کے بجائے فقہاء کے جہاد و استنباط پر چھوڑ دی ہیں، چنانچہ جو لوگ اس کام کے اہل ہوں، ان کے لئے قرآن و سنت اور اصول شریعت کی روشنی میں احکام کا استنباط عقل کے استعمال کا دوسرا بڑا امیدا ہے، جس میں ہر زمانے کے فقہاء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں، لیکن قرآن و سنت کی صراحتوں کو چھوڑ کر یا اصول شرعیہ کو پامال کر کے محض عقل کی بنیاد پر قرآن و سنت میں توڑ مروڑ کی کوشش سونے کے کانٹے سے پہاڑوں کو توڑنے کے مراد ہے، آخر میں اس بحث کو ہم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں :-

”یہ منشاء ہرگز نہیں کہ فکر و ہمت مدعاں ایک محض عجت اور لغو چیز ہے، یا اس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے، لیکن ہاں، کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں کہتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکری ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السلام کے پاک و صاف، صحیح و صادق اور بلند و برتر تعلیمات کو زبردستی ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اس کا ضمیر بھی خود اندر سے نعریں کر رہا ہو، اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر

اپنی عقلی معلومات کو ان کے تابع بنا دے، اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراضِ روحانی کے حق میں اکیسرفا تصور کر کے سماعاً و طاعتاً کہتا ہوا بلا حجت و تکرار سر اور آنکھوں پر رکھے،

والذین ساجدون فی اللہ من بعد ما استجیب لہم حجبتہم
 و احصنتہ عنہم و علیہم غضب و لہم عن اب شدید
 ”اور جو لوگ اللہ کے بارے میں نبی سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ آدمی اس کی بات
 قبول کر چکے تو ان کی حجت باطل ہو، اور اُن پر خدا تعالیٰ کا غضب ہے، اور
 اُن کے لئے سخت عذاب ہے“

—————

502

قرُونِ اُولٰی کے بعض مفسرین

ہمارا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل اور مبسوط تاریخ بھی ذکر کی جائے، لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا، اس کے علاوہ اس موضوع پر مستقل کتابیں منظر عام پر آنے لگی ہیں، لہذا علم تفسیر کی مکمل تاریخ کے بجائے اس باب میں ہم صرف قرُونِ اُولٰی کے بعض ایسے مفسرین کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جن کے حوالے تفسیر کی کتابوں میں انتہائی کثرت سے آتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ تفسیر کا مطالعہ کرتے وقت مندرجہ ذیل مباحث ذہن میں رہیں تو ان حضرات کے اقوال سے صحیح نتیجے تک پہنچنے میں انشاء اللہ آسانی ہوگی،

یوں تو صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت
حضرت عبداللہ بن عباسؓ علم تفسیر کی خدمت کے لئے معروف ہے،

لیکن ان حضرات میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بطور خاص ایک امتیازی مقام حاصل ہے، اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ان کے حق میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم تفسیر کی مہارت کی دعاء فرمائی تھی، متعدد روایات میں وارد ہے کہ آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر یہ دعاء فرمائی کہ:

اللہم فقہہ فی الدین وعلّمہ التاویل

یا اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور انھیں تفسیر قرآن کا

علم عطا فرما،

اور ایک مرتبہ یہ دُعا فرمائی کہ :-

اللهم بارک فیہ وانشر منہ

یا اللہ! ان کو برکت عطا فرما اور ان کے ذریعہ

علم دین کو عام فرما!

اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

نعم ترجمان القرآن انت

”تم قرآن کریم کے اچھے ترجمان ہو“

چنانچہ ان کو صحابہ کرامؓ ”ترجمان قرآن“ اور ”الحجّر“ (زبردست عالم) اور ”البحر“ (دریائے علم) کے القاب سے یاد کرتے تھے، چنانچہ بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی کم سنی کے باوجود تفسیری معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کے قول کو خاص وزن دیتے تھے،

خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے انصار کے صاحب سے کہا کہ ابھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہ باقی ہیں، آؤ ہم ان سے (علم کی باتیں) معلوم کیا کریں، ان صاحب نے کہا: ”کیا آپ کا خیال ہے کہ کسی وقت لوگ علم کے معاملہ میں آپ کے محتاج ہوں گے؟ (جو اُس وقت کی تیاری ابھی سے کرنا چاہتے ہیں)۔“ چنانچہ انھوں نے میری تجویز منظور نہ کی، اور میں نے تنہا یہ کام شروع کر دیا، کہ صحابہؓ کے پاس جاتا اور ان سے علم کی باتیں معلوم کرتا رہا، اگر مجھے کسی شخص کے حوالہ سے کوئی حدیث پہنچتی تو میں اُس کے دروازے پر پہنچ جاتا، معلوم ہوتا کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں ہیں تو میں اپنی چادر کو تکیہ بنا کر وہیں دروازہ

۱۔ الاصابہ، للحافظ ابن حجر، ص ۲۲۳ ج ۲،

۲۔ الاتقان ص ۱۸۷ ج ۲ بحوالہ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم،

۳۔ ایضاً بحوالہ مذکور،

پر بیٹھ رہتا، ہوا کے جھکڑ میرے چہرے پر مٹی لاکر ڈالتے رہتے، جب وہ صاحب باہر نکل کر مجھے دیکھتے تو کہتے: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی! آپ کیوں تشریف لاتے؟ میرے پاس پیغام بھیج دیا ہوتا، میں آپ کے پاس چلا آتا!“ میں جواب میں کہتا: ”نہیں! یہ میرا فرض تھا کہ آپ کے پاس آؤں“ چنانچہ میں اُن سے اس حدیث کے بارے میں پوچھتا (یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا) وہ انصاری بزرگ (جنہوں نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا) بعد میں کافی دن تک زندہ رہے، یہاں تک کہ انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا کہ لوگ میرے ارد گرد جمع ہیں، اور مجھ سے سوالات کر رہے ہیں، اس وقت انہوں نے کہا کہ ”یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا!“

عبید اللہ بن علی بن ابی رافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ، ابورافعؓ کے پاس آتے اور ان سے پوچھتے کہ فلاں دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا تھا؟ اور ابن عباسؓ کے پاس ایک آدمی اور ہوتا جو ابورافعؓ کا جواب لکھ لیتا تھا، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ہر وقت طلبہ علم کا جگمگا لگا رہتا تھا، اور آپ اُن کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر، احادیث نبویہ اور فقہی مسائل وغیرہ بیان فرماتے رہتے تھے۔

انہی وجوہ کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو امام مفسرینؒ کہا جاتا ہے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں سب سے زیادہ روایات انہی سے مروی ہیں، البتہ اُن سے جو روایات مروی ہیں اُن کا ایک بڑا حصہ ضعیف بھی ہے، لہذا اُن کی روایات سے استفادہ کے لئے انہیں اصول حدیث کی شرائط پر جانچنا

۱۔ الاصابہ، ص ۳۲۳ ج ۲، بحوالہ مسند دارمی و مسند حارث بن ابی اسامہ، مزید ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ص ۳۸ ج ۱ طبع دکن، ۲۔ ایضاً بحوالہ مسند روایاتی، ۳۔ ملاحظہ ہو الاصابہ، ص ۳۲۵ ج ۲ والاستیجاب علی ہامش الاصابہ ص ۳۲۴ ج ۲،

ضروری ہے، اس سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنے کی ہیں :-

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایات میں سب سے زیادہ قوی اور قابل اعتماد وہ روایات ہیں جو "ابوصالح عن معاویة بن صالح عن علی بن ابی طلحة عن ابن عباسؓ" کے طریق سے مروی ہیں، امام احمدؒ کے زمانہ میں مصر میں حضرت ابن عباسؓ کی تفاسیر کا ایک مجموعہ اسی سند کے ساتھ موجود تھا، امام احمدؒ اس کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کا قصد لے کر مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی، یہ نسخہ تو بعد میں نایاب ہو گیا، لیکن بہت سے محدثین اور مفسرین نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی بہت سی روایات تعلیقاً ہی ہیں، نیز حافظ ابن جریرؒ ابن ابی حاتم اور ابن المنذرؒ نے متعدد واسطوں سے بہت سی روایات اسی طریق سے نقل فرمائی ہیں، گولڈزیہر کا ایک مغالطہ | یہاں ایک مغالطہ کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا، مشہور مستشرق گولڈزیہر (Goldziher) نے اپنی

کتاب "مذاهب التفسیر الاسلامی" میں حسب عادت یہ مغالطہ انگیزی کی ہے کہ :-
 "خود مسلمان ناقدین حدیث اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے وہ تفسیری اقوال خود نہیں سنے جو انھوں نے اس کتاب میں کر کے ہیں، خود اسلامی نقد حدیث کا یہ فیصلہ ابن عباسؓ کی تفاسیر کے اُس مجموعہ کے بارے میں ہی جو سب سے زیادہ قابل قبول سمجھا جاتا ہے"

لیکن گولڈزیہر نے یہ ذکر نہیں کیا کہ نقد حدیث کے ماہر علماء نے جہاں یہ لکھا ہے کہ علی بن ابی طلحہؓ نے یہ تفسیری اقوال حضرت ابن عباسؓ سے نہیں سنے، وہاں انھوں نے تحقیق کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ روایات علی بن ابی طلحہؓ نے کچھ مجاہدؒ سے لی ہیں

اور کچھ سعید بن جبیر سے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:-

بعدا ان عرفت الواسطة وهي ثقة فلا ضير في ذلك
 ”جب بیچ کا واسطہ معلوم ہو گیا، اور وہ ثقہ ہے، تو اب کوئی حرج
 باقی نہیں رہا“

علی بن ابی طلحہ کے اس طریق کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ کی روایات کے اور بھی متعدد صحیح
 یا حسن طرق ہیں مثلاً ابو ثور عن ابن جریج عن ابن عباسؓ یا حجاج بن محمد عن
 ابن جریج عن ابن عباسؓ یا قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر
 عن ابن عباسؓ یا ابن اسحاق عن محمد بن ابی محمد عن عکومة او
 سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ وغیرہ (الاتقان)

(۳) حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات مندرجہ ذیل اسانید سے آئی ہیں وہ ضعیف ہیں۔
 (الف) محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ
 اور جب کلبی سے محمد بن مروان السدقی الصغیر روایت کریں تو
 اس سند کو محدثین سلسلۃ الکذب قرار دیتے ہیں، مفسرین میں سے ثعلبی اور
 واحدی نے اس سلسلے سے بکثرت روایات نقل کی ہیں،

(ب) ضحاک بن مزاحم عن ابن عباسؓ، یہ طریق اس لئے ضعیف
 ہے کہ ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں، اور اگر ضحاک
 سے روایت کرنے والے بشر بن عمارہ عن ابی روق ہوں تو یہ سلسلہ
 اور ضعیف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بشر بن عمارہ ضعیف ہیں، اور اگر ضحاک
 سے روایت کرنے والے جوہر ہوں تو اس کا ضعف اور زیادہ ہو جاتا ہے،
 کیونکہ جوہر نہایت ضعیف ہیں،

(ج) عطیة العوفی عن ابن عباسؓ، یہ طریق بھی عطیة العوفی کے ضعف

کی بنا پر ضیعت ہی، البتہ بعض حضرات اُسے حسن کہتے ہیں، کیونکہ امام ترمذی نے عطیہ کی روایات کی تحسین کی ہے، اس مسئلہ پر مفصل بحث عطیہ العونی کے تذکرہ میں آ رہی ہے،

(د) مقاتل بن سلیمان عن ابن عباسؓ، یہ طریق بھی مقاتل بن سلیمان کے ضعف کی بنا پر مجروح ہے، مقاتل کا پورا حال بھی آگے آ رہا ہے،

(۴) ہمارے زلمنے میں ایک کتاب.....
مروّجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حیثیت "تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباسؓ" کے نام سے

شائع ہوئی ہے جسے آجکل عموماً "تفسیر ابن عباسؓ" کہا اور سمجھا جاتا ہے، اور اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں کیونکہ یہ کتاب محمد بن مروان السدّاتی عن محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ اس سند کو محدثین نے "سلسلہ الکذب" (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے، لہذا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا،

حضرت علیؓ تفسیر قرآن کے معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام انتہائی بلند ہے، پہلے تین خلفاء کی وفات چونکہ جلدی ہو گئی تھی اس لئے

اُن سے تفسیری روایات بہت کم مروی ہیں، اس کے برخلاف حضرت علیؓ عرصہ دراز تک افادۂ علم میں مشغول رہے، اس لئے ان سے بہت سی روایات منقول ہیں، علم تفسیر میں اُن کے مقام بلند کا اندازہ اس سے لگاتے کہ ابو لطفیلؓ کہتے ہیں:-

"میں نے حضرت علیؓ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا، وہ فرما رہے تھے کہ.....

مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوالات کیا کرو، کیونکہ خدا کی قسم! قرآن کریم

۱۵ یہ پوری بحث الاتقان ص ۸۸، ۸۹، ۹۰ ج ۲ نوع نمبر ۸۰ سے ماخوذ ہے، مزید تفصیل کے لئے ان ردیوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمایا جو آگے آ رہا ہے، ۱۵ دیکھئے تنویر المقیاس صفحہ اول،

کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، میدان میں اُتری یا پہاڑ پر؟

حضرت علیؑ نے چونکہ آخرین کوفہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا، اس لئے آپ کا علم زیادہ تر اسی علاقے میں پھیلا، اور آپ کی بیشتر روایات اہل کوفہ سے مروی ہیں،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رضی اللہ عنہما جن سے قرآن کریم کی بہت سی تفاسیر منقول ہیں، بلکہ اُن کی مرویات حضرت علیؑ سے بھی زیادہ ہیں، حافظ ابن جریرؒ وغیرہ نے اُن کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:-

والذی لا الہ غیرہ ما نزلت الیہ من کتاب اللہ الا وانا اعلم فین نزلت واین نزلت، ولو اعلم مکان احدہ اعلم بکتاب اللہ منی تنالہ المطیلا لاتیة

”قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کہ کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی ہے، اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس شخص کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ معلوم ہو جائے جو کتاب اللہ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہو تو میں اُس کے پاس ضرور جاؤں گا، بشرطیکہ اس کی جگہ تک اونٹنیاں جاسکتی ہوں“

مشہور تابعی حضرت مسروق بن الابدعؓ فرماتے ہیں کہ:-

”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمارے سامنے ایک سورت پڑھتے، اور دیکھتا کہ بیشتر حصہ اس کی تفسیر میں اور اس کے بارے میں احادیث بیان کرنے میں صرف فرمادیتے تھے“

اور حضرت مسروقؓ بھی کا قول ہے کہ میں نے بہت سے صحابہ کرامؓ سے استفادہ کیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہؓ کے علوم چھ آدمیوں میں جمع تھے :-
حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین، پھر میں نے غور کیا تو ان اچھے نصرات کے علوم دو حضرات کے درمیان منحصر پائے، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

حضرت اُبی بن کعبؓ
حضرت اُبی بن کعبؓ بھی ان صحابہ میں سے ہیں جو تفسیر اور قرآآت کے علم میں معروف تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا:

اقروہم اُبی بن کعبؓ
صحابہ میں سب سے بڑی قاری اُبی بن کعبؓ ہیں

آپ کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جیسے امام المفسرین نے آپ سے استفادہ کیا ہے، حضرت معمرؓ فرماتے ہیں:-
عامة علما بن عباس من ثلثة، عمرؓ و علیؓ و اُبی بن کعبؓ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیشتر علوم تین حضرات سے ماخوذ ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اُبی بن کعبؓ پہلے مفسر ہیں، جن کی تفسیر کتابی صورت میں مرتب ہوئی، ان کی تفسیر کا ایک بڑا نسخہ تھا، جس کو ابو جعفر رازی بوا ربيع بن انس عن ابی العالیہ روایت کرتے تھے، امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ، امام

احمد بن حنبلؒ اور امام حاکمؒ نے اس کے روایات لی ہیں، امام حاکمؒ کی وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسخہ پانچویں صدی تک موجود تھا۔
 مذکورہ حضرات کے علاوہ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیر قرآن کے سلسلے میں روایات منقول ہیں،

صحابہؓ کے بعد

صحابہ کرامؓ نے مختلف مقامات پر قرآن کریم کے درس کا سلسلہ جاری کیا ہوا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت سے تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی، جس نے علم تفسیر کو محفوظ رکھنے کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں سے ان چند حضرات کا مختصر تعارف درج ذیل ہے، جن کا حوالہ کتب تفسیر میں بہ کثرت آتا ہے،

(۱) حضرت مجاہدؒ | ان کا پورا نام ابو الجراح مجاہد بن جبر الخزدومیؒ ہے (ولادت ۲۱۱ھ وفات ۳۰۸ھ)۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں، جن سے انھوں نے تیس مرتبہ قرآن کریم کا دور کیا ہے، اور تین مرتبہ تفسیر پڑھی ہے، قتادہؒ ان کے باپے میں کہتے ہیں کہ

اعلم من بقى بالتفسير مجاهد

”تفسیر کے جو علماء باقی ہیں ان میں مجاہدؒ سب سے بڑے عالم ہیں“

۱۔ الاتقان، ص ۱۸۹ ج ۲

۲۔ ان کے والد کا صحیح نام جبر (بروزن نصر) ہے، اور بعض حضرات جبر (بروزن زبیر) بھی کہتے

ہیں، (تہذیب الاسماء واللغات للنزوی ص ۲۵۸۳)

۳۔ تہذیب التہذیب، ص ۲۳ ج ۱۰،

اور حسیف کا قول ہے :-

اعلمہم بالتفسیر مجاہد

مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں "

کہا جاتا ہے کہ اُن کی تفسیر کا ایک مجموعہ مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے،
حضرت مجاہد اگرچہ تابعین میں سے ہیں، لیکن صحابہ کرامؓ بھی اُن کی قدر
کرتے تھے، حضرت مجاہدؓ خود فرماتے ہیں :-

صحبت ابن عمروانی اری ان اخذ منہ فکان هو

یخذ منیؓ

"میں حضرت ابن عمروؓ کی صحبت میں رہا، اور میں اُن کی خدمت

کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ میری خدمت کرتے تھے"

چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ اُن کی رکاب پکڑ کر فرمایا :-

"کاش کہ میرا بیٹا سالم اور میرا غلام نافع حافظہ میں

تم جیسے ہو جائیں"

حضرت مجاہدؓ کی وفات ۳۳ھ میں سجدہ کی حالت میں ہوئی، (البدایۃ والنہایۃ

لابن کثیرؒ، ص ۲۲۴ ج ۹)

(۲) حضرت سعید بن جبیرؓ | مشہور تابعی ہیں، اور انہوں نے حضرت عبداللہؓ

بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت انسؓ،

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ، حضرت ابوسعود البدریؓ جیسے صحابہ سے استفادہ کیا ہے،

۱۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص ۸۶ ج ۱ ترجمہ ۸۳

۲۔ تاریخ التفسیر از عبدالصمد ص ۸، مطبوعہ دہلی ۱۳۵۵ھ

۳۔ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم، ص ۲۸۵ و ۲۸۶ ج ۳

۴۔ تہذیب الاسماء واللغات للنوویؒ ص ۲۱۶ ج ۱

عبادت اور زہد میں معروف ہیں، رات کو نماز میں کثرت سے رونے کی بنا پر انکی بیانی میں نقص آ گیا تھا، حجاج بن یوسف سلاطہ میں شہید کیا، جس کا واقعہ معروف ہے، انھوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر ایک تفسیر لکھی تھی، خلیفہ نے اس کو شاہی خزانہ میں محفوظ کر دیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد یہ تفسیر حضرت عطاء بن دینار (متوفی ۴۱۲ھ) کے ہاتھ آ گئی، چنانچہ وہ اس نسخہ کی بنا پر اس تفسیر کی روایات کو حضرت سعید بن جبیر سے مرسل روایت کیا کرتے تھے، لہذا عطاء بن دینار سے حضرت سعید بن جبیر کی جو روایات منقول ہیں وہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق ”وجاہہ“ ہیں، اور زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں،

حضرت سعید بن جبیر کی بہت سی روایات مرسل ہیں، یعنی ان میں صحابی کا واسطہ مخدوف ہے، لیکن ان کی مراسیل قابل اعتماد ہیں، حضرت یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ:-

”سعید بن جبیر کی مراسلات مجھے عطاء اور مجاہد کی مراسیل سے زیادہ پسند ہیں“

(۳) حضرت عکرمہ ^{رضی} | یہ عکرمہ مونی ابن عباس کے نام سے مشہور ہیں، یہ بربری غلام تھے حصین بن ابی الحر العنبری نے انھیں بطور ہدیہ حضرت ابن عباسؓ کو پیش کیا تھا، حضرت ابن عباسؓ نے ان کو انتہائی محنت سے تعلیم دی، اور انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت حسن بن علیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت معاویہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے بھی روایات نقل کی ہیں،

۱۵ حلیۃ الاولیاء، ص ۲۷۲ ج ۲ ترجمہ ۲۷۵

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ج ۲ ترجمہ عطاء بن دینار،

۱۷ ایضاً، ص ۱۴ ج ۲ ترجمہ سعید بن جبیرؓ،

۱۸ تہذیب التہذیب ص ۲۶۳ ج ۲،

عکرمہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال طلب علم میں گزارے ہیں، چنانچہ انھوں نے مصر، شام، عراق، اور افریقہ تک کے سفر کئے ہیں، امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارے زمانے میں کتاب اللہ کا کوئی عالم عکرمہؒ سے بڑا باقی نہیں رہا، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ”تابعین میں چار آدمی سب سے زیادہ عالم تھے، عطاء، سعید بن جبیر، عکرمہؒ اور حسن بصریؒ“

بعض محدثین نے عکرمہؒ پر کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں، مشہور مستشرق گولڈزیہر نے اپنی اعتراضات

عکرمہؒ پر اعتراضات کی حقیقت

کو بھیا تک بنا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے یہ مشہور شاگرد بھی تفسیری روایات کے مقابلے میں ناقابل اعتماد ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ محقق علماء نے ان اعتراضات کو پوری تحقیق و تفتیش کے بعد رد کیا ہے، اس مسئلہ پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ فتح الباری میں نہایت مبسوط اور کافی و شافی بحث کی ہے، انھوں نے ہی یہ بھی بتایا ہے کہ متعدد ائمہ حدیث نے عکرمہؒ کے حالات کی تحقیق پر اور ان پر عائد کئے جانے والے اعتراضات کی تفتیش کے لئے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں حافظ ابن حجر یرطبریؒ، امام محمد بن نصر مروزیؒ، ابو عبد اللہ بن مندہ، ابو حاتم بن حبانؒ، اور ابو عمر بن عبد البرؒ جیسے حضرات شامل ہیں، اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے بتایا ہے کہ عکرمہؒ پر جو اعتراضات وارد کیے جا چکے ہیں

۱ تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص ۹۰ ج ۱

۲ البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ص ۲۳۵ ج ۹

۳ تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ ج ۶، ومفتاح السعاده، ص ۴۱۰ ج ۱

۴ تہذیب التہذیب، حوالہ بالا،

۵ دیکھئے مذاہب تفسیر الاسلامی از گولڈزیہر ترجمہ عربی ڈاکٹر عبد الحلیم البخاری، ص ۹۵،

۶ ہذی الساری (مقدمہ فتح الباری) للعاظ ابن حجرؒ، ص ۱۹۲ ج ۲ فصل ۹ حرف العین،

اُن کا دار و مدار تین اعتراضات پر رہی، ایک یہ کہ انھوں بعض غلط باتیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کر دی ہیں، دوسرے یہ کہ وہ عقیدۂ خارجی تھے، اور تیسرے یہ کہ وہ امر اور حکام سے انعامات وصول کر لیتے تھے،

جہاں تک اس تیسرے الزام کا تعلق ہے کہ انھوں نے امر سے انعامات وصول کئے ہیں سو ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بناء پر اُن کی روایات کو رد کر دیا جائے، رہے باقی دو اعتراضات، سو حافظ ابن حجر نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اُن میں سے کوئی الزام اُن پر ثابت نہیں ہوا، اس سلسلے میں جتنے قصے اُن کی طرف منسوب ہیں، حافظ ابن حجر نے ان میں سے ایک ایک کو نقل کر کے اس کی مدلل تردید یا توجیہ کی ہے، مثلاً اُن پر جھوٹ کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کا منشاء ایک غلط فہمی ہے، اور وہ یہ کہ بسا اوقات انھوں نے ایک حدیث دو آدمیوں سے سنی ہوتی تھی، ایک موقع پر وہ ایک شخص سے روایت کرتے، پھر کوئی اُسی حدیث کے بارے میں پوچھتا تو دوسرا آدمی سے روایت کر دیتے، اس سے بعض لوگ یہ سمجھ گئے کہ یہ حدیث گھڑتے ہیں، حالانکہ دونوں مرتبہ اُن کی روایت درست تھی، چنانچہ خود انھوں نے فرمایا ہے کہ :-

أُرِيتَ هُوَ لَاءَ الَّذِينَ يَكْذِبُونَ مِنْ خَلْفِي، اَفَلَا

يَكْذِبُونَ فِي وَجْهِ؟

”بھلا یہ لوگ جو میرے پیچھے پیچھے میری تکذیب کرتے ہیں میرے سامنے

کیوں تکذیب نہیں کرتے؟“

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ میرے سامنے تکذیب کریں تو میں اُن کو حقیقت حال سے آگاہ کر دوں،

اسی طرح اُن پر خارجی ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ وہ کسی قابل اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہوا، البتہ ہوا یہ ہے کہ انھوں نے بعض جزوی (فہمی) مسائل میں ایسا مسلک اختیار کیا تھا جو خارجیوں کے مطابق

تھا، اس سے بعض لوگوں نے انھیں خارجیت کی طرف منسوب کر دیا، چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں:

عكرمة مولى ابن عباس رضى الله عنهما مكي تابعي

ثقة بريء مما يرميه به الناس به من الحرورية،

”عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ ہیں، مکہ کے رہنے والے ہیں، ثقہ

تابعی ہیں، اور لوگ اُن پر خارجیت کا جو الزام لگاتے ہیں اسے سبری ہیں“

اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

اگر وہ شخص جس کی طرف غلط مذہب منسوب کر دیا گیا ہو اس نسبت

کی وجہ سے ساقط العداۃ قرار دیا جانے لگے تو اکثر محدثین کو چھوڑنا چاہیے

کیونکہ اُن میں سے تقریباً ہر ایک کی طرف ایسی باتیں منسوب ہیں جنہیں وہ

پسند نہیں کرتے“

یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام ائمہ حدیث نے اُن سے روایات لی ہیں، امام بخاریؒ

جو فقہ رجال کے معاملے میں بہت سخت ہیں، اور جنہوں نے مشتبہ روایوں تک کو چھوڑ دیا

ہے انہوں نے بھی اپنی صحیح میں اُن کی روایات نقل کی ہیں، امام مسلمؒ کی طرف منسوب ہے

کہ وہ عکرمہؒ پر طعن کرتے تھے، لیکن انہوں نے بھی اپنی صحیح میں عکرمہؒ کی روایت متروک نہ

ذکر کی ہے، امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی گئی ہے کہ وہ عکرمہؒ کو ناپسند کرتے تھے،

لیکن خود انہوں نے موطا کی کتاب الحج میں عکرمہؒ کی روایت نقل کی ہے، امام محمدؒ

ابن سیرینؒ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ اُن پر طعن کرتے تھے، لیکن خالد الحذّادیؒ سے

مردی ہے کہ:

۱۵ یہ تمام اقوال حافظ ابن حجرؒ نے نقل فرمائے ہیں، تفصیل کے ملاحظہ ہو پڑھی الساری،

ص ۱۹۲ تا ۱۹۶ ج ۲ فصل نمبر ۱۹

۱۶ تاریخ الکبیر للبخاریؒ، ص ۴۹ ج ۴ ترجمہ نمبر ۲۱۸

ہر وہ حدیث جس کے بارے میں محمد بن سیرینؒ یہ کہیں کہ ثبت عن
ابن عباسؓ، یعنی ابن عباسؓ سے یہ بات ثابت ہو وہ انہوں نے
عکرمہؓ سے سنی ہوتی ہے، نام وہ اس لئے نہیں لیتے کہ وہ انھیں
ذاتی طور پر ناپسند کرتے تھے۔

غرض تحقیقی بات یہی ہے کہ عکرمہؓ کی روایات قابل قبول ہیں، اور اگر ائمہ حدیث نے
ان کی روایات بے خوف و خطر ذکر کی ہیں،

آخر میں گولڈزبرہر کے ایک اور ضمنی مغالطہ کی نشاندہی
گولڈزبرہر کا ایک مغالطہ | مناسب ہوگی، اس نے یہ قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت
عکرمہؓ کی وفات ہوئی تو ان کے جنازے میں شریک ہونے والے اتنے بھی نہیں تھے
کہ ان کا جنازہ اٹھانے کے لئے کافی ہوں، دوسری طرف اسی روز مشہور شاعر
کثیر عزیقہ کا انتقال ہوا تو اس کے جنازے میں قریشیوں کا ایک بڑا مجمع شریک تھا،
اس سے گولڈزبرہر نے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اُس زمانے میں عام مسلمانوں کے دل میں
ایک عوامی شاعر کا احترام حاملین سنت کے مقابلہ میں زیادہ تھا، اور دوسرے یہ کہ شریک
جنازہ کی اس کمی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ ایک نسلی غلام کو مرنے کے بعد بھی ایک اصل
عرب کے مقابلے میں حقیر سمجھتے تھے۔

لیکن گولڈزبرہر کی یہ خیال آفرینی اسی بغض و عناد پر مبنی ہے جو بڑے تحقیقی بات کو
قبول کر کے اس پر بے بنیاد خیالات کے محل تعمیر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی،
واقعہ یہ ہے کہ اول تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے کہ کثیر کے جنازے میں بڑا مجمع شریک
ہوا اور حضرت عکرمہؓ کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:-

واللذی نقل انہم شہدوا جنازۃ کثیر و نہ کوا عکرمہ

لم یثبت، لأن ناقله لم یستمر^۱
 اور یہ جو منقول ہے کہ لوگ کثیر کے جنازے میں تو شریک ہوئے لیکن
 عکرمہ کو چھوڑ دیا، یہ بات ثابت نہیں، اس لئے کہ یہ قصہ ایک مجہول
 شخص نے بیان کیا ہے؛

اور اگر بالفرض عکرمہ کے جنازے میں واقعہ لوگ کم شریک ہوئے ہوں تب بھی
 جن حالات میں عکرمہ کی وفات ہوئی ہے اُن کے پیش نظر یہ کچھ بعید نہیں، کیونکہ تمام
 تواریخ میں تصریح ہے کہ ایک عرصہ سے حکومت نے اُن کے خلاف گرفتاری کے احکام
 جاری کئے ہوئے تھے جن کی بنا پر وہ روپوش ہو گئے تھے، اور اسی روپوشی کی حالت
 میں ان کا انتقال ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں لوگوں کو ان کی وفات کا پورا علم
 نہ ہو سکا ہوگا، اس لئے اُن کے جنازے میں شرکت زیادہ نہ ہو سکی، اس سے یہ نتیجہ
 کون عقلمند نکال سکتا ہے کہ لوگوں کے دل میں اُن کا احترام ایک شاعر سے بھی کم تھا؟
 بلکہ صحیح تاریخوں میں تو یہ منقول ہے کہ جب لوگوں کو ان کی اور کثیر کی وفات کا علم ہوا
 تو عام لوگوں کی زبانوں پر یہ جملہ تھا کہ :-

مات أفقه الناس وأشعر الناس^۲
 آج سب بڑے فقیہ کا بھی انتقال ہو گیا اور سب سے بڑا
 شاعر کا بھی

پھر مستشرقین کا یہ انداز تحقیق بھی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ایک چھوٹے سے غیر مستند
 واقعہ کی بنیاد پر کس ڈھٹائی کیسا بڑے بڑے عمومی نتائج نکال لیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ
 عوام کے دلوں میں "حاملین سنت" کا احترام جانچنے کے لئے صرف ایک حضرت عکرمہ
 کا جنازہ ہی رہ گیا تھا؟ ان کے علاوہ جو لاکھوں "حاملین سنت" گزرے ہیں اُن کی زندگی

۱ تہذیب البتذیب، ص ۲۴۳ ج ۱،

۲ البیان والہنایۃ ص ۲۴۵ ج ۱،

اور وفات کے بے شمار واقعات سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی؟ اسی طرح غلام نسل کے علماء کے ساتھ عام لوگوں کا سلوک معلوم کرنے کے لئے بھی ایک یہی قصہ ان کو تاریخ میں مل سکتا ہے؟ حضرت عکرمہؓ کے علاوہ جو ہزار باغلام علم حاصل کرنے کے بعد شہرت و عزت کے بام عروج تک پہنچے ہیں، اور خود حضرت عکرمہؓ کو اپنی زندگی میں جو عزت و احترام نصیب ہوا ان... واقعات سے اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہیں ملتی؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی علمی کتاب میں مستشرقین کے اس قسم کے بے سرو پا الزامات کا ذکر کرتے ہوئے بھی جی مٹلاتا ہے، لیکن یہ بات اس لئے ذکر کر دی گئی کہ ان حضرات کا معیار تحقیق اور انداز فکر و نظر بھی قارئین کے سامنے آجائے جو ”تحقیق“ کے نام پر اپنے بغض و حسد کے جذبات ٹھنڈے کرنے میں مصروف ہیں،

(۴) حضرت طاؤسؓ ان کا پورا نام ابو عبد الرحمن طاؤس بن کیسان الحیرمی الجندی ہے، یہ یمن کے شہر جند کے باشندے تھے، اور یہ بھی غلام تھے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت زید بن ارتمؓ، اور دوسرے متعدد صحابہؓ سے علم حاصل کیا تھا، لیکن حضرت عائشہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور خلفائے راشدینؓ سے ان کی روایات مرسل ہیں، یہ اپنے زمانے میں علم و فضل کے علاوہ عبادت و زہد میں بھی بہت مشہور تھے، انھوں نے چالیس حج کئے ہیں، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ”اگر تم طاؤسؓ کو دیکھتے تو یقین کر لیتے کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے“ عمر بن دینارؓ کا قول ہے کہ ”میں نے لوگوں کے مال و دولت کے معاملے میں طاؤسؓ سے زیادہ سیر حشیم کوئی نہیں دیکھا“

۱۔ خود حضرت طاؤسؓ کے جنازے کا حال آگے آرہا ہے، نیز آگے جن ”حاطین سنت“ کے حالات آرہے ہیں، ان میں سے بیشتر غلام تھے،
۲۔ یہاں تک کے تمام اقوال تہذیب التہذیب، ص ۹۰ و ۹۱ سے ماخوذ ہیں،

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: "اُن کی جلالتِ قدر اُن کی فضیلت، وفورِ علم، صلاح و تقویٰ، قوتِ حافظہ، اور احتیاطِ پر علماء کا اتفاق ہے" حافظ ابو نعیم اصفہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء میں اُن کے صلاح و تقویٰ کے واقعات اور موقوفات تفصیل سے ذکر کئے ہیں، مشعلہ میں منی یا مزدلفہ میں اُن کی وفات ہوئی، جنازے میں ارکانِ حکومت سے لے کر علماء و صلحاء تک ہر طبقے کے افراد شریک تھے، یہاں تک کہ ہجوم کی وجہ سے خلیفہ کو پولیس بھیجنی پڑی، حضرت عبداللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالبؑ نے ان کا جنازہ مسلسل اپنے کاندھے پر اٹھائے رکھا، یہاں تک کہ اُن کی ٹوپی گر گئی اور چادر پھٹ گئی، ۵۔ حضرت عطاء بن ابی رباح [تابعین کے دور میں عطاء نام کے چار بزرگ بہت مشہور ہیں، عطاء بن ابی رباحؒ، عطاء بن یسارؒ، عطاء بن السائبؒ، اور عطاء بن الخراسانی، ان میں سے پہلے دو با اتفاق ثقہ ہیں، اور آخری دو کے بارے میں کچھ کلام ہوا ہے، لیکن دینی علوم کی کتابوں میں صرف عطاء لکھا جاتا ہے تو عموماً عطاء بن ابی رباح ہی مراد ہوتے ہیں، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کا پورا نام ابو محمد عطاء بن ابی رباح المکی القریشی ہے، یہ ابن خلیثم القریشی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ولادت ہوئی، اور مکہ میں وفات پائی، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیرؒ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہؓ و تابعینؓ سے علم حاصل کیا، اور خاص طور پر علمِ فقہ میں بہت مشہور ہوئے، کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانے میں مناسک حج کے سب سے بڑے عالم تھے، عبادت و زہد میں نہایت معروف تھے، ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ "بیس سال تک مسجد کافرش اُن کا بستر رہا" محمد بن عبداللہ الدیباجؒ کہتے ہیں کہ "میں نے کوئی مفتی عطاءؒ سے بہتر نہیں دیکھا،

۱۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۵۱ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۶۹،

۲۔ حلیۃ الاولیاء، ص ۳۳ ج ۳ ترجمہ نمبر ۲۴۹،

۳۔ تہذیب الاسماء، ص ۳۳۳ و ۳۳۴ ج ۱ ترجمہ نمبر ۴۰۹،

اُن کی مجلس مسلسل ذکر اللہ سے معمور رہتی تھی، جس کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں تھا، اسی دوران
اُن سے (فقہی) سوال کیا جاتا تو بہترین جواب دیتے تھے

البتہ حضرت عطار بن ابی رباح و جن صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں اُن سب سے
اُن کا سماع ثابت نہیں ہے، یہاں تک کہ حضرت ابن عمرؓ جن سے وہ بکثرت روایات
نقل کرتے ہیں اُن سے بھی اُن کا بلا واسطہ سماع نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابوسعید
خدریؓ، حضرت زید بن خالدؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت اُم ہانیؓ، حضرت ام کرزہؓ،
حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت اُسامہؓ، حضرت جمیر بن مطعمؓ، حضرت ابوالدرداءؓ
اور حضرت فضل بن عباسؓ سے بھی انھوں نے بلا واسطہ روایات نہیں سنیں، لہذا
ان تمام حضرات سے اُن کی بلا واسطہ روایتیں مرسل ہیں، اور امام احمدؒ وغیرہ اُن کی
مراسل کو "اصنعف المراسیل" (سب کمزور مراسیل) کہتے ہیں، کیونکہ وہ ہر کس و ناکس
سے روایات لیتے تھے

(۶) حضرت سعید بن المسیبؓ | آپ کا پورا نام سعید بن المسیبؓ بن حزن لغت شری
المخزومی ہے، آپ حضرت ابوہریرہؓ کے داماد تھے، اس لئے حضرت ابوہریرہؓ کی
بہت سی روایات آپ ہی سے مروی ہیں، عبادت و زہد کا حال یہ تھا کہ چالیس
سال تک کوئی اذان ایسی نہیں ہوئی جو انھوں نے مسجد میں نہ سنی ہو، سلسل
روزے رکھتے تھے، اور عمر میں چالیس مرتبہ حج کیا ہے، کبھی کسی امیر کا کوئی انعام

لہ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۹۲ ج ۱ | تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ج ۷
تہذیب التہذیب میں یا پھر زہرا و زید دونوں پڑھے جاسکتے ہیں، زہر کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں، لیکن
مروی ہے کہ حضرت سعید خود یا پھر زہر پڑھنا پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ اہل مدینہ میں عام رواج زہر
کے ساتھ پڑھنے کا تھا، (تہذیب الاسماء للنووی، ص ۲۱۹ ج ۱)
تہذیب التہذیب ص ۸۷ ج ۲،

قبول نہیں کیا، گذر برسریل وغیرہ کی تجارت پر تھی، امام مالک نے ان کا قول روایت کیا ہے کہ ”میں بعض اوقات صرف ایک حدیث کی طلب میں کئی کئی دن راسفہر کیا کرتا تھا، آپ کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے تیسرے سال ہوئی، اس لئے آپ نے بہت سے صحابہ کرام سے احادیث سنی ہیں، جن حضرات صحابہؓ سے انھوں نے براہ راست احادیث نہیں سنیں ان کو یہ بکثرت بلا واسطہ (مرسل) روایت کرتے ہیں، لیکن ان کی مراسیل بہت ایسے علماء کے نزدیک بھی مقبول ہیں، جو مرسل کو حجت نہیں مانتے، مثلاً امام شافعیؒ مرسل کو قابل استدلال نہیں سمجھتے، لیکن فرماتے ہیں کہ ارسال ابن المسیب عندنا حسن (ابن مسیب کی مرسل روایات ہمارے نزدیک حسن ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ثقہ راویوں ہی سے روایات نقل کرتے تھے، غیر ثقہ راویوں کی روایات بیان نہیں فرماتے تھے۔^۱

لیکن امام نوویؒ نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے، کہ شافعیہ کے نزدیک ان کی مراسیل علی الاطلاق قابل قبول ہیں، اس کے بجائے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان کی مراسلات کا حکم بھی وہی ہے جو دروس کبار تابعین کی مراسلات کا ہے، یعنی اگر کسی مسند روایت سے یا کسی اور مرسل سے یا بعض صحابہ کے اقوال سے یا صحابہ کے بعد اکثر فقہاء کے اقوال سے اس کی تائید ہو جائے تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں،^۲ بہر کیف یہ گفتگو امام شافعی کے مسلک پر ہے، حنفیہ کے نزدیک ان کی مراسیل علی الاطلاق قابل اعتماد ہیں، آپ کی سن وفات کے بارے میں ۱۳۵ھ سے لیکر ۱۳۸ھ تک مختلف اقوال ہیں،

(۷) محمد بن سیرین | آپ کا پورا نام ابو بکر محمد بن سیرین ہے، آپ کے والد سیرین

۱۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۵۱ و ۵۲ ج ۱،

۲۔ تہذیب التہذیب، ص ۸۵ تا ۸۷ ج ۴،

۳۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۲۱ ج ۱ و مقدمۃ المجموع شرح المہذب، ص ۱۰۰ ج ۱ مطبعۃ القاہرہ

حضرت انسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ صفیہؓ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ کینز تھیں، جب یہ حضرت ابوبکرؓ کی ملکیت میں آئیں تو تین ازواجِ مطہرات نے ان کو خوشبو لگائی، اور اس تقریب میں اٹھارہ بدری صحابہؓ شریک ہوئے، جن میں حضرت ابی بن کعبؓ بھی شریک تھے، جنھوں نے دعاء کرائی اور باقی صحابہ نے آمین کہی، حضرت سیرینؓ کی اولاد میں چھ افراد محمد، معبد، انس، یحییٰ، حفصہ اور کریمہ معروف ہیں، اور چچہ کے چچہ حدیث کے ثقہ راوی ہیں، ان میں سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر صاحبزادے حضرت محمد بن سیرینؓ ہیں، جن کے عجیب و غریب حالات مستنقل تصنیف چاہتے ہیں، آپ کا درع و تقویٰ ضرب المثل ہے، حضرت ہشام بن حسانؓ کہتے ہیں کہ ”ہم ابن سیرین کے گھر میں مقیم رہے تو ہم دن کے وقت ان کے ہنسنے کی آوازیں سنتے تھے (کیونکہ آپ شگفتہ مزاج اور ظریف بزرگ تھے) اور رات کے وقت ان کے رونے کی“ ورع و تقویٰ ہی کی بنا پر آپ قید بند کی صعوبتیں بھی اٹھاتے تھے، اسی گرفتاری کے دوران قید خانے کے دربان نے ان کو پیش کش کی، کہ آپ روزانہ رات کو اپنے گھر چلے جایا کریں اور صبح کو واپس آجایا کریں! لیکن انھوں نے جواب دیا: نہیں! خدا کی قسم! میں سلطان کی خیانت پر تمھاری اعانت نہیں کروں گا!

اسی گرفتاری کے دوران مشہور صحابی اور ان کے والد کے آقا حضرت انسؓ کا انتقال ہو گیا، انھوں نے وصیت کی تھی کہ محمد بن سیرینؓ مجھے غسل دیں، لوگ ان کے پاس آئے اور اس وصیت کا ذکر کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ ”میں قید میں ہوں“ لوگوں نے کہا کہ: ہم نے امیر سے اجازت لے لی ہے، حضرت محمد بن سیرینؓ نے جواب دیا کہ ”مجھے قید کرنے والا امیر نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس کا حق مجھ پر واجب ہے“ چنانچہ لوگوں نے اس شخص سے اجازت لی، تب انھوں نے جا کر حضرت انسؓ کو غسل دیا،

۱۷ یہاں تک کے تمام حالات تہذیب الاسماء واللغات ص ۸۳ و ۸۴ سے ماخوذ ہیں،

۱۸ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم ص ۲۶۷ ج ۲،

بہر حال! حضرت محمد بن سیرینؒ مسلم طور پر تفسیر، حدیث اور فقہ کے امام ہیں، صحابہؓ میں سے حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے ان کا سماع ثابت ہے، جن صحابہؓ سے ان کا سماع نہیں ہے ان سے بھی یہ بلا واسطہ (در سلا) روایت کرتے ہیں، لیکن انکی مراسیل بہت سے وہ حضرات بھی قبول کرتے ہیں جو مرسل کو حجت نہیں مانتے ہمثلاً علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

ومحمد بن سيرين من اوسع الناس في منطقه
مراسيلته من اصح المراسيل
محمد بن سيرينؒ اپنی گفتگو میں محتاط ترین انسان ہیں اور ان کی
مراسیل صحیح ترین مراسیل میں سے ہیں۔

آپ کی وفات بصرہ میں ۹ شوال ۱۱۸ھ کو ہوئی،

(۸) حضرت زید بن اسلمؓ | ان کا پورا نام ابو عبداللہ زید بن اسلم لغوی (متوفی ۱۱۶ھ) ہے، یہ مدینہ طیبہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، انھوں نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہ سے روایات نقل کی ہیں، یہ علم تفسیر کے بڑے عالم تھے، اور باتفاق ثقہ ہیں، مسجد نبویؐ میں ان کا حلقہ درس ہوتا تھا، اور ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ان کے صاحبزادے عبدالرحمنؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد کبھی مجھے اپنے کسی شاگرد کے پاس بھیجتے تو وہ میرے سر کو بوسہ دے کر فرماتے: "خدا کی قسم! تمھارے والد! ہمیں اپنے اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہیں، اور اگر ہمیں یہ خبر دی جائے کہ یا ہمارے اہل و عیال کو موت آئے گی یا زید بن اسلمؓ کو اور ہمیں یہ اختیار ملے کہ جس کی موت کو چاہیں ختم یا کر لیں تو ہماری خواہش یہ ہوگی کہ زید بن اسلمؓ زندہ رہیں"

حضرت ابو حازمؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت زید بن اسلمؓ کی مجلس میں چالیس فقہار کی کے ساتھ رہتے تھے، ہم سب کی ادنیٰ اخصلت یہ تھی کہ اپنی املاک سے ایک دوسرے کی عفواری کرتے تھے اور اس مجلس میں مجھ کو کبھی دو آدمی بھی ایسے نظر نہیں آئے جو کسی بے فائدہ گفتگو پر بحث یا جھگڑا کر رہے ہوں،

حضرت زید بن اسلمؓ کو عموماً ثقہ قرار دیا گیا ہے، البتہ عبید اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: مجھے ان میں کسی حسرابی کا علم نہیں، البتہ وہ قرآن کریم کی تفسیر بکثرت اپنی رائے سے کرتے ہیں، اور سفیان بن عیینہؒ کا قول ہے کہ: "زید بن اسلمؓ صالح آدمی تھے، لیکن ان کے حافظہ میں کچھ نقص تھا" (تہذیب التہذیب) ان دو حضرات کے علاوہ کسی اور سے ان پر جرح نظر سے نہیں گزری،

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن اسلمؓ کی ایک تفسیر تھی جسے ان کے صاحبزادے عبدالرحمن بن زید بن اسلمؓ روایت کرتے تھے، لیکن واضح رہے کہ عبدالرحمن بن زید بن اسلمؓ اپنے صلاح و تقویٰ کے باوجود ضعیف ہیں، اور اکثر محدثین نے ان کی روایات کو ناقابل اعتبار کہا ہے، لہذا حضرت زید بن اسلمؓ کی جو تفسیری روایات ان کے صاحبزادے عبدالرحمن سے مروی ہیں وہ پوری طرح قابل اعتماد نہیں ہیں، ان کے صاحبزادے کا حال آگے آ رہا ہے،

(۹) حضرت ابو العالیہؒ ان کا پورا نام ابو العارِجِ (بروزن زبیر بن ہرمان الریاحی) ہے یہ بصرہ کے باشندے ہیں، زمانہ جاہلیت میں پیدا ہو چکے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سال بعد مسلمان ہوئے، حضرت ابو بکرؓ سے ملاقات کی ہے، اور صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ،

۱۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۰۰ ج ۱،

۲۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۵ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۳،

۳۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۱۷۸ و ۱۷۹،

حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰؓ، حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، قرآن کریم کے بہترین قاری تھے، یہ بھی بنی رباح کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، لیکن حضرت ابن عباسؓ ان کو اپنے ساتھ چار پائی پر بٹھاتے تھے، جبکہ دوسرے قریشی لوگ نیچے بیٹھے ہوتے، اور فرماتے تھے: "علم اسی طرح انسان کے شرف میں اضافہ کرتا ہے" ان کے ثقہ ہونے پر علماء کا اتفاق ہے، ^۳ سلمہ میں وفات ہوئی، ^۴ تھہ ماوراء النہر کے علاقہ میں سب سے پہلے اذان دینے والے یہی تھے،

۱۱) حضرت عروہ بن الزبیرؓ آپ حضرت زبیر بن عوامؓ کے صاحبزادے ہیں، مدینہ طیبہ کے مشہور فقہار سب سے ہیں، حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں، اس لئے حضرت عائشہؓ سے انھوں نے بہت سی احادیث روایت کی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں ان کو سب سے زیادہ ثقہ قرار دیا گیا ہے، ان کی جلالتِ قدر، علم و فضل، اور وثاقت پر اجماع ہے، ان کے صاحبزادے ہشامؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ روزے رکھتے تھے، اور روزے ہی کی حالت میں (سکھ میں) وفات پائی،

ابن شوذبؓ کہتے ہیں کہ عروہؓ ہر روز چوتھائی قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اور رات کو تہجد میں بھی قرآن پڑھتے تھے، یہ معمول ساری عمر میں صرف اُس رات قضا ہوا جس رات میں آپ کی ٹانگ (ایک بیماری کی وجہ سے) کاٹی گئی،

۱۲) حضرت حسن بصریؓ آپ کا پورا نام ابو سعید الحسن بن ابی الحسن بیسار بصریؓ ہے،

۱۰ تہذیب الاسماء، ص ۲۵۱ ج ۲،

۱۱ تذکرۃ الحفاظ، ص ۵۸ ج ۱ ترجمہ نمبر ۵۰،

۱۲ تہذیب التہذیب ص ۲۸۴ ج ۳،

۱۳ حلیۃ الاولیاء ص ۲۲۱ ج ۲،

۱۴ تہذیب الاسماء، ص ۳۳۱ و ۳۳۲ ج ۳ ترجمہ نمبر ۴۰،

۱۵ تذکرۃ الحفاظ ص ۵۹ ج ۱ ترجمہ ۵۱،

آپ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے (اور بعض حضرات کے قول کے مطابق جمیل بن قطبہ کے) آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز تھیں، چنانچہ کبھی کبھی آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا دودھ بھی پیا ہے، آپ کی ولادت حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال پہلے ہوئی، اور آپ نے بہت سے صحابہؓ کی زیارت بھی کی اور ان سے علم بھی حاصل کیا، علم و فضل کے اعتبار سے آپ کی جلالت قدر مسلم ہے، اور آپ کی عبادت و زہد اور پُر حکمت ملفوظات مشہور ہیں، اس کے ساتھ ہی آپ نہایت بہادر مجاہد بھی تھے، متعدد جنگوں میں شریک ہوئے، اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں خراسان کے گورنر ریح بن زیاد کے کاتب بھی رہے ہیں،

آپ نے بہت سی احادیث مرسلہ روایت کی ہیں، (یعنی جن صحابی سے آپ نے وہ حدیث سنی تھی ان کا واسطہ ذکر نہیں کیا) ایسی احادیث کے بارے میں محدثین کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے، کہ وہ قابل قبول ہیں یا نہیں، بعض حضرات انھیں قبول کرتے ہیں اور بعض حضرات انھیں ضعیف قرار دیتے ہیں، امام ابن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ "حسن کی مرسلات اگر فقہ راویوں سے مروی ہوں تو وہ صحیح ہیں اور بہت کم ساقط الاعتبار ہیں" اور امام ابو زرعہؒ کا قول ہے کہ "وہ تمام احادیث جو حسن بصرہؓ نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر (بلا واسطہ) روایت کی ہیں میں نے تحقیق سے اُن کو ثابت پایا، سوائے چار احادیث کے (جن کی بنیاد مجھے نہیں ملی) لیکن امام احمد بن حنبلہؒ نے اُن کی اور حضرت عطاء کی مراسیل کو "اضعت المراسیل" (مکروزرین مراسیل) کہا ہے، آپ کی وفات ۳۸ھ میں ہوئی،

(۱۲) حضرت قتادہؓ آپ کا پورا نام ابو الخطاب قتادہ بن دعامہ (بکسر اللام)

۱۵ تہذیب الاسماء ص ۱۶۱ ج ۱ ترجمہ نمبر ۱۲۲،

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ ج ۳ ترجمہ عطاء بن ابی رباح ابن المدینیؒ اور ابو زرعہؒ کے اقوال نیز اس مسئلہ پر مفصل بحث کیلئے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ تا ۲۷۰ ج ۲،

اسد سی البصری ہی، آپ مادر زاد نابینا تھے، اس کے باوجود قوت حافظہ کا عالم یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں: "میں نے کبھی کسی محدث سے حدیث کو دوبارہ سنانے کی فرمائش نہیں کی، اور میرے کانوں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جسے میرے دل نے یاد نہ کر لیا ہو" نیز فرماتے ہیں "قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں میں نے کچھ نہ کچھ (یعنی کوئی نہ کوئی روایت) سُن نہ رکھی ہو" امام احمد فرماتے ہیں کہ "قتادہ تفسیر کے زیادہ بڑے عالم ہیں، اس کے علاوہ اُن کو عربی لغت و ادب اور تاریخ و انساب میں بھی بڑا درک حاصل تھا، البتہ محدثین نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات روایات میں تدلیس کیا کرتے تھے، آپ کا انتقال ۳۸ھ میں طاعون کی وبا سے شہر واسط میں ہوا، (۱۳) محمد بن کعب قرظی | آپ کا نام محمد بن کعب بن سلیم بن اسد القرظی ہے، کنیت ابو حمزہ یا ابو عبد اللہ ہے، آپ کے والد بنو قریظہ میں سے تھے، اور غزوة بنو قریظہ کے وقت نابالغ ہونے کی بنا پر پراختیاب امان دی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد بن کعب قرظی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں پیدا ہو چکے تھے، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت براہ بن عازب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، حضرت میسرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ سے روایات نقل کی ہیں، امام ابن سعد فرماتے ہیں "ثقة اور کثیر الحدیث عالم تھے" امام علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "ثقة اور صالح ہیں اور قرآن کریم کے عالم ہیں" عون بن عبداللہ کہتے ہیں کہ: میں نے تفسیر قرآن کا اُن سے بڑا عالم نہیں دیکھا، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ: ان کے ثقة ہونے پر اتفاق ہے۔"

آپ شروع میں کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، بعد میں پھر مدینہ طیبہ واپس آ گئے،

۱۷ یہ تمام بابیں تذکرۃ الحفاظ ص ۱۵ تا ۱۱ طبقہ نمبر ۴ ترجمہ نمبر ۱۲ سے ماخوذ ہیں،

سنہ ۱۱۴۱ھ اور سنہ ۱۱۴۲ھ کے درمیان وفات پائی،

(۱۴) **حضرت علقمہؓ** آپ کا پورا نام ابو ثبیل علقمہ بن قیس بن عبداللہ نخعی ہے، آپ کو فہ کے باشندے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی پیدا ہو چکے تھے، یوں تو آپ نے بہت سے صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں، لیکن آپ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد تھے، یہاں تک کہ صورت و سیرت میں بھی اُن سے مشابہ تھے، اس لئے حضرت ابن مسعودؓ کی روایات کے معاملہ میں آپ پر اور حضرت اسودؓ پر بطور خاص اعتماد کیا جاتا ہے، ہنایت خوش الحان قاری تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ آپ کو بلا کر آپ سے قرآن کریم سُنا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک رات میں آپ نے پورا قرآن ختم کر لیا، با تفاق ثقفہ ہیں، اور خاص طور سے علم فقہ میں آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ کی وفات کے بارے میں سنہ ۱۱۴۲ھ تک مختلف اقوال ملتے ہیں، آپ انتہائی متواضع بزرگ تھے، اپنے گھریلو کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور اپنا باقاعدہ حلقہ درس بنانا پسند نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ ”مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے چلیں اور ایک دوسرے کہیں کہ یہ علقمہ ہیں،“ آپ نے اپنے مکان کے علاوہ صرف ایک قرآن کریم کا نسخہ اور ایک گھوڑا اور شہ میں چھوڑا،

(۱۵) **حضرت اسودؓ** آپ کا پورا نام ابو عمرو اسود بن یزید بن قیس نخعی ہے، آپ بھی کو فہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد ہیں، حضرت علقمہؓ کے بھتیجے اور حضرت ابراہیم نخعیؓ کے ماموں ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ”آپ کی وثاقت اور جلالت قدر پر اتفاق ہے،“ عبادت و زہد میں بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ نے عمر میں اسی مرتبہ حج یا عمرے کے لئے حرمین کا سفر کیا ہے،

۱ تہذیب الاسماء، ص ۱۰۹ ج ۱،

۲ تہذیب التہذیب ص ۲۷۸ ج ۲،

۳ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم، ص ۱۰۰ ج ۲،

آپ کے صاحبزادے عبدالرحمن سات سو رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے، اس کے باوجود کہا جاتا تھا کہ وہ حضرت اسود کے گھر والوں میں (عبادت کے اندر) سب سے کم محنت کرتے ہیں!

حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ: ”حضرت اسود رمضان میں دو راتوں کے اندر قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور مغرب اور عشاء کے درمیان سوتے تھے، اور رمضان کے علاوہ چھ راتوں میں قرآن ختم کرتے تھے“ روزے اتنی کثرت سے رکھتے تھے کہ جسم نیلا پیلا ہو جاتا، حضرت علقمہ ان سے کہتے کہ ”اپنے جسم کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہو؟ تو جواب میں فرماتے کہ ”اسی جسم کی (اخروی) راحت چاہتا ہوں“ اور کبھی جواب میں فرماتے: ”ابوشبل (آخرت کا) معاملہ بڑا سنگین ہے، شہ ماہ کے لگ بھگ آپ کی وفات ہوئی،

(۱۶) مرآة الہمدانی آپ کا پورا نام ابو اسمعیل مرثد بن شراحیل الہمدانی اسکسکی الکوفی ہے، اور آپ اپنے زمانے میں ”مرثد الطیب“ اور ”مرثد الخیر“ کے القاب سے معروف تھے، یوں تو آپ محض یتیم میں سے ہیں، اس لئے بہت سے صحابہ سے روایت کرتے ہیں، مثلاً حضرت عمرو، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حذیفہ، حضرت ابو ذر وغیرہ، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود سے زیادہ علم حاصل کیا ہے، چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں حضرت ابن مسعود کی تفسیری روایات ان سے بکثرت مروی ہیں، باتفاق ثقہ ہیں آپ کی کثرت عبادت کا حال یہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں ”آپ نے اتنے سجدے کئے ہیں کہ مٹی آپ کی پیشانی کو کھا گئی تھی“ اور آپ کی یومیہ رکعات کی تعداد بعض حضرات

۱۵ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۸ ج ۱ و تہذیب الاسماء، ص ۱۲۲ ج ۱،

۱۶ حلیۃ الاولیاء ص ۱۰۳ و ۱۰۴ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۶۵

۱۷ محضرمین ان حضرات کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا، لیکن زیارت نہیں کی،

پانچ سو اور بعض نے چھ سو بتائی ہے، حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں: ”آپ تفسیر میں صاحب بصیرت تھے، تقریباً سرفسہ میں وفات پائی۔“ لیکن واضح رہے کہ کتب تفسیر میں آپ کی تفاسیر بکثرت سدی سے مروی ہیں، جن کا حال ”ضعف“ کے عنوان کے تحت آگے آرہا ہے،

۱۴۔ حضرت نافعؓ؟ آپ کا پورا نام ابو عبد اللہ نافع بن ہرثمہ ہے، اور بعض حضرات نافع بن کاؤس بتایا ہے، آپ نیشاپور کے باشندے اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ جلیل القدر تابعی ہیں، آپ نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابولبابہؓ، حضرت نافع بن خدیجؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے علم حاصل کیا، حضرت ابن عمرؓ کے شاگردوں میں دو حضرات کو سب سے زیادہ قابل اعتماد قرار دیا گیا ہے، ایک حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے سالم بن عبد اللہ اور دوسرے ان کے غلام نافعؓ، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ”ان کی جلالت قدر اور توثیق پر اجماع ہے“، اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ”تمام اسانید میں سب سے زیادہ صحیح سند ملاحظہ عن نافع عن ابن عمرؓ ہے“، خود حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ”لقد من الله تعا علينا بنافع“، اللہ تعالیٰ نے نافعؓ کے ذریعہ ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ”لا يعرف له خطأ في جميع ما رواه“، ”جتنی احادیث انھوں نے روایت کی ہیں ان میں کوئی غلطی دریافت نہیں ہوئی“، امام مالکؒ حضرت نافعؓ کے خاص شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آپ بہت متواضع بزرگ تھے، عموماً ایک سیاہ چادر اوڑھتے تھے اور بہت کم گفتگو کرتے تھے، حضرت نافعؓ خود فرماتے ہیں کہ ”میں نے حضرت ابن عمرؓ کی تیس سال خدمت کی، اس کے بعد ابن عمرؓ نے انھیں پیشکش کی کہ وہ مجھے تیس ہزار درہم میں ان کے ہاتھ فروخت کر دیں، حضرت ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا مجھے خطرہ ہے

۱۴ تہذیب التہذیب، ص ۸۸ ج ۱۰ ۱۵ تذکرۃ الحفاظ ص ۶۳ ج ۱

۱۶ تہذیب الاسماء ص ۲۳ و ۱۲۴ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۸۴،

۱۷ تہذیب التہذیب ص ۴۱۳ تا ۴۱۵ ج ۱۰

کہ کہیں ابن عامر کے درابہم مجھے فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں، جاؤ تم آزاد ہو، اللہ میں
آپ کی وفات ہوئی،

(۱۸) حضرت شعبیؓ آپ کا پورا نام ابو عمرو عامر بن بشر اہل الشبلی الحیری ہے، آپ
کوفہ کے مشہور فقہاء تابعین میں سے ہیں، تقریباً پانچ سو صحابہ کی زیارت کی ہے، حافظہ
غیر معمولی طور پر قوی تھا، کبھی عمر بھر احادیث لکھ کر یاد نہیں کیں، فرماتے تھے کہ
جو شخص مجھے کوئی بات سنا تا ہے مجھے فوراً یاد ہو جاتی ہے، انہی کا قول ہے کہ ”مجھے سب
کم جو چیز یاد ہو وہ اشعار ہیں، اس کے باوجود اگر میں چاہوں تو ہمینہ بھر تک شعر سنانا
رموں، اور کوئی شعر مکرر نہ ہو، آپ امام ابو حنیفہؒ کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور
آپ کی جلالت قدر پر اتفاق ہے، امام احمد اور امام حنفیؒ فرماتے ہیں کہ ان کی مراسیل
بھی صحیح ہیں، کیونکہ وہ صرف صحیح روایات ہی کو مسلاً روایت کرتے ہیں،

(۱۹) حضرت ابن ابی ملیکہؓ آپ کا پورا نام ابو محمد عبداللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکہ
القیسی الملکی ہے، آپ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے عہد خلافت میں مکہ مکرمہ کے قاضی اور
مسجد حرام کے مؤذن تھے، بعد میں حضرت ابن زبیرؓ نے آپ کو طائف کا قاضی بنا دیا تھا
آپ نے بہت سے صحابہؓ سے احادیث روایت کی ہیں، خود فرماتے ہیں کہ: میں نے میں
صحابہ کرام سے ملاقات کی ہے، طائف کے قیام کے دوران آپ نے حضرت ابن عباسؓ
سے بھی استفادہ کیا ہے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: کان اسامیاً فقیہاً حجة، فسیحاً
مفہماً متفہماً علی ثققتہ، خلاصہ یہ کہ آپ کی امامت اور وثاقت پر اتفاق ہے،
مسئلہ میں وفات پائی،

۵۱ تذکرۃ الحفاظ ص ۹۱۲ ج ۱

۵۲ ایضاً، ص ۴۲ تا ۸۲ ج ۱

۵۳ تہذیب التہذیب، ص ۳۰۰ ج ۵

۵۴ تذکرۃ الحفاظ، ص ۶۵ و ۶۶ ج ۱

(۲۰) حضرت ابن جریر رضی اللہ عنہما آپ کا پورا نام ابو الولید عبد الملک بن عبد العزیز بن جریر القریشی المکی ہے، آپ تبع تابعین میں سے ہیں، اور حضرت طاؤسؓ، حضرت عطاء بن ابی رباحؓ، حضرت مجاہدؓ، حضرت ابن ابی ملیکہؓ اور حضرت نافعؓ وغیرہ کے شاگرد ہیں، خاص طور سے حضرت عطاءؓ کے ساتھ سترہ سال رہے، میں، حضرت عطاءؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھا کریں، تو حضرت عطاءؓ نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”اگر یہ نوجوان زندہ رہے تو ان سے“ اسی لئے آپ کو حضرت عطاءؓ کی روایات کے معاملہ میں اشد الثابت الناس (تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد) کہا گیا ہے، آپ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے نبی علوم کے پہلے باقاعدہ مصنف ہیں، جنہوں نے علوم کی پہلی بار تدوین کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ: ”مادون العلم تدوین احدا“ مجھ سے پہلے میری طرح کسی نے علم کی تدوین نہیں کی تھی، عبادت و زہد میں بھی آپ نہایت بلند پایہ بزرگ تھے، ہینہ میں صرف تین دن روزے کے بغیر رہتے تھے، ورنہ سارے مہینے روزے رکھتے تھے۔
امام عبدالرزاقؓ فرماتے ہیں کہ: ”جب کبھی میں ابن جریرؓ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ آپ کا دل خشیت اللہ سے معمور ہے۔“

بیشتر محدثین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ بعض علماء سے آپ پر معمولی جرح و تنقید بھی مروی ہے، مثلاً امام مالکؓ سے منقول ہے کہ: ”ابن جریرؓ حاطب اللیل ہیں“ یعنی رطب و یابس ہر طرح کی روایات لے لیتے ہیں، (یعنی بن معینؓ فرماتے ہیں کہ ”وہ زہریؓ کی روایات کے معاملے میں کچھ نہیں ہیں“ یعنی ناقابل اعتبار ہیں)، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ بعض اوقات ضعیف راویوں سے تدریس کر جاتے تھے، اسی لئے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ جو روایات انہوں نے سراحۃً حدیثی یا اخباری کے الفاظ سے نقل کی ہیں

وہ تو ٹھیک ہیں، البتہ جو روایات عن کے لفظ سے نقل کی ہیں وہ مشتبہ ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی آپ قابل اعتماد راوی ہیں، چنانچہ صحاح ستہ میں آپ کی روایات بکثرت مروی ہیں؛

(۲۱) حضرت **صحاک**ؓ | آپ کا پورا نام ابو القاسم الصحاک بن مزاحم الہلالی ہے، آپ خراسان کے باشندے ہیں، صحاک کے معنی ہیں ”بہت ہنسنے والا“ اور آپ کا نام صحاک اس لئے رکھا گیا کہ آپ دو سال بطن مادر میں رہے، اور جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے دانت نکل چکے تھے، اور آپ ہنس رہے تھے، آپ صحابہؓ کے دور میں پیدا ہو چکے تھے، لیکن کسی صحابی سے آپ کا روایت کرنا مشکوک ہے، یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی آپ کی روایات صحیح قول کی بنا پر مرسل ہیں، عبد الملک بن میسرہ فرماتے ہیں کہ ”صحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے نہیں ہوئی، البتہ اسے کے مقام پر حضرت سعید بن جبیرؓ سے ملاقات ہوئی ہے، اور انہی سے انہوں نے تفسیر حاصل کی ہے، اکثر علماء نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، صرف حضرت شعبہؓ اور یحییٰ بن سعید القطانؓ ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں، لیکن اول تو یہ دونوں حضرات رجال پر جرح کرنے کے معاملہ میں دوسروں سے زیادہ متشدد ہیں، دوسرے غالباً ان کی جرح کا منشا یہی ہے کہ صحاک کی ملاقات کسی صحابی سے نہیں ہوئی، اس کے باوجود وہ صحابہؓ سے براہ راست روایت کرتے تھے، ورنہ ہذا بت خود وہ ثقہ ہی ہیں، حافظ زہبی نے ان کا تذکرہ کر کے لکھا ہے: وثقه احمد وابن معین وابوزعنا وغیرہم،

۱۵ ہندیہ التہذیب ص ۴۰۳ تا ۴۰۶ ج ۶،

۱۶ مفتاح السعادة، طاش کبریٰ زادہ ص ۴۰۴ ج ۱، والبدایۃ والنہایۃ لابن کثیرؒ،

ص ۲۲۳ ج ۱۹، احوال کتلہم ۱۶ ہندیہ التہذیب ص ۴۵۳ ج ۴،

۱۷ دیکھئے الاجوبۃ الفاضلۃ، مولانا عبدالحی لکھنویؒ، ص ۱۶۱ تا ص ۱۸۰ مطبوعہ شام،

بحقیقہ اشیح عبدالفتاح ابو زعنا،

وضعفہ یحیی القطان وشعبۃ ایضاً، وهو قوی فی التفسیر رامام احمد
 وابن معین اور ابو زرعة وغیرہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے، اور یحیی القطان اور شعبہ
 نے ان کی تضعیف کی ہے اور وہ تفسیر میں قوی ہیں، اور حافظ ابن حجر تحریر فرماتے
 ہیں، "حدوث کثیر الاثر، سال رسچے ہیں، مگر رسل روایات کثرت سے ذکر کرتے
 ہیں، یہ بات تو ہم پیچھے لکھ ہی چکے ہیں کہ حضرت ابن عباس کی جو روایات ان کے
 طریق سے آئی ہیں انہیں محدثین نے تضعیف قرار دیا ہے، البتہ خود ان کے اپنے تفسیری
 اقوال قابل قبول ہیں، ان کی وفات ۱۱۸ھ اور ۱۱۹ھ کے درمیان ہوئی ہے،

قرون اولی کے ضعفاء یا مختلف فیہ مفسرین

مذکورہ بالا حضرات تو وہ تھے جن کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے پر علماء محدثین کا
 تقریباً اتفاق رہا ہے، اور جن کا ذکر تفسیری اقوال در روایات میں کثرت آتا رہتا ہے
 ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت وہب بن منبہ، اور کعب الاحبار کا
 مفصل تذکرہ "اسرائیلیات" کے عنوان کے تحت آچکا ہے، اب تابعین اور تبع تابعین
 کے عہد کے بعض ان حضرات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جنہیں یا تو تضعیف
 قرار دیا گیا ہے یا جن کے قابل اعتماد ہونے میں قابل لحاظ اختلاف رہا ہے،
 تفسیر کی کتابوں میں "سندی" کے نام سے دو صاحب معروف ہیں،
سندی کبیر | دونوں کا تذکرہ الگ الگ مناسب ہوگا،

(۱) ابو محمد اسمعیل بن عبدالرحمن بن ابی کریمۃ السدی الکوفی (متوفی ۲۴۰ھ)
 "السدی الکبیر" کہا جاتا ہے، اور تفسیر کی کتابوں میں جب صرف "سدی" لکھا جاتا ہے

۱۵ المغنی فی الضعفاء للذہبی، ص ۳۱۲ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۹۱۲،

۱۶ تقریباً تہذیب، ص ۲۴۳ ج ۱ مطبوعہ مدینہ منورہ،

تو عموماً ہی مراد ہوتے ہیں، اُن کو "سُدی" کہنے کی وجہ یہ ہو کہ کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر ایک چبوترہ سا تھا، یہ اُس پر بیٹھ کر اوڑھنیوں کی تجارت کیا کرتے تھے، دروازے کے ایسے چبوترے کو عربی میں "سُدہ" کہتے ہیں، اس لئے ان کو سُدی کہا جانے لگا۔ اُن کو تفسیر قرآن کی درس و تدریس کا خاص ذوق تھا، چنانچہ تفسیر کی کتابیں اُن کے اقوال اور روایات سے بھری ہوئی ہیں، البتہ علم تفسیر اور روایات کے معاملہ میں یہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں، اس مسئلہ میں محققین کی آراء مختلف ہیں، بعض حضرات نے اُن کی توثیق کی ہے، مثلاً حضرت یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں: "لابأس به ما سمعت احداً یذکرہ الا بنیہ" اُن کی روایات میں کوئی حرج نہیں، میں نے جس کسی کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا، امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ "وہ ثقہ ہیں" امام ابن عدی فرماتے ہیں: "لہ احادیث دھو عندی۔ مستقیم الحدیث صدوق لابأس به"۔ میری نظر میں حدیث کے معاملے میں وہ ٹھیک ہیں، سچے ہیں، ان میں کوئی حرج نہیں، امام عجل فرماتے ہیں "ثقة عالم بالتفسیر وروایۃ لہ" (وہ تفسیر کے ثقہ عالم اور راوی ہیں)، امام نسائی انھیں صالح کہتے ہیں، امام بخاری کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں قابل اعتبار سمجھتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں کوئی جرح نقل نہیں فرمائی، بلکہ اسمعیل بن ابی خالد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "سُدی قرآن کریم کے شعبی سے زیادہ بڑے عالم ہیں" اور یحییٰ بن سعید القطان کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جو اوپر گزرا کہ "میں نے جس کسی کو اُن کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا، ان دو اقوال کو نقل فرما کر انھوں نے خود کوئی

۱۔ محدثین کے ان اقوال کا ہم نے تقریبی ترجمہ محض سہولت کے لئے کر دیا ہے، ورنہ یہ تمام فقرے اصطلاحی ہیں، اور ان کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اصول حدیث پر نظر رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں اس پورے مفہوم کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں،

جرح نہیں فرمائی، امام مسلم کے نزدیک بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث لی ہے،

اس کے برخلاف دوسرے بہت سے علماء نے ان پر جرح بھی فرمائی ہے، مثلاً امام شعبی سے کسی نے کہا کہ ان السنن ذن اعطی حظاً من، علماء اقران (سُدی کو قرآن کریم کے علم کا بڑا حصہ ملا ہے) اس کے جواب میں امام شعبی نے فرمایا ”قد اعطی حظاً من جہل بالقصران“ (ان کو قصران کریم سے جاہل ہونے کا بڑا حصہ ملا ہے) حضرت عجل بن معین انہیں ضعیف قرار دینے لگے اور فرماتے تھے ”فی حدیثہ ضعف“ (ان کی احادیث میں ضعف ہے) امام ابو زرعہ انہیں لیث (زہم) کہتے تھے، جلاوی درجہ کی توثن ہے، امام ابو حاتم فرماتے ہیں ”یکتب حدیثہ ولا یستحب بہ ران کی حدیثیں لکھی جائیں مگر ان سے استدلال درست نہیں، ساجی فرماتے ہیں ”صدوق فیہ نظر“ (سچے ہیں مگر محل نظر ہیں) امام عقیلی کا قول ہے ”ضعیف وکان ینناول الشیخین“ (ضعیف ہیں اور شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی بدگونی کرتے تھے) امام طبری کہتے ہیں ”لا یتبع بحدیثہ“ (ان کی حدیث سے استدلال درست نہیں) امام جوزجانی فرماتے ہیں ”کذاب شتام“ (وہ جھوٹے اور تبرّاز ہیں) امام فلاس نے حضرت عبدالرحمن بن مہدی کا قول نقل کیا ہے کہ ”وہ ضعیف ہیں“ اور حسین بن داؤد المرزبی کہتے ہیں کہ ”سمعت من السنن فیما قلت حتی سمعتہ یشتم ابا بکر و عمر فلم اعد الیہ“ (میں نے سُدی سے احادیث سنی ہیں، اور ان کو اس وقت چھوڑا میں نے ان کو سنا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے خلاف بدزبانی کر رہے ہیں، اس کے بعد میں ان کے پاس نہیں گیا)۔

۱۵ التاریخ الکبیر للبخاری ص ۳۶۱ قسم اجلا ترجمہ نمبر ۱۱۲۵، طبع بیروت،

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۳۱۳ و ۳۱۴ ج ۱

۱۷ میزان الاعتدال للذہبی ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ترجمہ نمبر ۹۰۷،

اُن کے بارے میں ساری بحث کا خلاصہ حافظ ابن حجر نے یہ کلام ہے کہ صدوق
 یھم ورمی بالتشیح“ (وہ سچے ہیں، مگر ان کو روایت میں دہم ہو جاتا ہے، اور ان پر
 تشیح کا بھی الزام ہے) لفظ صدوق“ محدثین کی اصطلاح میں اُس شخص کے لئے
 بولا جاتا ہے جو جھوٹا تو نہ ہو لیکن اس کا حافظہ بھی معیاری نہ ہو، لہذا ان کی صحیح
 حیثیت یہ ہے کہ قوتِ حافظہ کے اعتبار سے یہ محدثین کے معیار پر پورے نہیں اُترتے
 دوسرے اُن پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے، لیکن ان کو کذاب“ صرف امام جوہر جانی
 نے کہا ہے،

سُدّی صغیر (۲) دوسرے صاحب جو سُدّی کے نام سے مشہور ہیں محدثین مروان
 السُدّی ہیں، جو عبدالرحمن ابن زید بن الخطابؓ کے آزاد کردہ
 غلام تھے، اُن کی روایات سُدّی کبیر کے مقابلہ میں کم ہیں، اور اُن کو سُدّی کبیر سے
 ممتاز کرنے کے لئے ”السُدّی الصغیر“ کہا جاتا ہے، یہ بھی کوفہ کے باشندے ہیں، اور
 ان کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، یہ مشہور مورخ کلبی کے شاگرد ہیں
 (جن کا ذکر آگے آ رہا ہے) امام بخاری فرماتے ہیں ”لا یکتب حدیثہ البتہ،
 (ان کی احادیث ہرگز نہ لکھی جائیں) امام ابن معین کا ارشاد ہے: ”لیس بثقة“
 (وہ ثقہ نہیں) امام احمد فرماتے ہیں ”ادرکتہ وقد کبرت فترکتہ (میں نے
 اُن کو اس وقت پایا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے لہذا میں نے انھیں چھوڑ دیا) حافظ
 ذہبی اُن کے بارے میں فرماتے ہیں: ”شکوہ واقصہ بعضہم باکذب“ (محدثین
 نے انھیں چھوڑ دیا ہے، اور بعض لوگوں نے اُن پر جھوٹ کا الزام بھی لگایا ہے)۔
 اور ایک دوسرے مقام پر اُن کے بارے میں لکھتے ہیں ”واہ بمرۃ“ (انتہائی واہیات

۱۵ تزیین التہذیب ص ۷۲ ج ۱ ترجمہ نمبر ۵۳۲ طبع المدینۃ المنورۃ،

۱۶ تاریخ بغداد للخطیب، ص ۲۹۱ ج ۳،

۱۷ میزان الاعتدال ص ۳۲ و ۳۳ ج ۲ والمغنی فی الضعفاء ص ۶۳۱ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۵۹۶۶،

راوی ہیں) امام نسائی^۳ فرماتے ہیں متروک الحدیث، ابو علی صالح بن محمد کہتے ہیں
 ”کان ضعیفاً، وكان یضع الحدیث ایضاً“ (ضعیف تھے اور حدیثیں گھڑا بھی کرتے
 تھے)^۴

پچھ حضرت ابن عباس^۵ کے تذکرے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ”تنویر المقیاس فی
 تفسیر ابن عباس“ کا مروجہ نسخہ انہی سے مروی ہے، اور علامہ سیوطی نے اس کی سند
 کو ”سلسلۃ الکذب“ قرار دیا ہے، اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛

مقاتل | مقاتل نام کے بھی دو صاحب معروف ہیں، ایک ابو بسطام مقاتل بن
 حیان^۶ اور دوسرا ابو الحسن مقاتل بن سلیمان، دونوں ایک ہی شہر کے
 یعنی بلخ کے باشندے ہیں، دونوں ایک ہی زمانے کے ہیں اور ایک ہی طرح کے اساتذہ
 سے روایت کرتے ہیں، اس لئے بسا اوقات ان میں التباس ہو جاتا ہے، ان میں سے
 اول الذکر (یعنی مقاتل بن حیان) راجح قول کی بنا پر پرفقہ ہیں، اور جلیل القدر علماء
 میں سے ہیں، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ان کا حوالہ کم آتا ہے، تفسیر کی کتابوں میں جب
 صرف ”مقاتل“ لکھا جاتا ہے، تو اس سے مراد دوسرے صاحب (یعنی مقاتل بن سلیمان)
 ہوتے ہیں، کیونکہ وہی مفسر کے لقب سے مشہور ہیں، اور انہی کی روایات اور اقوال
 کتب تفسیر میں زیادہ ہیں، لہذا یہاں ان کا حال قدرے تفصیل کے ساتھ پیش خدمت ہے؛
 مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۷ھ) نے ایک تفسیر لکھی تھی، جس کے حوالے کتب
 تفسیر میں بکثرت آتے ہیں، چند علماء نے ان کی تعریف کی ہے، لیکن اکثر محدثین نے
 انھیں مجروح اور ناقابل اعتبار بتایا ہے، تعریف کرنے والوں میں امام شافعی^۷ ہیں جو

۱۔ میزان الاعتدال ص ۲۳۳ ج ۱۔ ذیل ترجمہ اسماعیل بن عبد الرحمن السدسی البکری
 ۲۔ کتاب الضعفاء والمتروکین للنسائی ریح التایخ الصغیر للبخاری ص ۳۰۳ مطبوعہ شیخ پورہ،

۳۔ تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۹۲ ج ۳ طبع بیروت،

۴۔ الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲،

فرماتے ہیں، "الناس عيال علی مقاتل فی التفسیر" (لوگ تفسیر کے معاملہ میں مقاتل کے محتاج ہیں) نیز حضرت بقیۃ رکتے ہیں کہ "حضرت شعبہ سے مقاتل کے بارے میں کج نعت سوال کیا جاتا تھا، میں نے ہمیشہ ان کو مقاتل کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہی پایا" اور حضرت مقاتل بن حیان ان کو علم کا سمندر کہا کرتے تھے،

لیکن ان چند تعریفی کلمات کو چھوڑ کر بیشتر ائمہ حدیث نے ان پر شدید جرح اور تنقید کی ہے، ان پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ وہ بے اصل روایات نقل کرتے ہیں حضرت دیکھ فرماتے ہیں: "ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم سفر کر کے مقاتل کے پاس جائیں، لیکن وہ خود ہی ہمارے شہر میں آگئے، ہم ان کے پاس پہنچے، مگر ہم نے انھیں کذاب پایا، اس لئے ان سے کچھ نہیں لکھا، امام جوزجانی ان کے بارے میں کہتے ہیں "کان کذاباً جسوراً (بڑا ڈھیٹ کذاب ہے) امام ابن معین فرماتے ہیں "لیس بشقۃ" (وہ ثقہ نہیں ہے) اور ایک اور موقع پر انھوں نے کہا "لیس بشیء" (وہ کچھ بھی نہیں) عمرو بن عسلی (فلاس) فرماتے ہیں "متروک الحدیث کذاب"۔ امام ابن سعد کہتے ہیں: "اصحاب الحدیث یبقون حدیثہ وینکرونہ" (علماء حدیث اس کی حدیث سے بچتے اور اسے منکر سمجھتے ہیں)، عبد الرحمن بن حکم کہتے ہیں: "وہ قصہ گو تھا، لوگوں نے اس کی حدیثیں ترک کر دی ہیں" ابو حاتم اور امام عجل فرماتے ہیں: "متروک الحدیث" امام نسائی نے انھیں کذاب قرار دیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثیں گھڑ کر منسوب کرنے والے چار آدمی بہت مشہور ہیں، ان میں سے ایک مقاتل بھی ہیں" امام دارقطنی لکھتے ہیں "یکذب" (وہ جھوٹ بولتے ہیں، امام حاکم لکھتے ہیں: "لیس بالحقوی عندہم" (وہ علماء کے نزدیک قوی نہیں ہیں)، عبد الصمد بن عبد الوارث فرماتے ہیں کہ: "مقاتل ہمارے پاس آئے اور ہمیں عطا کے واسطے سے کچھ حدیثیں سنانے لگے، پھر وہی حدیثیں صحاح کے واسطے سنائیں، پھر وہی احادیث عمرو بن شیبہ کے واسطے سے سنائیں، ہم نے ان سے کہا کہ یہ روایات آپ نے کس سے سنی ہیں؟ تو پہلے تو انھوں نے

ہم کہ ان سب سے سنی ہیں، مگر پھر کہنے لگے، نہیں خدا کی قسم مجھے یاد نہیں کس سنی ہیں..... اور امام بخاری فرماتے ہیں: "لا شئ البتة" (وہ ہرگز کوئی شے نہیں)۔
عبداللہ بن مبارک اُن کی عبادت گزاری کی تعریف کرتے تھے، لیکن اُن کی روایات قبول نہیں کرتے تھے۔

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ عقائد کے اعتبار سے فرقہ مجسمہ میں سے تھے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء وغیرہ کے قائل تھے) عباس بن مصعب مروزی کہتے ہیں کہ: "مقاتل بن سلیمان اصلاً بلخ کے باشندے تھے، پھر مرویں آگئے، یہاں انھوں نے جامع مسجد میں قصر گوئی شروع کر دی، یہیں پر اُن کے اور جہم بن صفوان (بانی فرقہ جہمیہ) کے درمیان مباحثے شروع ہو گئے، چنانچہ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھیں، اور امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: "ہمارے یہاں مشرق کی جانب سے دو بڑے خمیشت نظریات گھس آئے ہیں، ایک جہم (کا نظریہ) جو معتقلہ میں سے تھا، اور ایک مقاتل (کا نظریہ) جو مشبہ میں سے تھا، نیز امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: "جہم نے نفی (صفات) میں غلو سے کام لیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کالعدم بنا دیا، اور مقاتل نے اثبات (صفات) میں غلو کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات کے مشابہ قرار دیدیا، چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبی نے اُن کو ضعفاء میں شمار کر کے لکھا ہے: "مقاتل بن سلیمان البلخی المفسر ہالک، کذب وکیح والذہبی نے اُنھیں کذاب کہا ہے۔"

۱۔ یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ ج ۱۰ سے ماخوذ ہیں،

۲۔ التاریخ الکبیر، ص ۱۳۲ قسم ۲ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۹۷،

۳۔ مفتاح السعادة، طاش کبریٰ زاوہ (ص ۴۰۴ ج ۱ مطبوعہ دکن،

۴۔ تہذیب التہذیب حوالہ بالا،

۵۔ المغنی فی الضعفاء، للذہبی ص ۶۷، ج ۲،

اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کے احوال کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ ”کنز بوعہ و دھجروہ و درما
 بالتجسیم“ علماء نے ان کی تکذیب کی ہے اور ان کی روایات کو چھوڑ دیا ہے، اور
 ان پر فرقہ مجسمہ میں سے ہونے کا الزام بھی ہے)۔
 اتنی شدید جرح و تنقید کے باوجود تفسیر کی کتابوں میں ان کے اقوال بڑی کثرت
 سے ذکر کئے جاتے ہیں، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اگرچہ روایت حدیث میں ان پر
 بھروسہ نہیں ہو لیکن وہ وسیع المعلومات آدمی تھے، اور چونکہ انھوں نے اپنی زندگی
 کا بڑا مشغلہ تفسیر ہی کو بنایا تھا، اور اس بارے میں مختلف طریقوں سے معلومات جمع
 کی تھیں، اس لئے ان کی تفسیر میں بعض کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں، اس لئے ان کی
 معلومات بھی مفسرین نے ذکر کر دی ہیں، تاکہ محقق علماء ان میں سے کوئی بات مفید اور
 صحیح پائیں تو قبول کر لیں ورنہ رد کر دیں، اس سلسلے میں بعض علماء کے اقوال یہ ہیں:-
 امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ: ”ان کے پاس کچھ کتابیں تھیں جنہیں دیکھتے رہتے
 تھے، مگر میرا خیال ہے کہ قرآن کا کچھ علم ان کے پاس تھا، حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے
 ہیں کہ: انما جمع مقاتل تفسیر الناس و خسر علیہ، من غیر سماع و مقاتل
 نے مختلف لوگوں کی تفسیریں جمع کر کے ان کے مطابق تفسیر کی ہے، مگر کسی سے ان تفسیروں
 کو براہ راست نہیں سنا، عباس بن مصعب مروزیؒ فرماتے ہیں: ”کان حافظاً
 للتفسیر لا یضبط الاسناد“ (انھیں تفسیر تو یاد تھیں مگر سند یاد نہ تھی)۔

۱۵ تقریب النہذیب، ص ۲۷۲، ۲۷۳ ترجمہ نمبر ۱۳۴،
 ۱۵ تاریخ بغداد للخطیب، ص ۱۶۱، ۱۱۳، خطیب بغدادیؒ نے یہ فقہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دن
 خلیفہ منصور بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی بار بار آ کر اس کے چہرے پر بیٹھ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ پریشان
 ہو گیا، اتنے میں مقاتل بن سلیمان آگئے، منصور نے ان سے پوچھا: ”تہیں پتہ ہے کہ اسٹہ نے مکھی کو
 کیوں پیدا کیا ہے؟ مقاتل نے کہا: ہاں! اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس کے ذریعہ جابر قسم کے لوگوں
 کو ذلیل کرے“ منصور خاموش ہو گیا، (ص ۱۶۶ ج ۱۳)۔

نعیم بن حماد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان بن عیینہؒ کے پاس مقاتل کی ایک کتاب دیکھی تو ان سے پوچھا کہ کیا آپ تفسیر میں مقاتل کی روایات نقل کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا: ”نہیں، لیکن میں اس سے مدد لیتا ہوں“ حضرت عبداللہ بن المبارکؒ نے اُن کی تفسیر دیکھی تو کہا ”اس میں علم تو بڑا عجیب ہے، کاش! کہ اس کی اسناد بھی (صحیح) ہوتی“ حضرت حماد بن عمروؒ نے فرمایا ”جو باتیں یہ بیان کرتے ہیں اگر انھیں علم کہنا صحیح ہو تو یہ کتنے بڑے عالم ہیں“ امام ابن جانؒ فرماتے ہیں کہ: ”وہ یہود و نصاریٰ سے قرآن کا علم حاصل کرتے تھے جو اُن کی کتابوں کے موافق ہے، اور خلیلیؒ کہتے ہیں: ”اہل تفسیر کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے، اور وہ وسیع العلم تھے، لیکن حفاظ حدیث نے روایت میں اُن کو ضعیف قرار دیا ہے“

لہذا مقاتل کی تفسیروں پر روایتی نقطہ نظر سے تو ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے البتہ لغت و ادب، تاریخ و قصص، کتب سابقہ کے حوالوں اور عام معلومات کے لحاظ سے اُن کی تفسیر میں کام کی باتیں بھی ملجاتی ہیں، جن سے محقق اہل علم کچھ نہ کچھ فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے ان کو نقل کرنے میں قباحت نہیں سمجھی،

ربیع بن انسؒ | ان کا نام ربیع بن انس لیسکری الحنفی ہے، یہ اصلاً بصرہ کے باشندے ہیں، پھر خراسان چلے گئے تھے، اس لئے ان کو بصری

بھی کہا جاتا ہے اور خراسانی بھی، انھوں نے حضرت انسؓ، حضرت ابو العالیہؒ اور حضرت حسن بصریؒ وغیرہ سے روایات لی ہیں، امام عجلؒ، ابو حاتمؒ اور امام نسائیؒ نے ان کے لئے ”صدوق“ یا ”لیس بہ بأس“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جو ادنیٰ درجہ کی توثیق پر

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۲۸۰ تا ۲۸۴، ج ۱۰ و میزان الاعتدال ص ۴۲۳ ج ۴، طبع مصر
مقاتل بن سلیمان کے بارے میں جتنے اقوال ہم نے تہذیب التہذیب سے بلا سند نقل کئے ہیں ان کی سند کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد للخطیبؒ ص ۱۶۰ تا ۱۶۹،

۲۔ تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۳ و المجرح والتحریر لابن ابی حاتمؒ ص ۲۵۴ ج ۲، قسم ۲
ترجمہ نمبر ۲۰۵ طبع دکن،

ابنہ حضرت یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں: ”کان یتشیع فیضط“ (وہ شیعہ تھے اور ریشیہ میں، افراط سے کام لیتے تھے) اور امام ابن حبانؒ نے انھیں ”ثقات“ میں شمار کیا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ ”ابو جعفر رازیؒ نے ان کی جو روایات ذکر کی ہیں لوگ اُن سے احتراز کرتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی روایات میں اضطراب بہت ہے“ اور حافظ ابن حجرؒ نے اُن کے بارے میں خلاصہ یہ ذکر کیا ہے کہ: ”صدوق لہ اوہام رعی بالتشیع“ (وہ سچ بولتے ہیں، مگر ایک تو ان کو روایات میں وہم بھی ہو جاتا ہے دوسرے اُن پر تشیع کا الزام ہے)

عَلِيَّةُ الْعَوْنِي | ان کا پورا نام ابو الحسن عطیہ بن سعد بن جنادۃ العونی الجبلی (متوفی ۱۸۷ھ) ہے، یہ کوفہ کے باشندے تھے، تابعین میں سے ہیں اور حضرت ابو سعید خدریؒ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ وغیرہ سے روایات نقل کرتے ہیں، ان کو امام نسائیؒ نے ”ضعیف“ کہا ہے، نیز امام احمدؒ یحییٰ بن سعید القطا، بشیم، ابو حاتم، ابن عدیؒ، جوزجانیؒ، ابن حبانؒ، امام ابو داؤد اور ساجیؒ وغیرہ نے بھی اُن کی تضعیف کی ہے، ابن سعدؒ نے اتنا لکھا ہے کہ: ”لہ احادیث صالحۃ و من الناس من لا یحجج بہ“ (وہ ٹھیک حدیثیں روایت کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے) اور امام ابو زرعةؒ نے انھیں ”لیثین“ کہا ہے جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے، اور یحییٰ بن معینؒ ان کو ”صالح“ کہتے ہیں، یہ بھی بلکہ قسم کی توثیق ہے، دراصل ان پر چار قسم کے اعتراض ہیں، پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انھوں نے روایات کی سند میں مخالطہ انگریزی کا ارتکاب کیا ہے، امام احمدؒ اور امام ابن حبانؒ نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ یہ کلبی کے

۱۵ تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۳

۱۶ تقریب التہذیب ص ۲۳۳ ج ۱

۱۷ کتاب الضعفاء والمتروکین، للنسائیؒ، مع تاریخ الصغیر للبخاریؒ، ص (۲۰)

پاس جا کر ان سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور ان سے روایات لیتے تھے لیکن چونکہ کلبی ضعیف اور بدنام ہیں (جیسا کہ آگے آ رہا ہے) اس لئے انہوں نے انکی کنیت اپنی طرف سے ابوسعید رکھ لی تھی، اور جو روایات یہ کلبی سے سنتے ان کو کلبی کا نام لینے کے بجائے ابوسعید کی کنیت سے روایت کر دیتے، اور چونکہ عطیہ العوفی مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے بعض احادیث سنی تھیں، اس لئے نادان لوگ یہ سمجھتے... کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہوگی، حالانکہ درحقیقت وہ کلبی کی روایت ہوتی تھی! ^۱

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے، اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ روایات نقل کرنے میں غلطیاں کرتے تھے، اور چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مدلس تھے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "صدورن یخطئ کثیرا، کان شیعیا مدلسا" (سچ بولنے والے ہیں مگر غلطیاں بہت کرتے ہیں، شیعہ تھے اور مدلس تھے) اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ ضعفاء میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تابعی مشہور مجمع علی ضعفہ" (مشہور تابعی ہیں، اُن کے ضعف پر اجماع ہے) البتہ امام ترمذیؒ نے اُن کی بعض روایات کو حسن قرار دیا ہے، لیکن امام ترمذیؒ کی اصطلاح میں حسن سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی راوی مہتمم بالکذب (جھوٹ کا ملزم) نہ ہو، اور وہ ایک سے زائد طریقوں سے مروی ہو، اس لئے ان کی تحسین سے اُن اعتراضات کا دفعیہ نہیں ہوتا جو عطیہ العوفی پر وارد کئے گئے ہیں،

۱۰ تہذیب التہذیب ص ۲۲۵ و ۲۲۶ ج ۴

۱۱ تقریب التہذیب ص ۲۲۴ ج ۲

۱۲ المعنی فی الضعفاء ص ۲۳۶ ج ۲ ترجمہ نمبر ۴۱۳۹

۱۳ الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲ نوع ۱۵۵

۱۴ دیکھئے کتاب الحلل للترمذیؒ

عبدالرحمن بن زید بن مسلم | ان کا پورا نام عبدالرحمن بن زید بن اسلم العدوی المدنی
 (متوفی ۱۷۵ھ) ہے، یہ حضرت زید بن اسلم کے
 صاحبزادے ہیں جن کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے، ان کو بیشتر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے،
 صرف امام بن عدی کا قول ہے کہ "لہ احادیث حسان، وھو ممن احتمل الناس
 وصدقہ بعضهم وھو ممن یکتب حدیثہ"۔ ان سے حسن احادیث مروی ہیں
 وہ ان راویوں میں سے ہیں جنھیں لوگوں نے گوارا کیلئے، اور بعض حضرات نے ان کی
 تصدیق کی ہے، ان کی حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں، باقی تمام علماء جرح نے ان کی تضعیف
 کی ہے، امام بخاریؒ لکھتے ہیں: "ضعفہ علی جدّ اعلیٰ ابن المدینیؒ نے ان کو بہت
 ضعیف کہا ہے، امام نسائیؒ لکھتے ہیں: "ضعیف"۔ امام احمدؒ اور امام ابو زرعہؒ نے بھی
 ان کی تضعیف کی ہے، امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ "زید بن اسلم کے تمام بیٹے ضعیف
 ہیں"۔ امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ "اپنی ذات میں صالح آدمی تھے، مگر حدیث میں بہت
 کمزور"۔ امام ابن خزیمہؒ کہتے ہیں: "لیس ھو ھمن یحتج ھل العلم بحديثہ
 لسوء حفظہ"۔ وھو رجل صناعتہ العبادۃ والنقشہ"۔ (وہ ان لوگوں میں سے
 نہیں جن کی حدیث سے اہل علم استدلال کر سکیں، کیونکہ ان کا حافظہ کمزور تھا، ان کا
 اصل کام عبادت وزہد ہے)۔ امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں: "کان یقبل الاخبار
 وھو لا یعلم حتی کثر ذلک فی روایتہ من رفع المراسیل وباسناد
 الموقوف، فاستحق التروک"۔ (وہ روایات کو غیر شعوری طور پر پلٹ دیتے ہیں،
 یہاں تک کہ ان کی روایت میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ مرسل کو مرفوع بنایا
 اور موقوف کو مسند کر دیا، اس لئے وہ مستحج ترک ہیں)، امام طحاویؒ فرماتے ہیں:
 "حدیثہ عند اهل العلم بالحدیث فی النہایۃ من الضعف"۔ (علمائے

۱۵ التایخ البکیر للبخاری، ص ۲۸۴ ج ۳ قسم ۱ ترجمہ نمبر ۹۲۲،

۱۶ کتاب الضعفاء والمتروکین، مع التایخ الصغیر ص ۲۹۶،

حدیث کی نظر میں ان کی احادیث انتہائی ضعیف ہیں) اس کے علاوہ امام مالکؒ، امام ابن ماجہؒ، در اور مرویؒ، معنؒ، امام ابن سعدؒ، ساجیؒ، حاکمؒ، ابونعیمؒ اور جوزجانیؒ سے بھی ان پر سخت جرح منقول ہو، اور علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے: "اجمعوا علی ضعفہ" (ان کے ضعف پر اجماع ہے) چنانچہ ابن حجرؒ نے ان کے بارے میں فیصلہ یہی کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔

کلبی | ان کا پورا نام ابوالنضر محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن عبدالحارث بن عبد العزیز الکلبی (متوفی ۱۳۷ھ) ہے، یہ قبیلہ بنو کلب کی طرف منسوب ہیں، کوفہ کے باشندے تھے، اور تاریخ و انساب اور تفسیر میں مشہور ہیں، علماء ان کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں، صرف امام ابن عدیؒ نے اتنا لکھا ہے کہ "لہ غیر ما ذکرنا احادیث صالحہ، وخاصة عن ابی صالح، وهو معروف بالتفسیر وليس لاحد اطول من تفسیرہ، وحدث عنه ثقات من الناس ورضوه فی التفسیر واما فی الحدیث فله مناکیر" (ان کی جو حدیثیں میں نے ذکر کی ہیں ان کے سوا ان کی حدیثیں ٹھیک ہیں، خاص طور سے وہ احادیث جو ابوصالح سے مروی ہیں، وہ تفسیر میں مشہور ہیں، اور کسی کی تفسیر ان کی تفسیر سے زیادہ طویل نہیں ہے، اور ان سے بعض ثقہ لوگوں نے بھی حدیثیں لی ہیں اور تفسیر میں انھیں گوارا کیا ہے، البتہ حدیث میں ان کی روایات منکر ہیں)، لیکن باقی تمام اہل علم نے ان پر شدید جرح کی ہے،

ان پر سب سے سنگین الزام بھونی روایتیں بیان کرنے کا ہے، معمر بن سلیمان اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ "کوفہ میں دو کذاب تھے، ان میں سے ایک کلبی ہیں، تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابوصالح سے مروی ہیں، لیکن ابوجناب کلبیؒ بیان کرتے ہیں

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۷۷، ۷۸ تا ۷۹ ج ۱، ۲، مزید ملاحظہ ہو میزان الاعتدال ص ۵۶۳ ج ۲،

۲۔ تقریب التہذیب ص ۲۸۰ ج ۱ ترجمہ نمبر ۱۹۴۱

کہ ابوصالح نے قسم کھا کر کہا ہے کہ میں نے کبھی کو کوئی بات تفسیر کی نہیں سنانی، اور سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کبھی نے ایک مرتبہ خود اعتراض کیا کہ ”میں نے ابوصالح سے ابن عباسؓ کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں ہم انھیں روایت نہ کرو“ حضرت سفیان ثوریؒ سے بعض احادیث کبھی کی سند سے مروی ہیں، اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب سفیان ثوریؒ جیسا محدث کبھی سے روایت کرتا ہے تو وہ ثقہ ہی ہوں گے، لیکن اسکی حقیقت حضرت ابوحاتم نے بیان فرمائی ہے، کہ حضرت سفیان ثوریؒ کا مقصد ان سے روایت لینا نہیں تھا، بلکہ انھوں نے بعض اوقات اظہارِ تعجب کے لئے کبھی کی روایات مجلس میں سُنائیں، اس پر بعض حاضرین نے ان روایات کو سفیان ثوریؒ سے نقل کر دیا اور حضرت قرۃ بن خالدؒ کہتے ہیں کہ ”لوگوں کا خیال عام طور سے یہ تھا کہ کبھی جھوٹ بولتے ہیں“

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ اتہامی غالی مشیدہ تھے، حضرت ابو جہر کہتے ہیں کہ ”میں نے اُس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے، حضرت علیؓ وہاں بیٹھے تھے تو جبرئیل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علیؓ پر نازل کر دی“ ابو حنیفہؒ کا یہ قول مشہور محدث بزرگ زریح کے سامنے نقل کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ: ”میں نے کبھی سے یہ بات تو نہیں سنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہے تھے کہ میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں“ یہی قول حافظ ذہبیؒ نے تمام سے بھی نقل کیا ہے کہ میں نے اسے کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں سبائی ہوں“ اور امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں: ”کبھی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا

۱۵ یہ تمام اقوال تہذیب الہندیہ کے نقل کئے جا رہی ہیں، البتہ حافظ ذہبیؒ نے خود سفیان ثوریؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا ”کبھی سے بچو“ ان کے بوجھا گیا کہ ”آپ تو اس روایت کرتے ہیں؟ اس پر انھوں نے فرمایا: میں اس کے جھوٹ پر بوجھتا ہوں“ (میزان الاعتدال ص ۵۸۵)

جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی وفات نہیں ہوئی، وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس کو ایسے وقت میں عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی یہ لوگ جب کوئی بادل دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں: "امیر المؤمنین اس میں ہیں"۔

خلاصہ یہ کہ کلبی قرآنِ اولیٰ کے مفسرین میں ضعیف ترین مفسرین، امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ: کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: "نہیں"۔ حافظ ذہبیؒ نے ان کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "لا یحل ذکرہ فی الکتاب فکیف الاحتجاج بہ؟" (کتابوں میں ان کا ذکر ہی درست نہیں، تو ان سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے)۔

آخر میں تفتنِ طبع کے لئے ان کا ایک لطیفہ پیش خدمت ہوا، وہ خود کہتے کہ میں نے یادداشت کا مظاہرہ بھی ایسا کیا ہے کہ کسی نے نہ کیا ہوگا، اور بھول کا مظاہرہ بھی ایسا کیا کہ کسی نے نہ کیا ہوگا، یادداشت کا واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے پورا قرآن چھ پانچ سات دن میں یاد کر لیا تھا، اور بھول کا عالم یہ ہے کہ ایک روز میں نے اپنا خط بنانے کے لئے ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑا، چاہتا یہ تھا کہ مٹھی سے نیچے کے بالوں کو کاٹ دوں، لیکن بھول کر مٹھی کے اوپر سے پوری ڈاڑھی کاٹ ڈالی تھی۔

یوں تو تفسیر کی کتابوں میں اور بھی بہت سے لوگوں کے نام آتے ہیں، لیکن جن

۱۵ میزان الاعتدال ص ۵۵۸ ج ۳، ۱۵ ایضاً صفحہ ۵۵۹ ج ۳،

۱۵ اوانی بالوفیات للصفدی ص ۸۳ ج ۳ مطبعہ ہاشمیہ دمشق ۱۹۵۲ء و میزان الاعتدال ص ۵۵۶ ج ۳، لیکن خطیب بغدادیؒ نے یہ قصہ ان کے بجائے ان کے بیٹے ہشام ابن الکلبی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے،

(تاریخ بغداد ص ۲۶ ج ۱۲ ترجمہ ہشام ابن الکلبی)

حضرات کا تذکرہ اس باب میں آ گیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کے حوالے تفسیر میں آتا ہے کثرت سے آئے ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ بعد کی تمام تفاسیر کا بنیاد کا ماخذ یہی حضرات ہیں، اور بیشتر تفاسیر انہی کی روایات اور اقوال کے گرد گھومتی ہیں اس لئے ان حضرات کے احوال معلوم ہونے سے انشاء اللہ ان تمام تفاسیر کے مطالعے میں بصیرت پیدا ہوگی جنہوں نے تفسیر بالروایت کا طریقہ اختیار کیا ہے، مثلاً:-

تفسیر ابن جریر، تفسیر الدر المنثور اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ، یا جن میں سند کے بغیر قدیم ائمہ تفسیر کے اقوال بیان ہوتے ہیں، جیسے روح المعانی، تفسیر طبری اور متاخرین کی دوسری تفاسیر

متاخرین کی چند تفسیریں

جیسا کہ اس باب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، ہم نے اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل تاریخ بیان کرنے کے بجائے صرف قرونِ اولیٰ کے بعض ائمہ مفسرین کے تعارف پر اکتفا کیا ہے جن کی روایات اور اقوال پر پورے علم تفسیر کی بنیاد ہے، بعد میں ستران کریم کی جو تفسیریں لکھی گئیں، اور علماء امت نے جن جن پہلو سے قرآن کریم کی خدمت کی وہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، جو مستقل تصنیف چاہتا ہے، یہ دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ تفسیر ستران کا حق ادا ہو چکا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شرح رسالت کے پروانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کی خدمت میں صرف محنت و عرق ریزی ہی سے نہیں، جنون عشق سے کام لیا ہے، چنانچہ یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جاسکتا ہے، کہ دنیا میں نہ کسی کتاب کی اتنی شرحیں لکھی گئی ہیں نہ اُس کے اتنے ترجمے ہوئے ہیں، اور نہ اس کی مختلف پہلوؤں سے اس قدر خدمت کی گئی ہے، حالانکہ اس مقصد کے لئے کسی بھی دور میں کوئی عالمی تنظیم قائم نہیں رہی،

بہر کیف، آج ان تمام خدمات کی روشنی میں ستران کریم سے استفادہ بہت

بہت آسان ہے، اور جو شخص کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے اس کے لئے پورے کتب خانے موجود ہیں، اگر صرف اُن تفسیروں کا تعارف کرایا جائے جو آجکل دستیاب ہیں تب بھی اس کے لئے ایک مستقل تالیف چاہئے، لیکن یہاں میں صرف اُن چند تفاسیر کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کا احقر پر ذاتی طور سے بڑا ناقابل فراموش احسان ہے، اور جو احقر کو سلف کے تفسیری علوم کا خلاصہ محسوس ہوتی ہیں، اور جب کبھی کسی آیت کی تفسیر میں کوئی الجھن پیش آتی ہے احقر نے سب سے پہلے اپنی کی طرف رجوع کیا ہے، اور جن کے بارے میں میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لئے جو ضخیم تفاسیر کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کر پاتے یہ کتابیں بڑی حد تک دوسری کتب کی کمی پوری کر دیتی ہیں،

(۱) تفسیر ابن کثیر | ان میں سرفہرست تفسیر ابن کثیر ہے، یہ حافظ عماد الدین ابوالفداء اسمعیل بن الخطیب ابی حفص عمر بن کثیر الشافعی (متوفی ۷۴۸ھ) کی تصنیف ہے، اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کو تفسیر ابن کثیر کا خلاصہ کہنا چاہئے، حافظ ابن کثیر نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ تفسیر بالروایۃ کا طریقہ ہے، یعنی ہر آیت کے تحت وہ پہلے اس کی تفسیر کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں، پھر اس کے مختلف کلمات یا جملوں کی تفسیر میں انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعینؓ کی جتنی روایات ملتی ہیں وہ ذکر فرماتے ہیں، لیکن ان سے پہلے کے جن مفسرین نے تفسیر بالروایۃ کا طریقہ اختیار فرمایا ہے، مثلاً حافظ ابن جریرؒ ابن مردودیہؒ، اور ابن ماجہؒ وغیرہ، انھوں نے تفسیری روایات کو صرف جمع کرنے کا کام کیا ہے، اُن کی چھان بھٹک نہیں کی، لیکن حافظ ابن کثیرؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل القدر محدث بھی ہیں، اور روایات پر جرح و تعقیق کے فن سے واقف ہیں، چنانچہ انھوں نے اول تو اُن ضعیف اور موضوع روایات کو بکثرت چھانٹ دیا ہے جو متقدمین کی کتابوں میں لکھی جلی آرہی تھیں، دوسرے جو کمزور روایات وہ لائے ہیں عموماً اُن کی علل اسناد پر بھی تشبیہ فرمادی ہے، (مثلاً ملاحظہ ہو

ص ۷۷، ص ۲۱۳ ج ۱، ص ۲۱۱، ص ۲۲۳ ج ۲، ص ۳۸۹ و ۵۱۹، ص ۵۰۸ و ۵۲۰ ج ۳، ص ۲۴۱ ج ۴
تفسیر بار و روایت کی کتابیں اکثر و بیشتر اسرائیلیات سے لبریز ہیں، لیکن ایسی روایات کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کا طرز عمل انتہائی محتاط، صاف ستھرا اور خالص قرآن و سنت پر مبنی ہے، جس کی تفصیل خود انہی کے الفاظ میں ”اسرائیلیات“ کے عنوان کے تحت آچکی ہے، چنانچہ انھوں نے اول تو اپنی کتاب میں اسرائیلی روایات زیادہ نقل نہیں کیں، اور جہاں نقل کی ہیں وہاں عموماً یہ بتا دیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں، مثلاً سورۃ صافات میں انھوں نے بعض ایسے آثار نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسحق علیہ السلام تھے، اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے“ لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبار سے ماخوذ ہیں..... ان روایات میں ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے“ (ص ۷۷، ج ۳)

بہر کیف، روایتی لحاظ سے تفسیر ابن کثیرؒ سب سے محتاط اور مستند تفسیر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس تفسیر میں درج ہر روایت درست ہے، بلکہ بعض مقامات پر حافظ ابن کثیرؒ بھی ضعیف روایات کو کسی تنبیہ کے بغیر نقل کر گئے ہیں، مثلاً سورۃ توبہ کی آیت **وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ اَلْحٰمِیٰۃَ کِی تَفْسِرُکَ تَعٰی** حضرت ثعلبہؓ کی جو روایت انھوں نے نقل کی ہے (ص ۳۷، ج ۲) وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے،

اس کے علاوہ جن مفسرین کے بارے میں ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ وہ ضعیف تھے، مثلاً مقاتل، کلبی اور عطیۃ العوفی وغیرہ، ان کے اقوال بھی انھوں نے بکثرت ذکر کئے ہیں، لیکن عموماً ان کے وہی اقوال بغیر تنقید کے لئے ہیں جو کسی دلیل شرعی کے خلاف نہیں ہیں، لہذا ان کی حیثیت مستند روایت کی نہیں بلکہ مفسرین کے اپنی اقوال کی ہوتی ہے۔ دوسری کتاب امام رازیؒ کی تفسیر کبیر ہے، اس کا اصل نام **تفسیر کبیر** ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

یہ امام فخر الدین محمد ابن ضیاء الدین عمر الرازی (متوفی ۷۲۸ھ) کی تصنیف ہے، جس طرح روایت کے اعتبار سے تفسیر ابن کثیر نہایت جامع اور بے نظیر تفسیر ہے، اسی طرح علوم و روایت کے لحاظ سے تفسیر کبیر کا کوئی جواب نہیں، بعض لوگوں نے اس کتاب پر یہ فقرہ چسٹ کیا ہے کہ: "ذیہ کل شیء الا النفس" اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ بڑے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ اس کتاب پر بڑا زبردست ظلم ہے، اس لئے کہ حلّ قرآن کے لئے اس تفسیر کا کوئی جواب نہیں ہے، اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:-

(۱) ہر آیت کی تفسیر، ترکیبِ نحوی اور شانِ نزول سے متعلق سلف کے جتنے اقوال ہوتے ہیں، امام رازی ان کو نہایت مرتب اور منضبط انداز میں پوری شرح و وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جس سے آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کتنے اقوال ہیں، اور کیا کیا؟ دوسری تفسیروں میں یہ مباحث عموماً منتشر اور بکھر کر ہوئے ہوتے ہیں، جن سے خلاصہ نکالنے میں دقت لگتا ہے، لیکن تفسیر کبیر میں یہ سب باتیں مک جا اور منضبط طریقے سے مل جاتی ہیں،

(۲) قرآن کریم کے اندازِ بیان کی شوکت و عظمت کو پوری تفصیل سے بیان فرماتے ہیں،

(۳) آیت سے متعلق جو فقہی احکام ہوتے ہیں انھیں تفصیلی دلائل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں،

(۴) آیت میں جن باطل فرقوں اور عقل پرستوں نے کوئی تحریف کی ہوتی ہے اسے بتام و کمال ذکر کر کے اس کی مدلل اور مفصل تردید کرتے ہیں، اس طرح اس میں جہمیہ، معتزلہ، مجتہد، اباحیہ اور ان کے زمانہ کے تمام باطل فرقوں کی تردید موجود ہے،

۱۵ الاتقان ص ۲ ج ۲ تحجیب المسلمین بکلام رب العالمین،

لیکن ہماری ناچیز رائے میں اگر یہ فقرہ کسی کتاب پر راست آسکتا ہے تو وہ ہمارے دور کی تفسیر الجواہر للطنطاویؒ ہے،

(۵) تفسیر کبیر کی ایک خصوصیت، جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہو اس کا بیان کیا ہوا ربط آیات ہے، واقعہ یہ ہے کہ آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت کی جو وجہ وہ بیان فرماتے ہیں وہ عموماً اتنی بے تکلف، دلنشین اور معقول ہوتی ہے، کہ اس پر دل نہ صرف مطمئن ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے قرآن کریم کی عظمت کا غیر معمولی تاثر پیدا ہوتا ہے،

(۶) قرآنی آیات اور اسلامی احکام کے اسرار و حکیم پر بھی اُن کا کلام خوب ہوتا ہے،

خلاصہ یہ کہ تفسیر کبیر انتہائی جامع تفسیر ہے، اور احقر کا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ محل قرآن کے سلسلہ میں جب بھی کوئی دشواری پیش آئی ہے، تفسیر کبیر نے اس معاملے میں غیر معمولی رہنمائی کی ہے، عموماً لوگ اس کا طول بیان دیکھ کر گھبر جاتے ہیں، (حدیث یہ کہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر اس کے ۵۰ صفحات میں آئی ہے) لیکن یہ تطویل شروع میں زیادہ ہے، بعد میں اتنی نہیں رہی، اور اس سے استفادہ کیا جائے تو علم و معرفت کے گوہر نایاب ہاتھ آتے ہیں، البتہ اس تفسیر کے بارے میں چند باتیں ذہن نشین رہنی چاہئیں:-

(۱) امام رازیؒ نے یہ تفسیر سورۃ فتح تک لکھی تھی، کہ وفات ہو گئی، چنانچہ سورۃ فتح کے بعد ایک دوسرے عالم قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقی (متوفی ۷۳۸ھ) یا شیخ نجم الدین حسد بن محمد القبولی (متوفی ۷۷۸ھ) نے مکمل فرمایا، لیکن کمال یہ ہے کہ امام رازیؒ کے انداز نگارش کو اس طرح برقرار رکھ لے کہ اگر کسی کو یہ حقیقت معلوم نہ ہو تو وہ کبھی شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ امام رازیؒ کے سوا کسی اور کی تحریر ہے،

(۲) تفسیر کبیر کی روایات دوسری تفاسیر کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ ہیں،

(۳) محدودے چند مقامات پر امام رازیؒ نے جمہور مفسرین سے الگ راہ اختیار کی ہے، (مثلاً لکنب ابراہیم الاثلث کنبات کی حدیث صحیح کو رد کر دیا ہے)

ہذا جہاں انھوں نے تفرّد اختیار کیا ہے وہاں عمل جمہور ہی کے مسلک پر ہونا چاہئے،
(۳) تفسیر ابی السعود | اس تفسیر کا پورا نام "ارشاد لعقل سلیم الی مزایا القرآن الکریم"
 ہے، یہ قاضی ابوالسعود محمد بن محمد العنابدی الحنفی (متوفی ۳۹۴ھ)
 کی تصنیف ہے، اور بلاشبہ ان کی علمی گہرائی، دقت نظر اور تدبیر قرآنی کا شاہکار ہے،
 یہ نکل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، اور اس میں اختصار کے ساتھ قرآن کریم کی بڑی دشین
 تفسیر کی گئی ہے، اس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم قرآن، تناسب
 آیات اور بلاغت کے بڑے نفیس نکات ملتے ہیں، جن سے قرآن کریم کی مراد سمجھنے میں
 آسانی بھی ہو جاتی ہے اور قرآن کریم کے معجزانہ انداز بیان کی عظمت بھی سمجھ میں آنے
 لگتی ہے،

(۴) تفسیر لہتر طبری | اس کا پورا نام "الجامع لأحكام التفسیر" ہے، یہ اندلس کے
 مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن
 ابی بکر بن فرح لہتر طبری (متوفی ۳۸۴ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہ میں امام مالک کے
 مسلک کے پیرو تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی
 احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیتوں کی تشریح،
 مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب
 جمع کیا ہے، خاص طور پر روزمرہ کی زندگی کے لئے قرآن کریم سے جو ہدایات ملتی ہیں
 ان کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے، اس کتاب کا مقدمہ بھی نہایت مفصل اور علوم قرآن
 کے اہم مباحث پر مشتمل ہے، یہ تفسیر بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے،
(۵) روح المعانی | اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع
 المثانی" ہے، اور یہ بغداد کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی حنفی
 رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۸۴ھ) کی تصنیف ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ چونکہ
 بالکل آخری دور کی تصنیف ہے، اس لئے انھوں نے کوشش کی ہے کہ سابقہ تفاسیر کے
 اہم مباحث اس میں جمع کر دیں، چنانچہ اس میں لغت، نحو، ادب، بلاغت، فقہ،

عقائد، کلام، فلسفہ، ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ فرمائی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایات حدیث کے معاملہ میں بھی علامہ آلوسیؒ دو سکر مفسرین کے مقابلہ میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کو سابقہ تفاسیر کا خلاصہ کہنا چاہیے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا،

یہ پانچ تفاسیر احقر کے ناچیز ذوق کے مطابق ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی پر اکتفاء کر لے تو انشاء اللہ مجموعی حیثیت سے اُسے دوسری تفاسیر سے بے نیاز کر دینگے، یہ احقر کی ذاتی رائے تھی، بعد میں اپنے مخدوم بزرگ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب مدظلہم العالی کے ایک مقالے سے اس کی تقریباً حرف بہ حرف تائید ہو گئی، واللہ الحمد موصوف اپنے گرانقدر مقالے ”قیمۃ البیان“ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”چونکہ عمر عزم کم ہے، آفاتِ زمانہ زیادہ، اور ہمارے دہریہ ہمتیں پست، اور عوام کمزور ہو گئے ہیں،..... اس لئے میں اپنے طالب علم بھائیوں کو چار ایسی تفاسیر کی نشاں دہی کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان پر قناعت کرنا چاہے تو وہ انشاء اللہ کافی ہوں گی،

ایک تفسیر ابن کثیرؒ..... جس کے بارے میں ہمارے استاذ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے تھے کہ ”اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے بے نیاز کر سکتی ہو تو وہ تفسیر ابن کثیرؒ ہے جو تفسیر ابن جریرؒ سے بے نیاز کر دیتی ہو“ دوسری تفسیر کبرام رازیؒ، جس کے بارے میں ہمارے استاذ فرماتے تھے کہ ”قرآن کیم کے مشکلات میں مجھے کوئی مشکل ایسی نہیں ملی جس سے امام رازیؒ نے تعرض نہ کیا ہو، یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات مشکلات کا حل ایسا پیش نہیں کرے جس پر دل مطمئن ہو جائیں، اور اس کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ فیہ کل شئی الا التفسیر، تو یہ خواہ مخواہ اس کی جلالتِ قدر کو کم کر کے دکھانا ہے، اور شاید کسی ایسے شخص کا قول ہے جس پر روایات کا غلبہ تھا، اور قرآن کریم کے لطائف و علو

کی طرف توجہ نہ تھی، تیسری تفسیر روح المعانی جو برے نزدیک قرآن کریم کی ایسی تفسیر ہے جیسے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری، الایہ کہ فتح الباری ایک کلام مخلوق کی شرح ہے، اس لئے اس نے شرح بخاری کا جو ترجمہ اُمت پر تھا اسے چکا دیا ہے، اور اللہ کا کلام اس سے بلند و برتر ہے، کہ کوئی بشر اس کا حق ادا کر سکے، چوتھی تفسیر فی السعود ہے، جس میں نظم قرآنی کو بہترین عبارت میں بیان کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے، اور وہ بسا اوقات زعمشری کی کشف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔^۱

اس عبارت میں تفسیر فشرطی کو چھوڑ کر انہی چار کتابوں کا تذکرہ اپنی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے، جو ناچیز کی سمجھ میں آئی تھیں، حضرت شاہ صاحب اور ان کے تلمیذ رشید حضرت بتوری مدظلہم کے ساتھ اس توافق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں

یہ بحث تو عربی تفاسیر کے بارے میں تھی، اردو زبان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر بیان القرآن اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر تفسیر ہے، اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان تفسیر کی ضخیم کتابیں کھنگالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرے، البتہ اس کی زبان چونکہ علمی اور اصطلاحی انداز کی ہے، اس لئے عام اردو دان حضرات کو اس کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے ”معارف القرآن“ کے نام سے آٹھ جلدوں میں مفصل تفسیر تحریر فرمائی ہے، جس میں بیان القرآن کی شرح اور تسہیل بھی ہے، اور عصر حاضر کی ضروریات زندگی پر قرآن کریم کی ہدایات کی بہترین وضاحت بھی، اور تہذیب جدید کے مسائل پر قرآنی فکر کے تحت بھرپور تبصرہ بھی، اب تک اردو زبان میں جتنی تفاسیر منظر عام پر آئی ہیں ان میں یہ ایک منفرد تفسیر ہے جس میں سلف صالحین کے مسلک و مشرک پوری حفاظت

کے ساتھ عصرِ حاضر کی ضروریات کو بطریقِ احسن پورا کیا گیا ہے، بجز اللہ یہ تفسیرِ عوام و
خواص میں بیکر مقبول ہو رہی ہے، اور اس سے بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے،
آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنِ کریم کی رفعت و عظمت پہچاننے کی
توفیق عطا فرمائے، اس کی صحیح فہم کی دولت سے نوازے، اور اس کی تلاوت، اس پر
عمل اور اس کی نشر و اشاعت کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے کی
توفیق عطا فرمائے، آمین،

اللَّهُمَّ الْإِنْسَ وَحَشِيَّتِي فِي قَبْرِى، اللَّهُمَّ ارْحَمْنِي بِالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ
وَاجْعَلْ لِي إِمَامًا وَكُورًا وَهُدًى وَرَحْمَةً، اللَّهُمَّ عَلِّمْنِي
مِنْهُ مَا جِهَلْتُ وَذَكِّرْنِي مِنْهُ مَا نَسِيتُ
وَارْزُقْنِي تِلْكَ آتَاءَ النَّبِيِّ وَ
آتَاءَ النَّبَارِ وَاجْعَلْ لِي
حُجَّةً يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ،

وَاللَّهُ الْحَمْدُ أَوْلًا وَآخِرًا، وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا
مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَاصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَاتَّبَاعِهِ أَجْمَعِينَ؛

لاحق

محمد تقی عثمانی

لیلۃ الجمعۃ ۱۵، ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ

دارالعلوم کورنگی

کراچی نمبر ۱۲

صاحبِ تصنیف

- نام : مولانا محمد تقی عثمانی ابن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
(مفتی اعظم پاکستان، بانی دارالعلوم کراچی)
- ولادت : 5 شوال المکرم 1362ھ (اکتوبر 1943ء)
- تعلیم : 1۔ تکمیل درس نظامی دارالعلوم کراچی 1379ھ (1960ء)
2۔ فاضل عربی و پنجاب بورڈ 1958ء۔ امتیازی درجے کے ساتھ
3۔ بی اے کراچی یونیورسٹی 1964ء
4۔ ایل ایل بی کراچی یونیورسٹی 1967ء۔ امتیازی درجے کے ساتھ
5۔ ایم اے عربی و پنجاب یونیورسٹی 1970ء۔ امتیازی درجے کے ساتھ
- تدریس : حدیث و فقہ کے علاوہ مختلف اسلامی علوم کی تدریس، دارالعلوم
کراچی 1960ء سے تاحال۔
- صحافت : ادارت ماہنامہ ”البلاغ“ 1967ء سے تاحال
ادارت ماہنامہ ”البلاغ انٹرنیشنل“ (انگریزی) 1989ء سے تاحال
- مناصب : 1۔ نائب صدر دارالعلوم کراچی 1976ء سے تاحال
2۔ نگران شعبہ تصنیف و تالیف۔ دارالعلوم کراچی
3۔ چیف شریعت لیبلیٹیٹنغ۔ سپریم کورٹ آف پاکستان
4۔ نائب رئیس ”مجمع الفقہ الاسلامی“ جدوہ سعودی عرب
5۔ معاشیات اور بینکنگ پر قائل قدر کام کے باعث اسلامی ممالک کے
مختلف بینکوں میں (Shariah Supervisory Boards)
شریعت نگرانی بورڈز کے ممبر
- تصانیف : تصانیف کی فہرست اسی کتاب کے لپیپ پر ملاحظہ فرمائیں۔